# ادبی اصناف کی آمیزش: اردو کی منظوم آپ بیتیوں کا ہیئتی و اسلوبی تقابلی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

فیصل ریاض

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۲۰۲۲ء

# ادبی اصناف کی آمیزش: اردو کی منظوم آپ بیتیوں کا ہیئتی و اسلوبی تقابلی مطالعہ

مقالہ نگار:

## فیصل ریاض

یہ مقالہ

## ایم۔ فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۲۰۲۲ء

# مقالہ کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ ہم نے مقالہ ہذا پڑھا اور اس کے دفاع کو پوری طرح جانچا ہے۔ ہم مجموعی طور پر ان کی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **اُردو کی منظوم آپ بیتیوں کا ہیئتی و اُسلوبی تقابلی مطالعہ**

پیش کار: فیصل ریاض رجسٹریشن نمبر: 1882/M/U/F19

## ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اُردو زبان و ادب

**ڈاکٹر نازیہ ملک** ______________________

نگران مقالہ

**پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی** ______________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان ______________________

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ: ______________

# اقرار نامہ

میں حلفاً بیان کرتا ہوں کہ مقالہ بعنوان ”اُردو کی منظوم آپ بیتیوں کا ہیتی و اُسلوبی تقابلی مطالعہ“ کے سلسلے میں کی گئی تحقیق میری ذاتی کاوش کا نتیجہ ہے۔ میں نے اسے نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد سے ایم فل (اُردو) کے اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نازیہ ملک کی زیرِ نگرانی مکمل کر لیا ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ کسی دوسرے ادارے یا یونیورسٹی میں ڈگری کو حصول کے لئے پیش نہیں کیا گیا اور نہ ہی آئندہ پیش کیا جائے گا۔

میں اس مقالے کے جملہ نتائج تحقیق کا ذمہ دار ہوں غلط بیانی کی صورت میں یونی ورسٹی کو اختیار حاصل ہے کہ وہ انضباطی کارروائی کر سکتی ہے۔

فیصل ریاض

مقالہ نگار

# تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ مقالہ نگار فیصل ریاض نے ایم فل (اُردو) کا تحقیقی کام بعنوان ''اُردو کی منظوم آپ بیتیوں کا ہیتی و اُسلوبی تقابلی مطالعہ ''میری نگرانی میں مکمل کر لیا ہے۔ میں ذاتی طور پر ان کے کام سے مطمئن ہوں اور انھیں یہ مقالہ شعبہ اُردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد میں جمع کرانے کی اجازت دیتی ہوں اور ان کے زبانی امتحان کی سفارش کرتی ہوں۔

نگران مقالہ: ____________________

**ڈاکٹر نازیہ ملک**
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، نمل
ئ اسلام آباد

# تفصیلی فہرست


مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم ............ ii

اقرار نامہ ............ iii

تصدیق نامہ ............ iv

فہرست ابواب ............ v

Abstract ............ ۱

اظہارِ تشکر ............ ۲

**باب اوّل: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث ............ ۴**

الف۔ تمہید ............ ۴

- موضوع کا تعارف ............ ۴
- بیان مسئلہ ............ ۴
- مقاصدِ تحقیق ............ ۴
- تحقیقی سوالات ............ ۵
- نظری دائرہ کار ............ ۵
- تحقیقی طریقہ کار ............ ۷
- مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق ............ ۷
- تحدید ............ ۸
- پس منظری مطالعہ ............ ۸
- تحقیق کی اہمیت ............ ۹

ب۔ بنیادی مباحث ............ ۹

- ابتدائیہ ............ ۹

- آپ بیتی کی روایت ............ ۱۰

ج۔ ہئیت و اسلوب کے بنیادی مباحث ............ ۳۰

- ہیئتی تنقید ............ ۳۴
- اُردو میں شعری ہیتیں ............ ۳۷
- اسلوب کا تعارف ............ ۴۰

د۔ تقابل کے بنیادی مباحث ............ ۴۷

ہ۔ منظوم آپ بیتی نگاروں کا اجمالی تعارف ............ ۴۷

ج۔ ہیئت و اسلوب کے بنیادی مباحث ............ ۳۰

- وزیر آغا۔ مختصر تعارف ............ ۵۱
- حمایت علی شاعر۔ مختصر تعارف ............ ۵۴
- ادیب سہیل۔ مختصر تعارف ............ ۵۶

حوالہ جات ............ ۵۸

**باب دوم: ''آدھی صدی کے بعد'' کا ہیتی و اسلوبی مطالعہ ............ ۶۱**

الف۔ ''آدھی صدی کے بعد'' کا اسلوبی مطا،لعہ ............ ۶۱

ب۔ ''آدھی صدی کے بعد'' کا ہیتی مطالعہ ............ ۸۰

حوالہ جات ............ ۱۱۲

**باب سوم: ''آئینہ در آئینہ'' کا ہیئتی و اسلوبی مطالعہ ............ ۱۱۶**

الف۔ ''آئینہ در آئینہ'' کا ہیئتی مطالعہ ............ ۱۱۶

ب۔ ''آئینہ در آئینہ'' کا اسلوبی مطالعہ ............ ۱۳۷

حوالہ جات ............ ۱۸۶

**باب چہارم: ''غمِ زمانہ بھی سہل گُزرا'' کا ہیئتی و اسلوبی مطالعہ ............ ۱۹۱**

الف۔ "غمِ زمانہ بھی سہل گُزرا" کا ہیئتی مطالعہ ........ ۱۹۱

ب۔ "غمِ زمانہ بھی سہل گُزرا" کا اسلوبی مطالعہ ........ ۲۱۱

حوالہ جات ........ ۲۵۰

باب پنجم: تینوں منظوم آپ بیتیوں کا تقابلی مطالعہ ........ ۲۵۵

- ہیئتی اشتراکات ........ ۲۵۸
- اسلوبی اشتراکات ........ ۲۵۸
- ہیئتی افتراکات ........ ۲۶۱
- اسلوبی افتراکات ........ ۲۶۴

باب ششم: مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج، سفارشات ........ ۲۶۸

الف۔ مجموعی جائزہ ........ ۲۶۸

ب۔ تحقیقی نتائج ........ ۲۸۷

ج۔ سفارشات ........ ۲۸۸

کتابیات ........ ۲۹۰

## ABSTRACT: Literary Genres: A Comparatve study Haiti and Style

In the first chapter of this research paper, the first form is described in great detail. The style is then made the subject. After describing the form and style, the basic principles of your past are discussed. In the second chapter of this research paper, the first Haitian study of Dr. Wazir Agha's system "After Half a Century" was conducted. Then in the third chapter of this research paper "Aina Dar Aina" which is supported by Ali the poet's system and masterpiece Aap Beti which consists of at least three thousand verses. A stylistic study of your past was discussed. In order to complete this research paper, at the end of Chapter IV, Adib Sohail's autobiography "Gham Zamana Bhi Sahal Gazra" was first studied and then this research paper was brought to the completion by doing a stylistic study.

Autobiography is a unique and difficult thing in poetic style. It is very easy to describe anything in proses but skill and experience are required to express an event, happening or autobiography in poetic style in Urdu literature. Three autobiographers have been written in poetic style. I have presented comparative an analysis of these three autobiographies according to structure and style this research is a unique piece of work.

Work has been provided these three autobiographies are in poetic style. Out of three two are free verse and one is heroic verse. The style of these three autobiographies is very good. The combination of Arabic, Hindi, English and Persian has been found in these three autobiographies. These three poetic autobiographies did not get that much fame that they should have been given.

# اظہارِ تشکر

تمام تعریفیں رب العزت کے نام کہ جس کے قبضہ قدرت میں ہر ذی روح کی جان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس نے مجھے نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز جیسی عظیم جامعہ میں کچھ سیکھنے کا موقع دیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کے ساتھ میرا ایم فل اردو کا مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچا۔ میں نے اس تحقیقی مقالے کے ذریعے اردو کی منظوم آپ بیتیوں کا ہیئتی و اسلوبی تقابلی مطالعہ کر کے اردو ادب میں ایک اور باب کا اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس موقع پر میں اپنے والدین کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی تعلیم و تربیت اور ہر سطح پر حوصلہ افزائی نے مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کوئی بھی تحقیقی کام بغیر رہنمائی کے کسی بھی سطح پر پہنچانا مشکل امر ہے۔ اس سلسلے میں، میں اپنی نگران مقالہ ڈاکٹر نازیہ ملک صاحبہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے ابتدا سے لے کر مقالے کی تکمیل تک میری رہنمائی کرنے کے ساتھ ساتھ مفید مشوروں سے نوازتی رہیں۔ میں اپنے دیگر اساتذہ کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے تنقیدی و تحقیقی شعور عطا کیا اور ان رحیم و کریم اساتذہ کی بدولت میرے علمی شعور کی کئی شمعیں روشن ہوئی۔ ان مہربان اساتذہ میں نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد کی صدرِ شعبہ ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ، ڈاکٹر بشریٰ پروین صاحبہ، ڈاکٹر صنوبر الطاف صاحبہ، ڈاکٹر ارشاد بیگم صاحبہ، ڈاکٹر نعیم مظہر صاحب، ڈاکٹر محمود الحسن صاحب، ڈاکٹر عابد سیال صاحب، ڈاکٹر ظفر حسین صاحب، ڈاکٹر شفیق انجم صاحب اور دیگر اساتذہ کرام بھی شامل ہیں۔ ان تمام اساتذہ نے میرے ذہن کو علم کی خوشبو سے معطر کیا اور مجھے اس قابل بنایا کہ میں کچھ تحقیقی کام کر سکوں۔ میں ان تمام احباب کا بھی شکر ادا کرتا ہو جنھوں نے میرے اس تحقیقی کام میں میری معاونت کی خصوصاً ڈاکٹر علی کمیل قزلباش کا جنھوں نے مجھے مطالعے کی عادت ڈالی۔ مجھے جب بھی پریشانی کا سامنا ہوا تو مجھ پہ شفقت کا ہاتھ میرے استاد محترم ڈاکٹر فیاض نقی صاحب نے رکھا اور مجھے حوصلہ دیا۔ اس کے علاوہ برادرم مصطفی عباس کا بھی شکر گزار ہوں کہ جب بھی ضرورت پڑی وہ حاضر ہوئے اور میرے لیے آسانیاں پیدا کرتے رہے۔
برادرِ مکرم ڈاکٹر محمد زاہد خان صاحب اور پروفیسر محسن علی بخاری صاحب کا بھی بے حد شکریہ جنھوں

نے اس مشکل مرحلے میں میری مدد کی۔ میں شکر گزار ہوں کتابوں کی فراہمی کے تمام گروپوں کا اور بالخصوص برقی کتب E.Book(6) کے تمام احباب کا اور خصوصاً برقی کتب E.Book(6) کی ایڈمن محترمہ سدرہ طاہر صاحبہ کا کہ جب بھی کسی کتاب کی ضرورت پڑی انھوں نے فوراً بھیجی تاکہ میرے کام میں خلل نہ پڑے۔ میں اپنے بھائی محمد یاسر اور ناصر محمود کا احسان مند ہوں جنھوں نے دل کھول کر میری مالی معاونت کی تاکہ میں بروقت کام کر سکوں۔ اپنے ہم جماعتوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ میرے لیے نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز میں گزرا ہوا ہر لمحہ بہت خوبصورت رہا۔ اس عظیم درس گاہ سے حاصل کیا گیا علم، اعتماد، اور قابل صد احترام اساتذہ کا خلوص میری زندگی کی کتاب میں سنہری حروف میں لکھا ہوا ملے گا۔

فیصل ریاض

ایم فل اردو

## باب اوّل:

# موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

## (الف) تمہید

### 1۔ موضوع کا تعارف

یہ تحقیقی مقالہ اُردو ادب کی تین منظوم آپ بیتیوں کے تقابلی مطالعہ پر مشتمل ہے۔ آپ بیتی اردو کی مشہور ترین صنفِ نثر ہے۔ آپ بیتی کا مترادف لفظ ''خود نوشت'' بھی ہے انگریزی زبان میں اسے Auto Biography کہتے ہیں۔ اس میں مصنف اپنی زندگی کے تمام نشیب و فراز کا بڑی تفصیل کے ساتھ جائزہ لیتا ہے۔ اور تقریباً تمام واقعات کو قلم بند کرتا چلا جاتا ہے۔ منظوم آپ بیتی سے مراد ایسی آپ بیتی ہے جو نظم کی شکل میں لکھی گئی ہو۔ مذکورہ مقالے میں اردو کی تین منظوم آپ بیتیوں ''آدھی صدی کے بعد''، ''آئینہ در آئینہ'' اور ''غم زمانہ بھی سہل گزرا'' کا ہیئتی و اسلوبی تقابل کیا جائے گا۔ یہ تحقیقی مقالہ تین شخصیات کی منظوم آپ بیتیوں پر مشتمل ہے۔ منظوم آپ بیتی کی ابتدائی جھلک قدیم مثنویوں، سفر ناموں اور ڈراموں میں ضرور نظر آتی ہے۔ تاہم منظوم آپ بیتی کا باقاعدہ آغاز وزیر آغا کی آپ بیتی ''آدھی صدی کے بعد'' سے ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اب تک اردو ادب میں تین منظوم آپ بیتیاں ہی سامنے آئی ہیں۔ جن میں ''آدھی صدی کے بعد''، ''آئینہ در آئینہ'' اور ''غم زمانہ بھی سہل گزرا'' شامل ہیں۔

### ۲۔ بیانِ مسئلہ

اردو ادب میں منظوم آپ بیتیوں کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ مگر اب تک اُردو ادب میں منظوم آپ بیتیوں پر کوئی کام نہیں ہوا۔ اس مجوزہ تحقیقی موضوع کے ذریعے وزیر آغا، حمایت علی شاعر اور ادیب سہیل کی منظوم آپ بیتیوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے گیا۔

### ۳۔ مقاصد تحقیق

ا۔ شاعری میں منظوم آپ بیتی کا مقام واضح کرنا۔

۲۔ تینوں منظوم آپ بیتوں کا ہیتی و اسلوبی تجزیہ کرنا۔

۳۔ تقابل کے طریقہ کار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تینوں آپ بیتیوں میں افتراقات اور اشتراکات کا ہیئتی واسلوبی پہلو سے تقابل کرنا۔

**۴۔ تحقیقی سوالات**

مجوزہ تحقیق کے دوران درجہ ذیل سوالات سامنے آئیں گے۔

۱۔ تینوں منظوم آپ بیتیوں کی ہیئت کیسی ہے؟

۲۔ تینوں منظوم آپ بیتیوں کا اسلوب کیسا ہے؟

۳۔ تینوں آپ بیتیوں میں اشتراکات وافتراقات کی پیش کش کیسے کی گئی؟

**۵۔ نظری دائرہ کار**

کسی بھی فنکار کے اظہار کا طریقہ اُسلوب کہلاتا ہے۔

سید عابد علی عابد اُسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> " اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کا انداز نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیز ہو جاتا ہے۔"[۱]

ہئیت سے مراد شکل، صورت، ڈھانچہ وغیرہ ہیں۔ ہیئت خارجی صورت کا نام ہے جس میں کسی چیز کی انفرادیت کا تعین کیا جاتا ہے۔ جس طرح غزل، مثنوی، قطعہ، آزاد نظم، پابند نظم، نظم معریٰ وغیرہ ہیں۔

لغات میں ہیئت کے درج ذیل معنی بتائے گے ہیں: بناوٹ، ساخت، حال، حالت، کیفیت، ڈھنگ، طور، طریقہ وغیرہ۔ اسلوب یا انداز بیان سے مراد کسی بھی لکھاری کا ایک مخصوص طرز نگارش مراد لی جاتی ہے جو اس مصنف کو دوسرے مصنفین سے ممتاز کرتا ہے۔ اسلوب پر اس سے پہلے بہت کام ہو چکا ہے۔ اسلوب پر جتنا زیادہ کام ہوا ہے یہ اتنا ہی زیادہ پیچیدہ ہوتا چلا گیا ہے۔ اسلوب کے حوالے سے اطالوی فلسفی کروچے کا خیال ہے:

> "اظہار وجدان کی برابری کرے تو اسٹائل وجود میں آتا ہے"۔[۲]

کوئی بھی فن کار ہے اس کے ذہن میں پہلے خیالات جنم لیتے ہیں۔ فن کار کے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات اپنا اظہار چاہتے ہیں۔ فنکار ان خیالات کا اظہار اگر تحریر میں کرے تو وہ تحریری انداز ہی اصل میں فن کار کا اسلوب ہوتا ہے۔ اسلوب ہی کی بنا پر فن پہچانا جاتا ہے۔ اس خیال کو ایمرسن کچھ یوں بیان کرتا ہے:

"انسان کا اسلوب اس کی ذہنی آواز ہے"[۳]

انگریزی ادبیات میں ہیئت کے لیے Form کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ہیئت سے مراد جب کوئی ادبی فن پارہ تخلیق ہو جاتا ہے تو وہ کسی مخصوص شکل میں ہوتا ہے۔ ہیئت ہمیں ادبی فن پارے کی پہچان کروانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ پہلے ہم اس ادبی فن کو دیکھتے ہیں پھر اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ غزل ہے کہ نظم، داستان ہے کہ ناول، قصیدہ ہے کہ مثنوی۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ ہیت کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

"صورت ذہنیہ سے لے کر صورت جسمیہ تک جو کچھ ہے فارم ہے۔ اصل وہ جذباتی تحریک ہے جس نے ادیب یا شاعر کو کچھ لکھنے پر مجبور کیا"[۴]

اس بات سے اتفاق کر لینا چاہیے کہ ہمارے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات اظہار کے قالب میں ڈھل کر کوئی صورت اختیار کرتے ہیں۔ وہ صورت دراصل ہیئت ہی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

"تجربہ جب اظہار کے قالب میں ڈھلتا ہے تو اپنی ہیئت ساتھ لاتا ہے"[۵]

اس تحقیقی مقالے میں "آدھی صدی کے بعد"، آئینہ در آئینہ در" اور غم زمانہ بھی سہل گزرا" کا ہیتی و اسلوبی مطالعہ کیا جائے گا۔ مجوزہ تحقیقی موضوع اردو کی تین منظوم آپ بیتیوں کا ہیتی و اسلوبی مطالعہ پر مشتمل ہے لہذا موضوع کے مطابق منظوم آپ بیتیوں کا ہیتی و اسلوبی مطالعہ عابد کی عابد کی کتاب "اسلوب" قاسم یعقوب کی کتاب "اردو میں اسلوبیات کے مباحث" اور پروفیسر ڈاکٹر سیدہ محسنہ نقوی کی کتاب "اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر اور روایت" کے مطابق کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ سوزن بیسنٹ کی کتاب "تقابلی ادب ایک تنقیدی جائزہ" کو تقابل کے حوالے سے مستند مانا جاتا ہے جس کا ترجمہ توحید احمد نے کیا ہے۔ تقابل کے حوالے سے اس کتاب سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صبیحہ انور کی کتاب "اردو میں خودنوشت سوانح حیات" آپ بیتی کے حوالے سے اہم مانی جاتی ہے۔ اس کتاب سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ تینوں آپ بیتیوں میں ہیئت و اسلوب کے ضمن میں موجودہ اشتراکات و افتراقات کا مطالعہ اس کتاب میں پیش کیے گے اصولوں کے مطابق کیا جائے گا۔ اکسی بھی فن پارے کو لکھنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ آپ بیتی لکھنے کے لیے درج ذیل اصولوں کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ مثلاً

ا۔ خود پر بیتے واقعات کو ترتیب سے لکھنا۔

۲۔ جملوں اور عبارتوں میں ربط کا ہونا ضروری ہے۔

۳۔ آپ بیتی اتنے دلچسپ انداز میں لکھنی چاہیے کہ پڑھنے والے کی دل چسپی آخر تک برقرار رہے۔

۴۔ بہت سی ایسی باتیں جنھیں اگر سنجیدہ طریقے سے بتائیں تو افسوس ہوتا ہے آپ بیتی میں استعمال کیے جانے والے الفاظ میں مزاحیہ پن ہونا چاہیے۔

۵۔ آپ بیتی کا انداز شگفتہ ہونا چاہیے۔

آپ بیتی لکھنا دراصل اپنی عزت نفس کا جنازہ نکالنے کے مترادف ہے۔

## ۶۔ تحقیقی طریقہ کار

پیش نظر تحقیقی کام اردو کی تین منظوم آپ بیتیوں کے ہیئتی و اسلوبی مطالعہ پر مشتمل ہے۔ ان تینوں آپ بیتیوں کو بنیادی ماٰخذ کی اہمیت حاصل ہے۔ مذکورہ تحقیق کا موضوع دستاویزی اور تاریخی ہے اس موضوع پر تحقیق کرنے کے لیے تاریخی اور دستاویزی کتب سے استفادہ کیا جائے گا اور نتائج اخذ کیے جائیں گے۔ اور اردو کی منظوم آپ بیتی کی روایت، ہیئت اور اسلوب وغیرہ جیسے عمومی مباحث کے لیے ماٰخذ سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس دور کے نقادوں سے رابطہ کر کے مدد لی جائے گی۔ انٹرنیٹ کی ویب سائٹس، اخبارات، رسائل و جرائد اور ہم عصروں سے بھی مدد لی جائے گی۔ آپ بیتی سے مراد خود پر بیتے گے واقعات کو بتدریج لکھنا ہے۔ آپ بیتی لکھتے وقت آپ بیتی نگار خود کو کھول کر بیان کرتا ہے۔ آپ بیتی لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ کیوں کہ اس میں مصنف کو اپنی خوبیاں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی خامیوں کو بھی بیان کرنا ہوتا ہے۔ اپنی خامیوں سے پردہ اٹھانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ جوش ملیح آبادی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”اپنی اس زندگی کا حال کیا بتاؤں؟ جان کی امان پاؤں تو ابان بلاؤں۔ اللہ اللہ یہ آب و ہوا کی ناساز گاری یہ کراچی کی علم بیزاری۔ یہ پرانی یادوں کی کٹاریاں یہ نئے ماحول کی آریاں یہ چہرہ زندگی پر گرد و غبار کا غازہ۔ یہ دوش پر عزت نفس کا جنازہ“[۶]

## ۷۔ ماقبل تحقیق

منظوم آپ بیتیوں پر اس سے پہلے ہیئتی و اسلوبی تقابل کے حوالے سے کوئی کام نہیں ملتا۔ البتہ آپ بیتیوں کے حوالے سے درج ذیل عنوانات پر کام ہو چکا ہے:

پاکستانی سیاسی آپ بیتیوں میں سیاسی، سماجی شعور کا تقابل

( " فرزندِ پاکستان " اور " ہم بھی وہاں موجود تھے " ) کے حوالے سے۔ ملتان کے تین سیاستدانوں کی خود نوشتوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (یوسف رضا گیلانی، جاوید ہاشمی، صابزادہ فاروق علی (اردو ادب کی آپ بیتیاں تحقیقی و تنقیدی جائزہ) اس سے پہلے جو کام ملتا ہے اس میں فرزندِ پاکستان اور ہم بھی وہاں موجود تھے کو محققین نے اپنا تحقیقی موضوع بنایا ہے۔ اس تحقیقی کام میں منتخب کردہ آپ بیتیوں میں موجودہ سیاسی و سماجی شعور کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر جو تحقیقی کام سامنے آتا ہے۔ اس میں یوسف رضا گیلانی، جاوید ہاشمی اور صابزادہ فاروق علی جیسی شخصیات شامل ہیں۔ اس تحقیقی کام میں ان تینوں آپ بیتی نگاروں کی زندگیوں کا سر سری جائزہ لیا گیا ہے۔ لیکن یہاں زیادہ بحث ان کے شہروں کے حوالے سے ملتی ہے۔ آپ بیتی کے حوالے سے ایک اور کام جو ہمارے سامنے آتا ہے جو بہت عمدہ ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ پی ایچ ڈی کی سند کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں محقق نے چار سو کے لگ بھگ آپ بیتیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ اردو کی آپ بیتیوں کے تحقیقی و تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔ آپ بیتیوں کے حوالے سے مندرجہ بالا نوعیت کا تحقیقی کام ہمارے سامنے آتا ہے لیکن منظوم آپ بیتیوں پر اس سے پہلے کوئی تحقیقی کام دیکھنے کو نہیں ملتا۔

حمایت علی شاعر کے حوالے سے جو تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ ان میں "حمایت علی شاعر فن اور شخصیات "، "حمایت علی شاعر کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ " اس کے علاوہ "حمایت علی شاعر کا خصوصی نمبر بھی شائع ہو چکا ہے۔ ادیب سہیل کے حوالے سے جو تحقیقی کام ہوا ہے۔ اس میں "ادیب سہیل ایک مطالعہ " اور "ادیب سہیل کی ادبی خدمات " پر خصوصی گوشہ شائع ہو چکا ہے۔ وزیر آغا دنیائے ادب کی معروف شخصیت ہیں۔ ان کے ادبی کام پر بہت سا تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ جن میں "وزیر آغا کا فن ""وزیر آغا کی انشائیہ نگاری "، اور وزیر آغا کی تنقید " پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لہذا ان آپ بیتیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، جو خلا ہے اس خلا کو پُر کرنے کی یہاں کوشش کی جائے گی۔ منتخب کردہ موضوع اردو کی منظوم آپ بیتیوں کا ہیئتی و اسلوبی تقابلی مطالعہ پر مشتمل ہے۔

### ۸۔ تحدید

پسِ نظر موضوع اردو ادب کی تین منظوم آپ بیتیوں " آدھی صدی کے بعد "، " آئینہ در آئینہ " اور " غم زمانہ بھی سہل گزرا " کا ہیئتی و اسلوبی تقابل پر مشتمل ہے۔ لہذا یہ مقالہ انھی آپ بیتیوں کے تقابل تک محدود رہے گا۔

### ۹۔ پس منظری مطالعہ

اس تحقیقی مقالے کی تکمیل کے لیے پس منظری مطالعے کے طور پر مذکورہ تحقیق میں ان آپ بیتی نگاروں سے پہلے کی آپ بیتیاں جن میں ، نشانِ جگر سوختہ ، یادوں کی برات ، شام کی منڈیر سے ، جیسی آپ بیتیوں سے مدد لی گئی اور تنقیدی ادب سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ تنقیدی کتب جن میں اسلوب، اسلوبیات کے مباحث، اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر اور روایت، تقابلی ادب ایک تنقیدی جائزہ وغیرہ جیسی کتب سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ میرے پس منظری مطالعے میں تین غیر مطبوعہ کتب بھی شامل ہیں۔ جن میں:

۱۔ پاکستانی سیاسی آپ بیتیوں میں سیاسی و سماجی شعور کا تقابل۔

۲۔ ملتان کے تین سیاستدانوں کی خود نوشتوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔

۳۔ اردو کی آپ بیتیاں تحقیقی و تنقیدی مطالعہ بھی شامل ہے۔

اس کے علاوہ مجوزہ موضوع کی تکمیل کے لیے اخبارات، رسائل و جرائد اور تبصروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

### ۱۰۔ تحقیق کی ضرورت / اہمیت

ان آپ بیتیوں کے تقابل کے دوران میں ان کی ہیئت اور اسلوب کا مطالعہ کیا ہے۔ جس سے کسی بھی فن پارے کے ہیئت و اسلوب کے بارے میں معلومات فراہم کی ہے۔ تینوں منظوم آپ بیتیوں سے قدیم ہندوستان اور پاکستان کی تہذیب و ثقافت اور جدید ہندوستان اور پاکستان کی تہذیب ثقافت کو جاننے میں مدد ملے ہے۔ ان تنیوں منظوم آپ بیتیوں کو پڑھنے کے بعد آپ بیتی نگاروں کی زندگی، خاندانی پس منظر، اور تمام فکری نقطہ نظر اور ان کی زندگی چھپے ہوئے گوشوں سے بڑی حد تک آگاہی ملی ہے۔

### ب: آپ بیتی کیا ہے؟ بنیادی مباحث

دنیا کی ہر زبان میں آپ بیتی لکھی گئی ہے۔ اس وسیع آسمان کے نیچے اور طرح طرح کی نعمتوں سے مزین زمین کے اوپر جب انسان نے قدم رکھا تو اس کو زندگی جیسی نعمت سے نوازا گیا۔ زندگی صرف سانسوں کے زیر و بم کا نام نہیں ہے بلکہ یہ انسانی اعمال و افعال، اخلاق و کردار، عادات و اطوار سے لے کر جسم و روح کی ایک مکمل داستان ہے۔ انسان جب اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کی آرزو ہوتی ہے کہ میں

کوئی ایسا کام کروں جسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے۔ میں کون ہوں؟ کیوں ہوں؟ اس جیسے کئ اور سوالات انسان کو کھوج لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے انسان نے قلم کا سہارا لیا اور اپنے تجربات لکھ ڈالے۔ آپ بیتی بہت سے فن کاروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ اپنی ذات کے اظہار کا جذبہ ہر فن کی بنیاد میں شامل رہا۔ آپ بیتی کے ابتدائی نقوش ہمیں اردو نثر کے آغاز سے ہی ملنا شروع ہو گے تھے۔ بعد میں وزیر آغا نے ۱۹۸۱ء میں –" آدھی صدی کے بعد " لکھ کر منظوم آپ بیتی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد حمایت علی شاعر نے بھی ۲۰۰۱ء میں " آئینہ در آئینہ " لکھی۔ اس کے بعد ادیب سہیل نے بھی اس کام کو بڑے جوش و جذبے کے ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے ۲۰۰۳ء میں " غم زمانہ بھی سہل گزرا" لکھ کر لوگوں کی توجہ منظوم آپ بیتی کی طرف مبذول کرائی۔

### 1۔ ابتدائیہ:

آپ بیتی سوانحی ادب کی اہم شاخ ہے۔ آپ بیتی نگار اپنی زندگی کے حالات کو، علم و ادب تہذیب و ثقافت کے رنگوں کو بھی اپنی طبع کے مطابق پیش کرتا ہے۔ کسی بھی آپ بیتی کے مطالعہ و جائزہ کے لیے اس دور کی سیاسی، علمی و ادبی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے تا کہ اس دور کے سیاسی، علمی و ادبی حالات سے آگاہی حاصل ہو سکے۔

انسان حیوان ظریف کہلایا ہے۔ اور اگر اس کو متجسس کہا جائے تو بھی بات درست معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے اور کچھ نیا معلوم کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ وہ انسان ہی ہے جس نے اپنی کوششوں سے سمندر کی گہرائیوں کا پتہ لگایا۔ وہ انسان ہی ہے جو ہواؤں کو چیرتا ہوا چاند کے سینے پر قدم جماتا ہے۔ انسان کا علم دو طرح کا ہوتا ہے ایک علم خارجی مشاہدات کا مرہون منت ہوتا ہے۔ دوسرا علم انسان کی اپنی ذات کا مشاہدہ ہے۔ اتنی وسیع دنیا کے سامنے ہمیں اپنا آپ حقیر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم اپنے آپ کے اندر کی دنیا میں غوطہ زن ہوتے ہیں تو وہاں ہمیں ایک نیا جہاں آباد ملتا ہے۔ ایک ایسا جہان، جہاں تک کولمبس بھی پہنچنے میں ناکام رہا۔ ایک ہم ہی ہیں جو اپنے اندر کی دنیا سے واقف ہیں۔ خارجی علم کو جاننے کے لیے ہمارے پاس دوسرے ذرائع علم اور دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں۔ اور ان علوم و قوانین میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن خود کو جاننے کے لیے آج تک کوئی ٹیکنالوجی تیار نہیں ہوئی۔ اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ عرفانِ ذات ایک مشکل کام ہے۔

## 2۔ آپ بیتی کی روایت:

آپ بیتی کسی بھی شخص کا اپنی شخصیت کو تحریری انداز میں اس طرح بیان کرنا ہے کہ اس کی سیرت کا کوئی بھی گوشہ پوشیدہ نہ رہے۔ آپ بیتی نگار اپنی آپ بیتی میں اپنی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ سوانحی ادب میں آپ بیتی ایک مشہور صنف نثر ہے۔ اور اس صنف نثر کی ہر دور میں اپنی اہمیت ہے۔ آپ بیتی کسی شخص کے گزرے ہوئے بتدریج لمحات واقعات کا نام ہے۔ جس میں آپ بیتی نگار اپنی خوبیوں سمیت اپنی خامیوں سے بھی پردہ چاک کرتا ہے۔ اس جذبے کا اظہار محمد طفیل یوں کرتے ہیں:

"آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات، نظریات اور عقائد کی ایک مربوط داستان ہوتی ہے جو خود اس نے بے کم و کاست اور راست قلم بند کر دی ہو۔ جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ معلوم ہوں۔ اس کے نہاں خانوں کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کے علاوہ اس کی داخلی کیفیات کے حجرے میں جھانک کر دیکھ سکیں۔"[1]

ابتداء سے ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر تحقیق و جستجو کا چراغ روشن کر رکھا ہے۔ انسان ازل سے ہی اپنے انسان چھپی چیزوں کو ظاہر کرنے کا عادی ہے۔ اسی جستجو کی بنا پر خدائے واحد نے انسانوں کو تحقیق و جستجو کی اہمیت سے روشناس کر دیا ہے۔ ہم اگر تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے ماضی میں بھی چیزوں کو پرکھنے کا فن خوب آزمایا ہے۔ ان ثبوتوں کی بنا پر ہم کہ سکتے ہیں کہ خود نوشت لکھنے کا رواج زمانہ قدیم سے ہی چلتا ہوا آرہا ہے اور آج تک جاری و ساری ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ آپ بیتی کی ابتدا ہزاروں سال پرانی ہے۔ آپ بیتی اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ انسان خود ہے۔ اس کا آغاز انسان کے ساتھ ساتھ ہوا۔ مگر زمانے کی گردش نے آپ بیتی کے نام و نشان مٹا دیے ہیں۔

"The story of one's life, written by himself"[2]

## 2.1۔ آپ بیتی کے نقوش:

دورِ حاضر میں اردو آپ بیتی کی جو اہمیت حاصل ہے ابتدا میں ایسا بالکل بھی نہیں تھا۔ آپ بیتی کے ابتدائی نقوش ماضی کی تحریروں میں واضح نظر آتے ہیں۔ علم الدین سالک کے بقول:

"تاریخ کی ان تمام اصناف میں ہر مصنف نے تاریخ اور تذکروں کے آخر پر آپ بیتی کے طور پر اپنے تھوڑے بہت حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر ان کو اکٹھا کر لیا جائے تو آپ بیتی کا ایک بیش بہا مرقع تیار ہو سکتا ہے۔"[3]

آپ بیتی کے ابتدائی دور میں علماو صوفیائے کرام نے بھی اپنا حصہ ڈالا ہے۔ دین کی تبلیغ کے سلسلے میں جب یہ لوگ خطاب کیا کرتے تھے تو ان کے کچھ خاص لوگ ان خطابات کے اہم نکات لکھ کر محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ اور پھر ان احکامات کو عام لوگوں تک منتقل کر دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے صوفیاو علماکرام کے خطوط میں بھی آپ بیتی کی جھلک نظر آتی ہے۔ان میں بعض خطوط ایسے بھی ملتے ہیں جو تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ ان خطوط کو دیکھ کر اس زمانے کی تاریخ کے حوالے سے اگاہی حاصل کی جا سکتی ہے۔اولیائے کرام کے علاوہ انشا پردازوں کے خطوط میں بھی اس زمانے کی تہذیب و ثقافت کی واضح چھاپ نظر آتی ہے۔ قدیم دور کے شعرائے کرام کے کلام میں بھی آپ بیتی کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ لیکن تمام محققین کی متفقہ رائے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ بیتی کو باقاعدہ صنف نثر انیسویں صدی کے آخر میں مقبولیت ملی ہے۔ اور بیسویں صدی میں یہ صنفِ نثر پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آئی اور خوب پھلی پھولی۔ اس حوالے سے ریحانہ خانم رقمطراز ہیں:

> ''جب ہم اردو آپ بیتی کی روایت پر نظر دوڑاتے ہیں تو سوانح نگاری کی طرح آپ بیتی بھی جدید دور کی ایجاد محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے دھندلے سے نقوش شاعری کے بعض نمونوں ، تذکروں اور فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی تالیفات کے دیباچوں وغیرہ میں بھی مل سکتے ہیں۔ تاہم آپ بیتی یا سرگزشت کی قدرے ترقی یافتہ صورت اردو میں انیسویں صدی کے آخر میں ملنے لگتی ہے۔ بیسویں صدی میں بہت زیادہ آپ بیتیاں لکھی گئیں جن میں بعض فنی اعتبار سے قابل قدر ہیں''[4]

## 2.2۔ آپ بیتی کی مختلف شکلیں:

انسان جب شعور میں آتا ہے تو پہلے دن ہی سے اس کے دل و دماغ میں کچھ سوالات اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ زندگی کیا ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ ان چیزوں کو جاننا ہمیشہ ہی سے انسان کا بہترین مشغلہ رہا ہے۔ انسان نے ان مقاصد کی تکمیل بڑے احسن طریقے سے کی ہے۔ انسان نے اپنے اردگرد کی چیزوں کو بغور دیکھا اور نئے نئے تجربات سے ہمکنار ہوتا رہا ہے۔ انسان کی زندگی میں بہت سے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ان تمام واقعات کو بتدریج بیان کرنے کا نام آپ بیتی ہے۔ جو واقعات انسانی زندگی میں رونما ہوتے رہے ہیں ان واقعات کو بھی ادیب اور شاعر نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس لیے ہم کہ سکتے ہیں کہ ابتدائی دور میں

لکھے گے خطوط، تذکرے، سفر نامے، مثنویات،روزنامچے، انٹرویوز، رپورتاژیں وغیرہ۔ ان تمام اصناف سخن میں آپ بیتی کے واضح نشانات ملتے ہیں۔ ذیل میں مختلف اصافِ سخن کو آپ بیتی کی ابتدائی شکلوں کے حوالے سے پیش کیا جارہاہے۔

### 2.3۔ آپ بیتی بطور افسانہ

افسانہ اردو ادب کی نثری صنف ہے جس میں چند کرداروں کے ذریعے کسی قصے، کہانی، واقعہ وغیرہ کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔ افسانہ کی کہانی کا تعلق حقیقی زندگی کے بہت قریب ہوتا ہے۔ اس کہانی میں مصنف کسی نہ کسی کی زندگی کی کہانی کو بیان کر رہا ہوتا ہے۔ اور کہانی ایسی ہونا ضروری ہے جس میں قاری کی دلچسپی کا طلسم نہ ٹوٹے۔ شروع شروع میں انگریزی ادب کے ناولوں کو بھی آپ بیتی کے ساتھ جوڑا جاتا رہا۔ اس حوالے سے یوسف انصاری لکھتے ہیں:

> ”اگر ناول پر درج ہو کہ یہ فرضی کردار کا افسانہ نہیں ہے، سچ مچ کی سر گزشت ہے تو لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ ناول یا افسانے کو سوانح عمری یا سرگزشت کہہ کر پکارنا عام تھا“[۵]

جس ناول یا افسانے میں یہ بات واضح ہو جائے کہ اس میں ایک زندہ کردار کے ذریعے کہانی کا تانا بانا بُنا گیا تو ناول یا افسانہ بہت کم وقت میں عوام الناس میں مقبول عام ہو جاتا تھا۔ اس حوالے سے یوسف جمال انصاری مزید بیان کرتے ہیں کہ:

> ”لوگ شاعرانہ صداقت کی قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ نہ تھے اس لیے مصنفین کو لازم آنا تھا کہ افسانے یا ناول کو سوانح یا سرگزشت یا شخصی تاریخ کہہ کر پکاریں“[۶]

اردو میں بہت سی آپ بیتیاں ایسی ہیں جن میں افسانوی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ افسانے اور آپ بیتی کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ افسانے اور آپ بیتی کے اس تعلق کی طرف یوسف جمال انصاری کچھ اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

"افسانے کا سوانح یا آپ بیتی سے الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ قاری کے لیے اگر شاعرانہ صداقت موجود ہو تو افسانہ بھی سوانح حیات یا آپ بیتی سے مختلف نہیں اور اگر بنیادی انسانی قدریں مقصود ہوں تو سوانح حیات بھی بے جان اور بے معنی واقعات کا ایک تسلسل ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں"۔[۷]

## 2.4۔ مکتوبات بطور آپ بیتی

مکتوبات خیالات کے تبادلے کا بہتر ذریعہ مانے جاتے رہے ہیں۔ عام طور پر مکتوبات ایک دوسرے کے حال و احوال سے آگاہی کے لیے لکھے جاتے رہے ہیں۔ مکتوبات میں کاتب اپنے جذبات و احساسات کو تحریری انداز میں مکتوب الیہ تک بھیجتا ہے۔ خط میں خوشی، غم، موت، ملاقات، کامیابی، ناکامی یعنی کہ ہر طرح کے جذبات کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ آسان اور عام فہم اسلوب خط کی اصل پہچان ہوتا ہے جبکہ سستی جذباتیت خط کے حسن کو غارت کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کے بقول:

> ”خط یوں تو دو چار باتوں کا نام ہے مگر چونکہ خط تو فن و شخصیت دونوں سے مل کر تیار ہوتا ہے لہٰذا مستقل شاہکار بننے کے لیے دانش و بینش کے جوہر کے علاوہ خط میں کچھ چیزیں ضروری بھی ہیں جس کو آدمیت کا رنگ آشنائی کہا جا سکتا ہے۔ تاکہ مطالعہ کرنے والے کو یہ محسوس ہو کہ کسی خط میں کچھ ایسی باتیں ہیں جن سے اس کی روح مانوس اور شناسا ہے“[۸]

خط میں جو چیز ظاہر ہوتی ہے وہ شاعر کے ذاتی و گھریلو زندگی کے حوالے ہیں۔ لیکن ہم خط کو مکمل آپ بیتی نہیں کہہ سکتے بلکہ خطوط آپ بیتی کا ایک مختصر حصہ ہے۔

## 2.5۔ آپ بیتی بصورت مثنوی

مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا مطلب دو دو کے ہیں یہ لفظ مثنیٰ سے مشتق ہے۔ مثنوی اپنی ہیئت یا شکل کے حوالے سے شاعری کی ایک قسم ہے۔ مثنوی اکثر پابند نظم کی ہیئت میں لکھی جاتی ہے۔ جس کا ہر شعر الگ الگ قافیہ اور ردیف رکھتا ہے۔ ذیل میں مثنوی سحر البیان اور گلزار نسیم کے چند اشعار کے ذریعے مثنوی کی ہیئت و صورت کو واضح کیا جارہا ہے۔ مثنوی سحر البیان سے اقتباس:

"زمرد کی مانند سبزے کا رنگ<br>
روش پر جوہر لگا جیسے سنگ<br>
روشن کی صفائی پہ بے اختیار<br>
گل اشرفی نے کیا زر نثار<br>
چمن سے بھرا باغ، گل سے چمن<br>
کہیں نرگس و گل، کہیں یاسمین

چمن آتش گل سے دہکا ہوا

ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا"

درج بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی کے ہر شعر کا قافیہ اور ردیف دوسرے اشعار سے مختلف ہے۔ لیکن ہر شعر دعسرے شعر سے مربوط نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے مثنوی ایک طویل مضمون کی شکل اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ مثنوی میں عام طور پر طویل قصے، کہانی کو بیان کیا جاتا ہے۔ مثنویات میں زیادہ تر رزمیہ قصے، کہانیاں اور مافوق الفطرت داستانوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ اردو میں مثنوی کی روایت بھی پرانی ہے تاہم فارسی میں مثنوی کی روایت زیادہ پرانی ہے۔ اردو میں مثنوی کا آغاز دکن سے ہوا ہے۔ دکنی ادب میں نصرتی، رستمی، غواصی، ابنِ نشاطی فیروز، اشرف اور وجہی کی مثنویاں قابل تعریف ہیں، اور اس روایت کو مزید آگے بڑھانے میں میر اثر، میر تقی میر، میر حسن، دیاشنکر نسیم اور نواب مرزا شوق کے نام پیش پیش رہے۔ مثنوی میں آپ بیتی کے نشانات کے حوالے سے یوسف جمال انصاری کہتے ہیں:

"یہ بھی ایک قدیم دستور چلا آرہا ہے کہ اصل قصہ بیان کرنے سے پہلے شاعر خود اپنے دور اور اپنے حالات مختصراً بیان کرتے تھے اس لیے اس حصے کو آپ بیتی کہا جاتا ہے دونوں اصولوں میں مثنوی کے پیرائے میں سوانحی ادب کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی چلی آئی ہے۔"[9]

اس بحث کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے مثنوی اور آپ بیتی کے تعلق کو ظاہر کرتے ہوئے مثنوی گلزار نسیم کا ایک اقتباس ضروری ہے:

"آیا کوئی لے کے نسخہ نور

لایا کوئی جاکے سرمہ طور

تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور

بیٹا نہ ہوا وہ دیدہ، کور

ہوتا ہے وہی جو خُدا چاہے

مختار ہے جس طرح نبا ہے"

یوں تو مثنوی عشق و محبت جنگ و جدل کے موضوعات کو بیان کر رہی ہے۔ مثنوی واحد صنف شاعری ہے جو اپنے اندر خاصی وسعت رکھتی ہے۔ یونان کے علمی و ادبی دور میں جو رزمیے اور المیے بیان کیے جاتے تھے

وہ دراصل مثنوی کی ہی شکل کے تھے۔ مثنوی نگار کا اصل مقصد کسی خاص تہذیب و تمدن کو پوری سچائیوں کے ساتھ بیان کرنا تھا۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ مناسب ہے مثنوی در حقیقت جگ بیتی کا دوسرا نام ہے۔
مثنوی کی اہمیت کو واضح کرتے ہو میر احمد علوی لکھتے ہیں:

> "اصطلاح میں مثنوی اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور سب اشعار ایک ہی بحر میں ہوں نہ قصیدہ کی طرح ادبیات کی تعداد محدود ہے نہ غزل کی طرح ردیف قافیہ کی قید۔ مناظرِ قدرت، فلسفہ و تصوف کے طویل مباحث حسن و عشق، رزم و بزم کی داستانیں اس صنف سخن میں بخوبی نظم ہو سکتی ہیں اور واقعہ نگاری کے لیے اس نوع سے بہتر مشرق کی شاعری میں کوئی اسلوب نہیں"[1]

عام طور پر مثنویوں میں بیان کردہ شعرا کے حالات زندگی اور خاندانی حال و احوال کو اسلوب کی خصوصیات کے ساتھ بیان کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ بیتی کے ابتدائی نقوش میں مثنویوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

### 2.6۔ سفر نامے میں آپ بیتی کی جھلک

سفر نامہ نگاری دنیا کے ہر ادب کی ایک مستقل صنف رہی ہے۔ جب کوئی بھی ادیب کسی سفر کو نکلتا ہے تو وہ اس سفر کے دوران میں رونما ہونے والے تمام واقعات کو قلم بند کرتا چلا جاتا ہے۔ اس مکمل کہانی کو سفر نامہ کہتے ہیں۔ سفر نامہ نگار جہاں کا سفر کرتا ہے وہ اس ملک یا علاقے کو تاریخی، تہذیبی و ثقافتی حوالے سے بڑے احسن طریقے سے بیان کرتا ہے۔ کوئی بھی تحریر ہو اس کے اندر دلچسپی کا عنصر ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے سفر نامہ لکھتے وقت سفر نامہ نگار اپنے سفر نامے میں تحیر و تجسس کے جن مراحل سے گزرتا ہے انھیں افسانوی رنگ دے کر اپنے سفر نامے کو قاری کے لیے دلچسپ اور معلومات افزا بنا دیتا ہے۔ نثری سفر نامے کی اگر بات کریں تو اردو کا پہلا سفر نامہ یوسف خان کمبل پوش کا "عجائبات فرنگ" ہے۔ مگر یہاں ہمیں منظوم سفر نامے میں منظوم آپ بیتی کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔

سفر عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے فاصلہ طے کرنا۔ لیکن اس فاصلہ طے کرنے کے دوران میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوران سفر انسان بہت سے خطرات کا سامنا کرتا ہے۔
بقول شیخ سعدی

”غریب آشنا باش و سیاح دوست
کہ سیاح جلاب نام نکوست“

سعدی کہتا ہے کہ:

”تو سیاح کا دوست بن جا کیوں کہ وہ نیک نام اور اچھی یادیں اپنے ساتھ لے جائے گا یعنی کہ اگر تم سیاح کے ساتھ جیسا سلوک اختیار کرو گے تو وہ جہاں جائے گا تمہارا ذکر ضرور کرے گا“[۱۱]

### 2.7۔ اردو کے منظوم سفر ناموں میں منظوم آپ بیتی کے نقوش:

اردو میں زیادہ تر سفر نامے نثر کی شکل میں ملتے ہیں اور اس کی وجہ یہ سامنے آتی ہے کہ سفر کے حالات و واقعات بیان کرنے کے لیے نظم کی بہ نسبت نثر زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سفر نامہ نظم کی شکل میں نہیں لکھا جا سکتا۔ اصناف نظم میں بھی مسدس اور مثنوی کی ہئیتیں اظہار کے لیے موزوں تسلیم کی گئیں ہیں۔ آپ بیتی کے لیے تو مثنوی کو موزوں ترین صنف سخن قرار دیا گیا ہے۔

سفر نامہ بھی آپ بیتی ہی کی ایک شکل ہے۔ مسافر اپنے ساتھ آنے والے واقعات پر جتنا خلوص نچھاور کرے گا قاری کے لیے اتنی ہی دلچسپی بڑھے گی اور وہ کامیاب سفر نامہ کہلائے گا۔ چناچہ کامیاب ترین سفر نامے وہی ہیں جن میں مسافر اپنی ذات اور مناظر کے درمیان سے دوئی کا پردہ ہٹا دیتا ہے۔ اگر منظوم سفر نامے کی بات کریں تو اردو میں اس پر کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اردو ادب کی گود منظوم سفر ناموں سے خالی ہے۔ بہت سے شعرا اکرام نے اپنے منظر ناموں اور واردات کو شاعری کے ذریعے پیش کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ چونکہ اس مقالے کا موضوع اردو کی منظوم آپ بیتیوں کے ہیئتی و اسلوبی تقابل پر مشتمل ہے اس لیے منظوم سفر ناموں کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ منظوم سفر ناموں میں آپ بیتی کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہاں چند ایک منظوم سفر ناموں کا تذکرہ ضروری ہے۔

ا۔ حزنِ اختر:

عبد الحلیم شرر اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

”واجد علی شاہ کا شمار ان ادبی مزاج رکھنے والے تاجداروں میں ہے جنھوں نے اپنے حالات خود ہی لوح زمانہ پر درج کر دیے ان کی مثنوی "حزن اختر،، مٹیا برج میں قید فرنگ کے دنوں کی یاد گار ہے“ [۱۲]

شر رنے واجد شاہ کی سوانح عمری کا ایک بہت ہی زخمی اور درد سے بھرا ٹکرا قرار دیا ہے۔ اس کے ابتدائی حصّے کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس میں واجد علی شاہ کے سفر کے واقعات بھی شامل ہیں جو سفر واجد علی شاہ نے لکھنو سے کلکتہ کا کیا تھا۔ اس سفر نامے میں واجد علی شاہ کی معزولی کے واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے ۔ وہ ل ایک جفہ لکھتے ہیں:

"رزیڈنٹ جرنیل اور ٹرم جو تھے
گورنر کا خط مجھ کو وہ دے گئے
یہ بندہ بہت ان دنوں سے تھا علیل
کہا دل نے کیا سوچوں اس کی سبیل"

واجد علی شاہ کا یہ سفر نامہ مختلف واقعات کو لے کر چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس میں درد مندی، مشاہدات اور تاثر نظر آتا ہے۔ اس سفر نامے نے منظوم سفر ناموں کے ادبی سفر کو مزید بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

- **منیر شکوہ آبادی کا سفر نامہ:**

منیر شکوہ آبادی اٹھارویں صدی کا ایک اہم نام تھا۔ وہ دیگر مقدمات میں اسیری کی زندگی گزارنے والے ادیب تھے۔ آئے دن ہجرت ان کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔ اس سفر نامے میں منیر شکوہ آبادی کا سفر جو باندہ سے ایڈیمان تک کیا تھا اس سفر کا حال واحوال بڑی خوبصورتی کے ساتھ منظوم شکل میں درج ہے۔ اس لیے یہ سفر نامہ ان کا منظوم سفر نامہ کہلاتا ہے۔ جب وہ فرّخ آباد کو خیر آباد کہتے ہیں تو اس کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں۔

"فرخ آباد اور یارانِ شفیق
چھٹ گے سب گردش تقدیر سے
آئے باندہ میں مقید ہو گے ہم
سو طرح کی ذات و تحقیر سے"

منیر شکوہ آبادی کے اس سفر نامے میں ہجرت قید و بند اور رہائی کے واقعات درج ہیں۔

- **سفر حجاز:**

یہ سفر نامہ حضور ﷺ کے ساتھ عقیدت و محبت کی عمدہ داستان بیان کرتا ہے۔ یہ بھی ایک منظوم سفر نامہ ہے جس میں قادر بادشاہ خود پر نازاں ہیں کہ انھیں نبی کریم ﷺ کی گلی کوچوں میں جانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ وہ اپنے سفر نامے کا آغاز یوں کرتے ہیں۔

"سوئے کعبہ ان دنوں جاتے ہیں
حق کے فرماں کو بجا لاتے ہیں ہم
ہم کہاں یہ نعمتِ عظمیٰ کہاں
اپنی خوش قسمتی پر اتراتے ہیں ہم"

اس سفر نامے میں ابتدا سے لے کر اختتام تک کے تمام حالات و واقعات کو منظوم شکل میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

- **گلزارِ عرب:**

اس سفر نامے کے شاعر فقیر محمد عارف کا تعلق چشتیہ سلسلے سے تھا۔ انھوں نے اپنے اس سفر نامے کا آغاز بمبئی سے کیا سفر کے مناظر کو سات سو کے لگ بھگ اشعار میں بیان کیا ہے۔ اس سفر نامے میں جذبات کی پیشکش بڑی عمدہ ہے لیکن فقیر محمد عارف شاعری کے فن سے ناواقف تھے اس لیے یہ سفر نامہ فنی لحاظ سے کچھ خامیوں کا شکار ہے۔

- **راہ وفا:**

یہ سفر نامہ محمد حفیظ الرحمٰن وفا ڈبائیوی کا ہے۔ جس میں انھوں نے عراق، مصر، شام اور فلسطین کے سفری حالات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ محمد حفیظ الرحمٰن ان ملکوں سے ہوتے ہوئے حجاز مقدس کو جا پہنچے تھے "راہ وفا،، میں محمد حفیظ الرحمٰن نے نظم و نثر دونوں صورتوں کو آزمایا ہے۔ وہ جب اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں تو لکھتے ہیں:

"اے موج بحر ہستی تو ساکن جہاں ہے
فرشِ زمیں ہے نیچے اور چرخ سائبان ہے"

اس سفر نامے میں شام، مصر، بغداد، فلسطین، جدہ، حرم، خانہ کعبہ، مسجد نبوی اور واپسی پر دل لاچار کے حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے منظوم سفر ناموں میں حفیظ الرحمن کا سفر نامہ۔ "راہ وفا" بھی اپنا الگ مقام رکھتا ہے۔

- **دیار نبی ﷺ:**

یہ سفر نامہ مولانا ضیاء القادری بدایوانی کے قلم سے نکلا ہے۔ ان کے حوالے سے ایک بات مشہور ہے کہ جب بھی وہ نعت رسول مقبول ﷺ لکھتے تو یہ محبت رسول میں غرق ہو جاتے تھے۔ جب حضور ﷺ کی طرف سے ان کو بلاوا آیا تو خوشی کا عالم دیدنی تھا۔ انھوں نے بدایوان سے مدینہ منورہ اور مدینہ منورہ سے کراچی کا سفر منظوم شکل میں لکھ دیا۔

جب مولانا ضیاء القادری اپنے معاملات حل کرنے کے بعد واپسی کا سفر باندھتے ہیں تو اپنے جذبات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں۔

"سرور حسن عقیدت تمام ہوتا ہے
الٰہی کعبے سے رخصت غلام ہوتا ہے"

یہ سفر نامہ وطن سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سے رخصتی تک کے تمام واقعات کی تصویر کشی کرتا ہے۔ تمام مناظر کو شاعر عشق و مستی کے والہانہ جذبے میں ڈوب کر منظوم شکل میں بیان کرتا ہے۔ اس سفر نامے کو حج کے تمام سفر ناموں سے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ منزلیں ایک کم پڑھے لکھے سفر نامہ نگار کا سفر نامہ ہے یہ بھی منظوم شکل میں لکھا گیا ملازم نے یہ سفر نامہ اپنی ملازمت کے دوران لکھا۔

- **کاروانِ حرم:**

یہ سفر نامہ ع-س مسلم نے منظوم صورت میں لکھا ہے۔ انھوں نے عمرہ کے دوران پیش آمدہ واقعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ اس سفر نامے میں کیفیات سفر کی پوری طرح درج نہیں کی جا سکی۔ البتہ مسلم کی ایک خاص کیفیت جو ایک طویل دعا کی ہے جس میں طالب اپنے مالک کے سامنے اور محبوب کے ساتھ خود کلامی میں مگن نظر آتا ہے۔

## 2.8۔ ڈرامے میں آپ بیتی کی جھلک

ڈرامے کا لفظ ڈراؤ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے کر کے دکھانا۔ اگر ڈرامے کو سادہ الفاظ میں بیان کریں تو اس کی تعریف یہ ہے:

"زندگی کے واقعات کو کسی منصوبے کے ساتھ سٹیج پر عملی صورت میں پیش کرنا ڈراما ہے"[۱۳]

## شکنتلا-اردو میں پہلا ڈراما

اردو کے پہلے ڈرامے کے حوالے سے ہمیشہ محققین کے آرا مختلف رہی ہیں۔ مولوی سید محمد نے شکنتلا کو اردو کا پہلا ڈرامہ قرار دیا ہے۔ محمد اسلم قریشی اپنے ایک مضمون ،، قصہ نگاریں،، میں شکنتلا کے حوالے سے اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"در حقیقت نواز کی کتاب،، شکنتلا ناٹک،، برج بھاشا میں ایک منظوم داستان ہے۔ نواز بھاشا کی شاعری میں نواج تخلص کرتا تھا۔ یہ داستان چار حصوں میں ہے۔ یہ کالی داس کے ڈرامے کا ترجمہ نہیں ہے اور نہ ہی ڈرامے کی صورت میں ہے۔ جیسا کہ جو ان کے بیان سے شبہ ہوتا ہے۔ جوان کی کتاب بھی ڈرامے کی صورت میں ہے اور نہ نواز کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس بات سے بھی اتفاق کرنا ہو گا کہ نواز نے یہ منظوم داستان مولا خان کی فرمائش پر لکھی تھی۔ بلکہ اس کے برعکس جوان کے دیپاچے سے واضح ہے کہ مولا خان کے بیٹے کی فرمائش پر جس کا نام محمد صالح خان ہے اسے اعظم خان کا خطاب ملا تھا اس کی فرمائش پر ہی یہ نظم کہی گئی تھی،،" [۱۴]

شکنتلا کے حوالے سے نواز اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"بن میں مدھو کر بہت ستائی
شکنتلا تب ٹیر سنائی
کات ادھر مدت نہیں تارے
ہو تو نہیں کچھ ہاتھن چھارے"

### اندر سبھا کی ہیئت

اگر اندر سبھا کی ہیئت کی بات کریں تو یہ منظوم شکل میں ملتا ہے۔ اس ڈرامے میں نثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس ڈرامے میں ناچ، گانا، ٹھمریاں چولیوں وغیرہ کے عناصر خاصے مضبوط ملتے ہیں۔ اس بات کا ندازہ شروع میں ہی ایک سطر سے کر دیا جاتا ہے۔

غضب کا گانا ہے اور ناچ ہے قیامت کا
بلا فتنہ محشر کی آمد آمد ہے

امانت لکھنوی نے بہت سوچ سمجھ کر منظوم مکالموں اور گیتوں کو لکھا ہے۔ اندر سبھا سے ہی منظوم مکالموں اور ناچ گانوں کی جس روایت کا آغاز ہوا اس کے اثرات بہت گہرے ثابت ہوئے۔ اندر سبھا میں کل 556 اشعار کو شامل ہیں۔ قاری اس ڈرامے کو پڑھتے ہوئے محسوس کرتا ہے کہ اس میں مثنوی کا رنگ غالب ہے۔ اندر سبھا کی غزلوں کو پڑھ کر لکھنو کے موسموں، رنگوں خوشبوؤں اور ملبوسات وغیرہ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

میں جلو تن سے در و دیوار بسنتی
پوشاک جو پہنے ہے میرا یار بسنتی
منھ زرد دوپٹے کہ نہ انچل سے چھپاؤ
ہوجائے نہ رنگ گل رخسار بسنتی

**ڈراما اور نظم:**

اگر ڈرامے کے ابتدائی دور کی بات کریں تو ڈراما جہاں بھی رہا وہ شاعری کے ساتھ جڑا رہا ارسطو کے خیال میں ڈراما شاعری ہی کی ایک قسم ہے جس کے ذریعے سے اداکار اپنی اداکاری کا اظہار کرتے رہے۔ اٹھارویں صدی کے اختتام تک ڈراما منظوم شکل میں ہی لکھا جاتا رہا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں منظوم ڈرامے کی جگہ نثری ڈرامے نے لے لی تھی۔ منظوم ڈرامے کے حوالے سے پروفیسر اسلوب انصاری لکھتے ہیں:

> ”منظوم تمثیل نگاری کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ ایک مصنوعی صنف ہے کیوں کہ روزانہ زندگی میں کردار ستم کی زبان میں بات نہیں کرتے۔ نثری ڈرامے اس اعتبار سے نسبتاً قرین عقل اور قابل ترجیح ہیں۔ یہ اعتراض بہت سے غلط مفروضوں پر مبنی ہے۔ ڈراما یا ادب کی کوئی بھی صنف زندگی کی براہ راست نقل نہیں کرتی بلکہ اس کا ایک تحلیلی نقش ہے۔ اس نقش کو ابھارنے کے لیے مختلف وسائل سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ڈرامے کے آداب کے پیش نظر ان میں استعارہ، پیکر نگاری مکالمہ اور کرداروں میں حرکت اور عمل جذبات کا ترنم ہے۔“[۱۵]

## 2.9۔ اردو کی منظوم پہیلی میں آپ بیتی کی جھلک:

"پہیلی" ہماری تہذیب کی ایک اہم صنف رہی ہے۔ پہیلی کی ذریعے بچوں کی ذہنی تربیت مقصود رہی۔ جب بچوں کو پہیلی سنائی جاتی ہے اور ساتھ یہ کہ دیا جاتا ہے کہ اس کا مفہوم تلاش کر کے صحیح مفہوم بتائیں تو لازماً بچے اپنے ذہن کے پردوں کو ہٹا کر کچھ نیا سوچنے کا آغاز کرتے ہیں اور اس طرح یہ بچوں کے ذہنوں میں سوچنے کی صلاحیت کو جلا بخشتی ہے۔

پہیلی کو عربی زبان میں۔"لُغز" کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کلام سر بستہ کہنا۔ مولوی نجم الدین لاجوری اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

> "پہیلی اس جملے یا کلام کو کہتے ہیں جو ذو معنی ہو یا اس کے معانی کو الفاظ کی اوٹ میں قصداًاس غرض سے مخفی رکھا گیا ہو کہ مخاطب کی سوجھ بوجھ با آسانی نہ پا سکے۔ اس کی صورت استفہامیہ بھی ہو سکتی ہے۔"[۱۶]

ابو الا عجاز صدیقی اس بات کو مزید واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "پہیلی میں کسی چیز کی کچھ علامات یا خواص مذکور ہوتے ہیں اور قاری یا سامع سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان ارشادات کی مدد سے وہ چیز تلاش کریں۔"[۱۷]

اردو کی منظوم پہیلی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح دیگر کچھ اصناف سخن ہیں جن کا آغاز امیر خسرو نے کیا بالکل ایسے ہی اردو کی منظوم پہیلی کا موجد بھی امیر خسرو ہی ہے۔ کیوں کہ پہیلی کا شوق امیر خسرو کو بہت زیادہ تھا۔ امیر خسرو کے ترتیب شدہ فارسی دواوین میں بعض رباعیات پہیلیوں کی شکل میں ہی لکھی ہیں اور زیادہ تر ناموں اور تاریخوں کو بھی پہیلی میں لکھا گیا ہے۔

ے "بالا تھا تو سب کو بھایا　　　بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہ دیا اس کا نانو　　　ارتھ کرو نہیں چھاڑو گانو"[۱۸]

ان پہیلیوں کے دوسرے مصرعوں کو شاان الحق حقی نے تحقیق کر کے قاری کے لیے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ شان الحق حقی نے دوسرے مصرعوں میں ترتیب کو درست کیا ہے اور بڑھے تو کام نہ آئے۔۔۔ لکھا ہے اور کہا ہے کہ بعض لکھنے والوں کی سمجھ میں یہ بات آئی ہی نہیں ہے۔ ورنہ یہ،، بڑھے،، کی جگہ "بڑا" کسی بھی صورت نہ لکھے۔

امیر خسرو کے بعد اردو میں منظوم پہیلی لکھنے کا رواج دم توڑ چکا تھا، بعد میں مرزا محمد رفیع سودا نے اس کی طرف دوبارہ توجہ دی۔ اور شیخ چاند نے مرزا محمد رفیع سودا کے حوالے سے کہا ہے کہ ان کی ہاں ۱۰۹ پہیلیاں ملتی ہیں۔

شیخ چاند نے ان کے ہاں بندوق، سپر کمان، تیر، چاقو، قندیل، شمع گل گیر، مقراض سینگ، بانسری، ستار، مہر چھاپ وغیرہ کی نشاندہی کی ہے۔ان ساری چیزوں سے اس عہد کے حوالے سے جاننے میں مدد ملتی ہے۔

ے "ایک نار سب ناری ہیں پیاری　　آدھی گوری، آدھی کالی

دیکھو واہ کا الٹا ظہور　　گونگی آپ، بکاؤ یاور"[۱۹]

مرزا محمد رفیع سودا کے بعد پہیلی لکھنے کا رواج پھر سے عام ہو گیا اور پہیلی لکھنے والوں میں سعادت یار خان رنگین جو کہ دبستان لکھنو کے نمائندہ شاعر تھے۔انھوں نے پہیلی کی طرف توجہ دی۔ان کے بعد بہادر شاہ ظفر نے بھی اس میدان میں خود کو منوایا ہے۔ حکیم مومن خان مومن کا نام بھی پہیلی لکھنے والوں کی صف میں شامل ہے۔ان کی ایک پہیلی ملاحظہ کریں۔

"بنے کیوں کر سب کا راستہ

ہم الٹے، بات الٹی، یار الٹا"[۲۰]

منیر شکوہ آبادی منشی ذکا اللہ، تجمل رسول خان تجمل، صوفی تبسم، شان الحق حقی۔اردو کی پہیلیوں کے حوالے سے اہم نام جانے جاتے ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہیلی کی ابتدا قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ جیسی اصناف کے برعکس خاص علاقائی اثرات کے تحت ہوئی ہے۔اور دور دور تک انھی کے سائے میں پہیلی نے پرورش پائی ہے۔بعد میں پہیلی پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے اس صنف کی اہمیت میں کمی آئی مگر بچوں کے ادب میں پہیلی نے ہر دور میں اپنا خاص مقام رکھا۔برصغیر کی تقسیم کے بعد بچوں کے رسائل وجرائد میں پہیلیوں کے لیے خاص صفحات مختص کیے جاتے رہے۔ اور شان الحق حقی نے پہیلی کی صنف کو مزید بہتر بنانے کے لیے پوری طاقت کا استعمال کیا۔

### 10.2۔ منظوم داستانوں میں منظوم آپ بیتی کے نقوش:

منظوم داستانوں کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کے انسان کی ہے۔انسان کے ابتدائی مشاغل میں داستان سرِ فہرست رہی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان منظوم داستانوں کو اپنے ساتھ لے کر ہی اس دنیا میں جلوہ افروز ہوا

تھاتو کچھ غلط نہ ہو گا۔ دنیا کی اگر تمام قوموں کی بات کریں تو جو قومیں خود کو قدیم ترین تہذیب و ثقافت کا وارث سمجھتی ہیں ان میں بھی منظوم داستانوں کا رواج رہا ہے۔ اس حوالے سے مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

"یہ صنف بے ساختہ خود بہ خود وجود میں آئی ہے اور فن شاعری کی قدیم ترین منزلوں کی نمائندگی ور ہنمائی کرتی ہے۔"[۲۱]

انسان کی شعر و نغمہ سے ذاتی دلچسپی ہمیشہ سے رہی ہے۔ اس لیے انسان نے اپنے جذبات و خیالات کو شعری صنف میں قید کیا ہے۔ شاعری اصل میں انسان کی مادری زبان ہے جس کے ذریعے وہ اپنے جذبات کی پیشکش کرتا ہے۔ انسان نے شعری شکل میں اپنے قصے کو دوسروں تک پہنچانے کا فن آزمایا ہے۔ اس لیے اس کو آپ بیتی یا جگ بیتی کا نام دیا گیا ہے۔ جو منظوم داستان کی شکل میں ہے۔ یہ منظوم داستانیں اپنے موضوعات کے اعتبار سے مختلف حصوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ یہ منظوم داستانیں اپنے اندر عشق و محبت جنگ و جدل، سیر و شکار اور دیوتاؤں دیویوں کے قصے سے بھری پڑی ہیں۔ سامری تہذیب و ثقافت کا پتا تین سو ق م سے پہلے لگایا جا سکتا ہے۔ جبکہ وادی دجلہ و فرات کی تہذیب وادی نیل کے مقابلے میں ڈیڑھ ہزار سال سے بھی قدیم ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ تہذیبیں ان سے بھی قدیم ہیں جن میں سامری قابل ذکر ہے۔ اس زمانے میں سارگون ایک بادشاہ گزرا ہے جب وہ فوت ہوتا ہے تو اس کے کتبے پر منظوم صورت میں اس کی داستانِ زندگی ملتی ہے۔ جس میں درج تھا کہ میں ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں مجھے میرے والد کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میرے والد کے بھائی پہاڑوں میں رہتے تھے۔ میری والدہ میری پرورش نہ کر سکی تھی۔ اس لیے مجھے کسی ٹوکرے میں بند کر کے دریا کی نظر کر دیا گیا تھا لیکن الیشتری دیوی کی نظر مجھ پر پڑی اور میں حاکم وقت بن گیا تھا۔

یہ داستان خاصی ضخیم تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے سے بہت مماثلت رکھتی تھی۔ آج تک مختلف شہادتوں کی مدد سے ہمیں جو سراغ ملتا ہے وہ یہی ہے کہ یہ داستان پہلی منظوم داستان ہے۔ اس سے پہلے کی منظوم داستانوں کے ہمارے پاس کوئی نشان نہیں ملتے۔ اس کے بعد گل گامش جو ایک حکمران تھا اس کی داستان بھی منظوم صورت میں ملتی ہے۔

### 2.11۔ قدیم دکنی منظوم داستانیں:

چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں جب اسلامی فتوحات سے پہلے جنوبی علاقوں سے عرب ممالک کے مراسم قائم ہو چکے تھے۔ ابن بطوطہ کے سفر ناموں اور سید سلیمان ندوی کی کتاب عرب و ہند کے تعلقات سے واضح پتہ چلتا ہے کہ بر صغیر اور عرب کے درمیان تجارتی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ منظوم داستانوں کا رواج تو

بہت پہلے سے مروج تھا مگر عادل شاہی دور اور قطب شاہی دور میں ادب کو بہت فروغ نصیب ہوا۔ میر ان جی شمس العشاق، ملک خوشنود مصنف ہشت بہشت رستمی مصنف خاور نامہ، نصرتی، گلشن عشق ہاشمی، یوسف زلیخا یہ ساری مثنویاں عادل شاہی دور ہی سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ جب محمد قلی قطب شاہی دور کا آغاز ہوا تو محمد قلی قطب شاہ سمیت آٹھ حکمران گزرے انھوں نے بھی اردو ادب کی خوب خدمت کی اور اس دور میں لیلیٰ مجنوں، قطب مشتری، سیف الملوک وبدیع الجمال، پھول بن پیکر، بہرام گوہر اور رضوان شاہ اس عہد کی بہترین مثنویاں مانی جاتی ہیں جن میں کسی نہ کسی صورت میں داستان نظم کی گئی ہے۔

دکنی منظوم داستانوں میں مصنفین نے عشق و محبت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ کہیں کہیں مافوق الفطرت عناصر بھی ان کی داستانوں کی زینت بنے رہے ہیں۔ ان داستانوں میں ہیرو اکثر سر کی بازی لگا کر اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان منظوم داستانوں میں جنگ و جدل کو بھی موضوع بنایا گیا لیکن ان قصوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ عشقیہ اور رزمیہ دونوں نوعیت کے قصوں کو شعرا کرام نے مثنوی کی ہئیت میں ترتیب دیا ہے۔ کیوں کہ اکثر یہ قصے فارسی زبانوں کی تراجم تھے اور مسلسل واقعات کو نظم کرنے کے لیے اردو میں فارسی سے بہتر اور کوئی صنف سخن موجود نہیں تھی۔ اس عہد کی چند ایک منظوم آپ بیتیوں کی فہرست ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

**منظوم داستانیں اور ان کے مصنفین:**

| | |
|---|---|
| **چندر بدن و بہار** | **صنعتی** |
| **ہشت بہشت** | **ملک خوشنود** |
| **خاور نامہ** | **رسمتی** |
| **گلشن عشق** | **نصرتی** |
| **علی نامہ** | **قدرتی** |
| **قصص الانبیاء** | **قدرتی** |
| **یوسف زلیخا** | **ہاشمی** |

یہاں مثال کے طور پر میر حسن کی مثنوی بے نظیر اور بدر منیر کا قصہ منظوم شکل میں لکھا ہے۔ اس قصے کو پڑھنے کے بعد قاری اس بات کا اندازہ لگا تا ہے کہ اس میں میر حسن نے بوستان خیال سے ضرور استعفادہ کیا ہے۔ بوستانِ خیال میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی مثنوی میں ہوتی ہیں۔

**باغ کی سیر:**

"ہر اک سمت پانی کی لہروں کی سیر
وہ نہروں میں پانی کی لہروں کی سیر
رواں آب کے ہر طرف آبشار
جدھر دیکھیے آ رہی تھی بہار
ہر اک حوص پانی سے لبریز تھا
ہر اک قطعہ باغ گل خیز تھا
منظوم ڈرامے میں آپ بیتی کی جھلک"

اگر ڈرامے کے ابتدائی دور کی بات کی جائے تو ڈرامے کا ابتدائی دور منظوم ہی ملتا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں ڈرامے کا آغاز منظوم شکل میں ہوا ہے۔ مغرب میں نثری ڈراما نگاری کے حوالے سے ابسن وہ پہلا قلم کار ہے جس نے اس میدان میں اپنے جوہر دکھائے مگر اس کے بعد ایلیٹ نے منظوم ڈرامے لکھ کر آنے والے لکھاریوں کو نئی راہ سے آشنا کروایا۔ اگر قدیم ہندوستان کی بات کریں تو یہاں سنسکرت میں منظوم ڈرامے لکھنے کا رواج تھا۔ مگر باقاعدہ طور پر سنسکرت میں بھی ڈرامے نہیں لکھے جارہے تھے مگر اس دور میں اردو کے کچھ قلم کار ریڈیو کے لیے خالص ادبی قسم کے ڈرامے منظوم شکل میں ہی لکھتے تھے۔ آج بھی کچھ قدیم ڈرامے کی کچھ خاص اقسام مثلاًرام لیلا، نوٹنکی، وغیرہ جو لوگوں میں مقبول ہیں، منظوم شکل میں ہی ملتے ہیں۔ نثری ڈراما منظوم ڈرامے سے زیادہ مقبول ہے مگر منظوم ڈراما بھی وقت کی ضرورت رہا ہے بہت سے محققوں اور نقادوں نے منظوم ڈرامے کے حوالے سے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر اسلوب انصاری ڈرامے میں نظم کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

> "ڈرامے کا مقصد ڈرامہ نگار ایک فریب نظر پیدا کرتا ہے۔ اور زندگی کے منتشر، بے ربط اور غیر آہنگ شیرازہ پر ایک نظم و ترتیب کے عائد کرنے سے۔ یہ ترتیب سادہ واقعات کو ہمہ گیر اور رچی ہوئی صداقت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ شعر کے ذریعے اظہاریت(Expressive) کی طرف ایک قدم اور بڑھ جاتا ہے جو تمثیل نگار کا مقصد ہے۔ یعنی احساس شدید تر ہو جاتا

ہے۔ فنی صداقت واقعاتی صداقت پر ایک اضافہ ہوتی ہے یہ افسانہ اس کی معنی خیزی میں پوشیدہ ہے۔"[۲۲]

ایلیٹ منظوم ڈرامے کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہتا ہے:

"میرا خیال ہے کہ سامعین پر شعر کا غیر ضروری شعوری اثر اس کے تاثر کا ایک بہت ضروری حصہ ہے اور اس کے استعمال کا بہترین جواز بھی۔"[۲۳]

کولرج نظم کے فرق کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"Prose words in their best order: poetry the best words in their best order"[۲۴]

محققین کی رائے ہے کہ نثر کے مقابلے میں شاعری کی زبان سے جو بات کہی جائے وہ زیادہ اثر رکھتی ہے۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب کہتے ہیں۔

"اگر کہیں کہ دنیا کے واقعات دنیا کے ساتھ ساتھ یہیں تو جو کچھ آج ہو رہا ہے وہ پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہے تو اس کلام سے دل پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔ لیکن اگر اس بات کو نظم کی شکل میں بیان کریں تو یعنی،،[۲۵]

دل کے ساتھ ہیں دنیا کے واقعات
جو آج ہو رہا ہے، وہی بار بار ہوا
تو یہ ایک خاص طرح کا اثر ہوتا ہے

نظم کی ایک اور خوبی جو اس کو نثر سے ممیز کرتی ہے وہ اس کی دلنشینی ہے۔ نثر کے مقابلے میں نظم جلدی دل و دماغ میں اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ نثر کے مقابلے میں نظم میں لہجے کا اتار چڑھاؤ زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

**رہس اور رادھا کنھیا کا قصہ:**

اردو ڈرامے کے ابتدائی نشانات حقیقت میں انیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں نظر آتے ہیں، ان ابتدائی نقوش میں رقص، موسیقی اور ڈرامائی روایت بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ اودھ سلطنت کے دور میں رقص و موسیقی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی کیونکہ وہاں کے بادشاہوں کا مزاج ان چیزوں کا طلب گار تھا۔ رہس اور رادھا کنھیا اسی دور کی پیداوار ہے۔ اس لیے ان ڈراموں میں منظوم قصے ملتے ہیں۔

ماسٹر احمد حسن وافر نے ایک ڈراما ،، بلبل بیمار ،، تخلیق کیا ہے۔ اس ڈرامے میں پہلی بار نظم کے ساتھ ساتھ مکالموں میں سادہ اور عمدہ نثر کو بھی شامل کیا گیا۔ منظوم ڈراموں کی ایک مختصر سی فہرست کا اگر تذکرہ

کریں تو یہ تمام ڈرامے اپنی مثال آپ ہیں۔ ان منظوم ڈراموں میں رستم وسہراب، بے نظیر بدر منیر اوراندر سبھا اتنے مشہور ہوئے کہ اس دور میں جو نئی کمپنی متعارف ہوتی وہ منظوم ڈراموں کو اپنی کمپنی کے ذریعے ضرور دکھاتی۔ اس دور کے بہترین ڈراموں میں بہار پرستان، بادشاہ خاں دوست، بلبل بیمار، بزم سلیمان، زہرا پری، جلسہِ گلنار، حسن آرا، خداداد، خونِ ناحق، خدابخش، نواب عبرت، دلِ فروش، راحت عشق شکستہ دل، علی باباوغیرہ شامل ہیں۔

ان ڈراموں سے اس بات کا اندازہ لگانا خاصا مشکل ہے کہ یہ ڈرامہ کس کمپنی کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جو ڈرامے سامنے آتے ہیں۔ ان پر مغربی ڈراموں کے اثرات نظر نہیں آتے۔ مختلف تھیٹر کمپنیاں اندر سبھا کو بھی دکھائی تھیں اور اس دور کے دوسرے ڈرامے جو مشہور تھے وہ اند سبھا کی روایت کے پابند تھے۔ یعنی ان ڈراموں کے مکالمے منظوم تھے اور کچھ دیر بعد گانے پیش کیے جاتے تھے اور رقص بھی ہوتا تھا اس کی عمدہ مثال نسروان جی کے بعض ڈرامے پیش کیے جاتے تھے۔

**ب۔ ہیئت واسلوب کے بنیادی مباحث:**

**ہیئت:**

ہیئت تنقیدی اصطلاح ہے جس کا مطلب صورت، شکل، ساخت، پیکر وغیرہ ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے Form کا لفظ مستعمل ہے۔ ہیئت حادثات وواردات کی اس وضع کا نام ہے جو لفظوں کے ذریعے سے پڑھنے یا سننے والے کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

**White Head کے خیال میں:**

> ”ہر تجربہ مختلف ساخت رکھتا ہے، ہیئت فنکار اور سامع کے درمیان تفہیم کا ایک مقامی، سماجی، اور ثقافتی رابطہ ہے، ہر مواد اپنے لیے مخصوص پیرہن کا متقاضی ہوتا ہے چنانچہ رزمیہ، بزمیہ، فلسفہ وتصوف کے لیے مختلف ہیئتیں موزوں ہیں“[۲۶]

**لفظ ہیئت لغوی معنی ومفہوم:**

ہیئت عربی زبان کا لفظ ہے المنجد کے مطابق اس کے معنی کچھ یوں بتائے گے ہیں:

> ”چیز کی حالت، کیفیت، شکل وصورت“[۲۶]

سید احمد دہلوی ہیئت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”ہیَاَت یہ لفظ اسم مونث ہے جس کا مطلب بنا یا جانا، تیار ہونا وغیرہ ہے۔ایک شکل، صورت، چہرہ، مہرہ، ڈول، ساخت، بناوٹ، دھج“[۲۸]

ہیئت ایک علم کا نام ہے۔ جس میں مختلف چیزوں کو اشکال کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ جس میں اجرام فلکی اور زمین کی گردش وکشش وغیرہ شامل ہیں۔ سید احمد دہلوی کے معانی سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لفظ ”ہیئت“ نے کچھ علوم میں ایک خاص درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اس بحث کے بعد جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی ظاہری حالت و کیفیت ہئیت کہلاتی ہے۔ علم فلسفہ میں لفظ ہیئت بہت اہمیت کا حامل ہے۔

افلاطون ارسطو کے ہاں نقالی (limitation) کے نظریے میں اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ ادب کی اصطلاح میں ہئیت سے مراد کسی بھی فن پارے کی وہ ظاہری صورت ہے جو کسی چیز کی انفرادیت کا تعین کرتی ہے۔ حفیظ جالندھری کے خیال میں:

”ہم جانتے ہیں کہ مثنوی، غزل، قطعہ، رباعی، مسدس، مخمس، سانیٹ، پابند نظم اور نظم آزاد اپنے خارجی پیکر کے ذریعے ایک دوسرے سے ممیز ہوتی ہیں اور نظم کا یہ خارجی پیکر وزن کی نوعیت، ردیف و قافیہ کے نظام مصرعوں کے طول کی یکسانیت یا عدم یکسانیت جیسے امور سے معین ہوتا ہے۔ اسی خارجی پیکر یا خارجی صورت کو Form کہتے ہیں“[۲۹]

اگر ہم ہیئت کے ہم پلہ یا مترادف الفاظ کی بات کریں تو سانچہ، صورت، شکل، خاکہ، پیکر، ساخت، بناوٹ، مماثلت، بنت وغیرہ جیسے الفاظ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عنوان چستی کے مطابق لفظ ہئیت ان تمام الفاظ سے زیادہ جامع اور اثر رکھنے والا لفظ ہے۔ شمیم احمد کے مطابق:

”کوئی بھی شعری ہیئت ایک مخصوص طرز اظہار ہے جس کی اپنی ایک قابل شناخت شکل ہوتی ہے جو کسی مخصوص نظام کے تحت تشکیل پاتی ہے“[۳۰]

ہئیت کے حوالے سے فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات میں درج ذیل معنی ہیں۔

۱۔ صورت، شکل، مہرہ، چہرہ، وغیرہ۔

۲۔ ساخت، ڈول، بناوٹ، دھج۔

۳۔ ڈھنگ، کیفیت، طور، طریقہ، حال، حالت۔

ہئیت کے حوالے سے بیسویں صدی کے آغاز میں روسی ہئیت پسندی کی تحریک کا آغاز ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس ہئیت پسندی کے اثرت بیسویں صدی کے تنقیدی نظریات پر واضح دکھائی دیتے ہیں۔ شروع شروع میں روسی ہئیت پسندوں کی تحریروں کا چرچہ عام نہیں تھا مگر جوں جوں روسی ہئیت پسندوں کے تراجم انگریزی اور فرانسیسی زبان میں ہوتے تو پوری دنیا توجہ ان پر مرکوز ہو گئی ہے۔ اس تحریک کو شہرت اور بھی زیادہ اس وقت ملی جب وکٹر الرلح کی تکاب Histroy Doctrine Russian Formalism نظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں چار مقالات ہیں جنھوں نے پڑھنے والوں کو روسی ہئیت پسندی کو سمجھنے میں مدد دی۔

جب تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی کی جاتی ہے تو تب معلوم ہوتا ہے کہ روسی ہئیت پسندی کا آغاز 1960ء میں انقلاب روس کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ روسی ہئیت پسندی کی اس تحریک نے فیوچرزم کی تحریک سے بھی اثر قبول کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس تحریک نے ماسکو لنگواسٹک سرکل سے بھی اثر قبول کیا تھا۔ روسی ہئیت پسندوں کا بنیادی مقصد ہی ادب کی ادبیت تلاش کرنا تھا۔ وہ ادبی فن پارے کے بارے میں کہ وہ کیا ہے، کے بجائے وہ کیسے ہے، کو اہمیت دیتے۔ ہئیت پسندوں کی اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے گوپی چند نارنگ بیان کرتے ہیں کہ:

> ”ان کا خیال تھا کہ ادب میں پائے جانے والے جذبات، تصورات تخیل، موضوع کوئی بھی چیز فی نفسہ ادبیت کی حاصل نہیں بلکہ یہ سب چیزیں ادبی پیرایوں کے بروئے کار آنے کا تناظر فراہم کرتی ہیں۔ روسی ہئیت پسندوں کا نظریاتی سفر ایسے ادبی ماڈلز، اصولوں اور ضابطوں کی تلاش میں تھا، جسے معروضی اور سائنسی طور پر ثابت کیا جاسکے ادبی پیرایوں سے جمالیاتی اثر کس طرح پیدا ہوتا ہے یا ادبی یا غیر ادبی کا فرق کس طرح قائم کیا جاسکتا ہے۔“[۳۱]

تنقید ایک اچھا عمل ہے اس سے تنقید کی جانے والی چیزوں میں نکھار آتا ہے۔ ایلٹ نے کہا ہے کہ تنقید کی دوسری حد یہ سوال ہے کہ یہ شعر کیسا ہے؟ یہ نظم کیسی ہے؟ میں نے بھی اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اردو کی تین منظوم آپ بیتیوں کی ہئیت معلوم کرنے کی کوشش کی ہے جس سے پتہ چلا کہ ان میں دو آپ بیتیاں یعنی کہ ”آدھی صدی کے بعد“ اور ”غم زمانہ بھی سہل گزرا“ آزاد نظم کی صورت میں لکھی گئی ہیں جبکہ ”آئینہ در آئینہ“ مثنوی کی ہئیت میں ترتیب دی گئی ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ لفظ کے معنی بدل کر ایک

نیا مضمون ترتیب دے لیتا ہے۔ کیونکہ لفظ جامد نہیں ہوتے سیال ہوتے ہیں۔ اس لیے نثر میں سیدھے سادھے الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ جب کہ شاعری میں لفظوں کی چاشنی ہوتی ہے۔

کولرج کے خیال میں:

> ''کولرج نے کہا ہے کہ نثر میں اچھے لفظوں کی اچھی ترتیب ہوتی ہے جب کہ شعر میں بہترین لفظوں کی بہترین ترتیب ہوتی ہے۔''[۳۲]

اس تحقیقی مقالے میں بھی منظوم آپ بیتیوں میں واقعات کو بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جب وزیر آغا کی نثری آپ بیتی ''شام کی منڈیر سے'' کا مطالعہ کریں تو وہ مزہ نہیں ہے جو منظوم آپ بیتی میں درج ہیں اس آپ بیتی کی ہئیت آزاد نظم کی ہے جس میں خیالات کو مسلسل اشعار کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔

روسی ہئیت پسندوں نے ادبی فن پارے کے متن کو اہمیت دینے کے بجائے اس فن پارے کی ہئیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ روسی ہئیت پسندوں کے نزدیک جب نقاد ہئیت کے تجربے کو شعار بناتا ہے تو متن کی تخلیق اور اس کے عقب میں کارفرما عوامل کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔ 1916ء روس کے ایک شہر پیٹرو گراڈ میں انجمن برائے مطالعہ شعری زبان کا انعقاد کیا۔ اس انجمن کا مقصد ادبی متن کے باطنی نظام کی ساخت کے تجزیے پر ہی مرکوز تھا۔ روسی ہئیت پسندوں کے متن سے توجہ ہٹا کر ہئیت پر توجہ دینی شروع کی تھی۔ روسی ہئیت پسندوں نے ادب کی ادبیت کا بھی خاص خیال رکھا تا کہ کوئی بھی ادبی فن پارہ بوگس تصور نہ کیا جائے۔

محمد راؤف اس تناظر میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''دراصل اس بحث کے تناظر میں ہمیں شاعری کی ماہئیت اور منصب پر نظر رکھنی چاہیے کیونکہ اس متازعہ موضوع کے انوکھے سے تصورات کی رنگارنگ ڈالیا نکلتی اور برگ و بار لاتی ہیں۔ مثلاً مارکسیوں کے نزدیک منصبِ ادب یہ ہے کہ یہ بورژوا اور پردستاری کشمکش کو عیاں کرے۔ نفسیاتی دبستانِ فکر کے مطابق شعر و شاعری جذباتی ناسودگی میں بدلتی ہے جب کہ جمالیاتِ مکتب فکر کے لوگ حسن کے ادراک اور تنظیم کے احساس کا ایک ذریعہ گردانتے ہیں۔ روسی ہئیت پسند ادب بارے سے ادبیت کے متلاشی ہیں۔''[۳۳]

اردو کی تینوں منظوم آپ بیتیوں میں بھی اس طریقہ کار کو برتا گیا ہے اور واقعات کو استعارات کی مدد سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان تینوں آپ بیتیوں میں ادبیت کے عناصر واضح نظر آتے ہیں۔ فلسفہ کی تاریخ میں ہئیت کا تصور بہت قدیم ہے اور مختلف زبانوں میں مختلف انداز میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ یہ تصور تاریخ کی ان کتب میں واضح نظر آتا ہے جن کتب میں کائنات کی تخلیق کے تذکرے درج ہیں۔ ان تذکروں میں کہا گیا ہے خدا نے کائنات کی تخلیق کس ہئیت میں کی ہے۔ ان کتابوں میں وجود پزیر ہونے سے پہلے تخلیق کے خیال یا اس کے پیکر کو ہئیتی اصول کہا گیا ہے۔ جہاں مختلف مفکرین نے ہئیت کے حوالے سے اپنے اپنے نظریات پیش کیے وہاں ارسطو جیسا فلسفی کہتا ہے کہ ہئیت کے معنی محض صورت نہیں بلکہ اس میں وہ قوت بھی شامل ہے جو کسی مادہ کو کوئی شکل عطا کرتی ہے۔ اس طرح ارسطو کے نظامِ فکر میں ہئیت کے تصور میں محض ساخت ہی شامل نہیں بلکہ اصول ساخت بھی شامل ہیں۔ اگر اردو کی تینوں منظوم آپ بیتیوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تینوں منظوم آپ بیتیوں میں ان کی ساخت کے ساتھ ساتھ تینوں منظوم آپ بیتیوں کے اصول ساخت بھی شامل ہیں۔ کسی بھی فن پارے کو تخلیق کرنے کے لیے مواد کا ہونا بہت لازم ہوتا ہے تب ہی جا کر کسی چیز کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری الفاظ کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے رقم طراز ہیں کہ:

> ”کسی بھی نظم کی تعمیر الفاظ کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ الفاظ لکڑی یا ربڑ کی طرح ہوتے ہیں۔ صناع لکڑی یا ربڑ سے گول شکل کی گیند بنائی تھی شاعر نے الفاظ کو ترتیب دے کر نظم کا ہیولیٰ تیار کیا۔“[۳۴]

انگریزی ادبیات میں ہیئت کے لیے جو مناسب لفظ ہے وہ Form کا ہی سامنے آتا ہے۔ انگریزی ادب میں Form کا لفظ ہیئت کے لیے بھی مستعمل ہے اور صنف کے لیے بھی یہی لفظ قابل قبول ہے۔ مغرب میں اس لفظ کو دوہری منعویت حاصل ہے۔ مفہوم کے حوالے سے اگر ان لفظوں پر غور کریں تو یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں۔ چونکہ صنف کا تعلق کسی بھی فن پارے اور موضوع اور مواد سے ہوتا ہے جبکہ ہئیت اس مواد کو ترتیب دینے کے بعد کی شکل کو ظاہر کرتا ہے۔ ہئیت ایک ڈھانچہ ہے جو کسی بھی چیز کا براہ راست اظہار ہے۔ ہئیت کی بنا پر ہی ہم کسی چیز کی جڑوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ مثلاً ہم جب غزل، یا نظم کی بحث میں پڑتے ہیں تو سب سے پہلے ان کے لوازمات کو دیکھتے ہیں کہ وہ پورے ہیں کہ نہیں۔ جیسے غزل میں مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف کو دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ غزل ہے۔ شمیم احمد غزل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ

ایک ہیئتی صنف ہے۔ اسی طرح مثنوی، قطعہ، رباعی، بند، نظم، حمد، نعت، ہجو گوئی، مرثیہ، قصیدہ وغیرہ یہ سب اصناف سخن نہیں بلکہ شعری ہیئتیں ہیں۔ یہ شعری ہیئتیں اپنا موضوعاتی دائرہ رکھتی ہیں اور موضوعاتی دائرے کو ہی اپنی شناخت کا ذریعہ بناتی ہیں۔

ہئیت کے لیے خیال (مواد) بنیادی اکائی ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار یا فن کار ہے تو اس کے ذہن میں جب خیالات کا دریا امڈ تا ہے تو اس کے اظہار کے لیے وہ بے قرار ہو جاتا ہے۔ چونکہ خیال کا تعلق انسانی ذہن تک ہی ہے اور جب اس خیال کو کسی خارجی پیکر کے ساتھ جوڑا جاتا ہے تو تب وہ کسی نئے سانچے میں ڈھل کر اپنی شناخت کروا سکتا ہے۔ اگر ایک جسم ہے مگر اس میں روح نہیں ہے تو وہ جسم اپنا اظہار نہیں کر سکتا۔ جسم کے لیے روح اور روح کے لیے جسم لازم وملزوم ہیں۔ بالکل اسی طرح خیال اور اس کا موثر اظہار جو خارجی شکل میں کیا جاتا ہے ضروری ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فن کار جب کسی بھی چیز کا اظہار خارجی پیکر کے ساتھ کرتا ہے تو اس کے دفاغ میں کوئی نہ کوئی ہیئت پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ یہ کہنا بھی درست ہے کہ ہر تخلیقی تجربہ اپنے ساتھ ہیئت بھی لے کر ظہور پزیر ہوتا ہے۔ چینی شاعر لیوچی کے خیال میں (شاعر ایک شکاری ہے جو آسمان اور زمین کو ہئیتوں کے قفس میں پابند کرتا ہے۔ جو قاری کو پریشان کرتا ہے وہ یہ ہے کہ فن کی تخلیق میں خیال زیادہ اہم ہے یا ہئیت۔ اس سوال کا جواب مختلف محققین نے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ان کو خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔ اس حوالے سے دو مکتبہ فکر کے لوگ ہمارے سامنے آتے ہیں ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ہئیت تکنیک اور دیگر عناصر فن کا مجموعہ ہیں جبکہ دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ خیال سے زیادہ ہئیت موثر ہے۔ دونوں گرہوں نے حتی المقدور کوشش کی اور اپنے اپنے دلائل بھی پیش کیے لیکن مکمل کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کی بنیادی وجہ جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ادب میں کسی بھی نتیجے یا نظریہ کو حتمی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جابر علی سید مواد اور ہیئت کے حولے سے لکھتے ہیں:

> "مواد، ہیئت اور تکنیک کا امتیاز واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مواد نفس مضمون، تکنیک مخصوص عمل اور ہئیت اس عمل کا خارجی اور قطعی نتیجہ ہے۔ تکنیک اور ہیئت میں ذریعے اور مقصد کا تعلق ہے۔ شعر کی ہئیت نتیجہ ہے اس تکنیک کی جو عبارت ہے۔ آہنگ عروضی اور قافیہ ردیف ہے۔ عربی عروض کے اعتبار سے جب عربی میں ردیف نہیں تھی اور نہ لسانی سبب سے

اس کی کوئی صورت بن سکتی تھی۔ ردیف فارسی اور اردو شعرا کی ایجاد ہے"[۳۵]

ہئیت بھی ماحول کی پیداوار ہے۔ جس طرح کا ماحول ہو گا فن کار اسی طرح کی کسی بھی فن پارے کی ہئیت تشکیل دے گا۔ کسی بھی صنف کی ہئیت کو تشکیل دینے کے لیے فن کار کو بڑے احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ جس عہد میں کسی نئی ہئیت کو متعارف کرایا جاتا ہے اس دور میں اس ہئیت کے خلاف بات کرنے والا گروہ بھی موجود ہوتا ہے۔ تنقید ہر کسی کا بنیادی حق ہے مگر اکثر ایسا دیکھنے کو آیا ہے کہ لوگ بغیر کسی وجہ کے نئی تخلیق کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ رویہ بالکل مستحسن نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ابتداء میں کسی بھی فنکار کو کسی بھی ہئیت کو متعارف کرانے میں بہت سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر وہ وقت گزرنے کے ساتھ اپنے دلائل دے کر اپنی ہیئتی تشکیل کو سچ ثابت کر ہی لیتا ہے۔ نئے ہیئتی تجربے کو وقت ہی مقبول یا رد کرتا ہے۔ اطہر پرویز کے بقول:

"وہ لوگ جو مردہ ہیئتوں سے چمٹے رہتے ہیں۔ وہ اپنی ہئیت پرستی میں بھول جاتے ہیں کہ فرسودہ ہیئتیں اپنا تاریخی فریضہ پورا کر چکی ہیں اور ان کی جگہ نئی ہیئتیں لے رہی ہیں اب ان کا استقبال کرنا بہت ضروری ہے۔ ہر چند پر منزل کڑی ہوتی ہے لیکن طرز کہن پڑاڑے رہنے سے منزل کے اوجھل ہونے کا خطرہ ہے"[۳۶]

### 1۔ ہیئتی تنقید:

ہیئت عربی اصطلاح میں دو معنوں میں مستعمل ہے۔ ایک طرف کسی بھی فن پارے کی ظاہری صورت و شکل میں مستعمل ہے مثلاً اگر غزل کی بات کریں تو غزل کا ہر شعر دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ شاعر ان دو مصرعوں میں اپنی بات کو بڑے خوبصورت انداز میں مکمل کرنے کا فن رکھتا ہے۔

دوسری طرف اگر ہیئت کی بات کریں تو ہئیت سے مراد کسی بھی صنف کی داخلی ترتیب ہے جو مختلف اجزا کے درمیان توازن و تناسب کو قائم کرتی ہے۔ آسکر وائلڈ اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتا ہے۔

"Form is a Myth, it is a secret of life start with the worship of art that will not be revealed to you[۳۷]

آسکر وائلڈ کے خیالات کی تفہیم کے بعد قاری کے ذہن میں جو بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہئیت کا مفہوم صرف اصناف کی ظاہری صورت یا ڈھانچے تک ہی محدود نہیں رہ جاتا بلکہ ہیئت وسیع تر معنویت اختیار کرلیتا ہے۔ اس کا وزن، بحر الفاظ کا انتخاب ہی نہیں بلکہ کسی بھی فن پارے کی ظاہری شکل وصورت کے تمام رشتے اور آہنگ ہیت کے دائرے میں ہی رہتے ہیں۔ ایک طرف ہیئت کے وہ تمام پوشیدہ رشتے ہیں جو صرف تصور سے قائم ہوتے ہیں۔ اور دوسری بات جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ کسی بھی فن پارے کی ظاہری شکل ہے جس کے مختلف حصوں کو آپس میں مربوط کرتے ہیں۔ یہاں جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ شاعری صرف تصورات وخیالات کی ترسیل ہی نہیں ہے بلکہ موسیقی اور مصوری سے بھی ملتی جلتی شکل اختیار کرلیتی ہے تو پھر ہئیت کا جو مسئلہ سامنے آتا ہے وہ تکنیک اور فن کارانہ ہنر مندی کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

ہیئت پرست تنقید نگاروں کا دعویٰ ہے کہ قدیم تنقید کے پانچ اہم مراکز میں چین، بھارت، یونان، روم اور مغربی ایشیا شامل ہیں۔ یہ دعویٰ سو فیصد سچ نہیں ہے مگر جزوی صداقت ہے۔ اس بات سے انکار ناممکن ہے کہ جب کبھی سماجی نظام مضبوط ہوتا ہے تو اس کی اقدار کی مقبولیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اور پھر ہیئت پرستی کا میدان بھی غلبہ حاصل کرلیتا ہے۔ دم ساٹ اور کلینتھ بروکس کے مطابق:

> “I do not mean by beauty or from such beauty as that of animal; or picture ... but straight line and circles and the plane or solid figures, which or formed out of them by turning lather andrules and measure of angles for these i affirm to be not only relatively beautiful , like eternally and absolutely beautiful[۳۸]”

ہئیت پرستی میں قدیم دور کے بعد دو اہم موڑ آتے ہیں۔ ایک موڑ فن برائے فن کا موڑ ہے۔ جبکہ دوسرا موڑ نئی تنقید کی تحریک کے زیر اثر ہے۔ ان دونوں ادوار میں ہئیت پرستی میں بڑی اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ فن برائے فن کا دور جمالیاتی احساس کو دہرے تقاضوں سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس دور کے آخر میں فارم یا ہئیت کو ایک پر اسرار اور نیم متصوفانہ تصور کا غلبہ حاصل ہونے لگا۔ ابتدا میں ہیئت کو صناعی اور کاریگری کے معنوں میں استعمال کیا گیا۔ کلائیو بیل اپنی کتاب،، آرٹ،، میں ہئیت کے حوالے سے رقمطراز ہے:

"What quality is shared by all object emotions? What quality is common to sta; so phia and the windos at charters maxican sculpture bowl, chinese carpets, Gioeto's trescoes at padua and the master pieces of lossiu pieero delia Francessea and cezaune? Only one answer seems possiole - significant from in each line and colors combines in a purtieaiar why, certain forms and reations of forms stir our easthetic emotions"[۳۹]

اس اقتباس سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ظاہری شکل اور ہیئت میں مختلف اجزا کے باہمی آہنگ کو توازن قرار دیا ہے اور یہ توازن کسی دوسرے توازن کا عکس نہیں ہوتا بلکہ کسی بھی فن پارے کی اندرونی ترتیب سے جڑا ہوا ہے۔

شعری ہیئتوں کی اگر شناخت کرنا مقصود ہو تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ کیوں کہ ان شعری ہیئتوں کی شناخت ظاہری صورت سے متعلق ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات صنف سخن کی شناخت میں کبھی کبھار دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ بعض اوقات بعض اصناف کی شناخت ہیئت کے اصولوں پر منحصر ہوتی ہے اور بعض موضوع سے ان اصناف کی ہیت کی شناخت ہو جاتی ہے۔ ہیئت ایک بہت وسیع موضوع ہے جس کی حدود و قیود متعین کرنا ناممکن ہے۔ ہیئت اپنے اصطلاحی مفہوم کے حوالے سے ایک ایسا سانچا ہے جسے کوئی بھی ادیب اپنے خیالات کو قاری تک پہنچانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ حفیظ صدیقی ہیئت کی تعریف کچھ یوں کرتا ہے:

"کسی نظم کا وہ خارجی پیکر جو نظام قوافی، مصرعوں یا بندوں کی تعداد، مصرعوں کے طول کی یکسانیت یا عدم یکسانیت، کسی مصرعے یا شعر کی تکرار اور کسی وزن خاص کی شرط وغیرہ سے معین ہے"[۴۰]

ہیئت کے حوالے ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی یوں رقم طراز ہیں:

"ہیئت سے مراد وہ سب ذائع ہیں جن سے مصنف کے جذبات یا جذبیلے افکار قارئین تک پہنچائے جاتے ہیں"[۴۱]

ابلاغ کے لیے کسی بھی ہیئت کا ہونا ضروری ہے۔ اظہار کے لیے کسی سانچے کے طور پر صنفِ ادب کا انتخاب اس کے لیے بہتر الفاظ کا چناؤ کیا جاتا ہے۔ ہمارے ذہن میں جو خیالات گھر کرتے ہیں ان خیالات سے لے کر ان کے اظہار تک جو مجسم صورت ہوتی ہے اس کو Form کہتے ہیں۔ اصل میں یہ سارا عمل ایک جذباتی تحریک ہے جو کسی فن کار کو لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور جب بھی کوئی فنکار کچھ لکھتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی ہیَیت ہوتی ہے۔ اسی ہیئت سے پھر اس کی پہچان ہوتی ہے کہ اس کی ظاہری شکل و صورت کیا ہے۔ ہیئت دراصل قاری اور ادیب کے درمیان مضبوط رشتہ استوار کرنے کا نام ہے۔ اس میں زبان، اسلوب، زبان کی آرائش، الفاظ کی اثر اندازی، مواد ان سب چیزوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا، ایک مکمل فنی نمونہ پیش کرنا سبھی کچھ ہیئت کے زمرے میں آتا ہے۔ ہیت کی کوئی جامع تعریف نہیں ملتی مگر ہیت کے لیے مواد بہت قوی حیثیت رکھتا ہے۔ جب کسی بھی ادیب کے ذہن میں کوئی خیال جنم لیتا ہے تو وہ ادیب اس کا اظہار خارجی پیکر کے ذریعے کرتا ہے۔ خیال ایک داخلی جذبہ ہے جو اس وقت تک بے معنی تصور کیا جاتا ہے جب تک اس کا خارجی پیکر کے ذریعے اظہار نہ کیا جائے۔ جس طرح روح جسم کے بغیر اپنی کوئی حثیت نہیں رکھتی بالکل ایسے ہی خیال کو جب تک ہیئت کا لبادہ نہیں اوڑھائیں گے تب تک خیال کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

ہیئت کے اثرات تمدنی زندگی پر بھی پڑتے ہیں۔ ہم تہذیب کا آئینہ دیکھتے ہیں تو وہاں ہمیں ہیئت کا عکس نظر آتا ہے۔ ہیئت نہ صرف خیال کے اظہار کا ذریعہ ہے بلکہ جس عہد میں خیالات فنکار کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں وہ خیالات اس عہد کی تشخیص کا ذریعے بھی بنتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر تہذیب و تمدن میں کہیں تبدیلی ہوتی ہے تو وہاں ہیئتوں کا اثر کم ہوتا ہوا دکھائی دے گا۔

## 2۔ اردو میں شعری ہیئتیں:

### I۔ مثنوی:

مثنوی ہیئت کے لحاظ سے صنف شاعری ہے۔ مثنوی پابند نظم کی شکل میں ہوتی ہے جس کا ہر شعر مطلع ہوتا ہے کہ جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ مثنوی میں رزمیہ اور بزمیہ دونوں طرح کے مضمون قلم بند کیے جاسکتے ہیں۔ مگر دونوں کی بحور میں فرق ضرور ہو گا۔ مولانا روم کی مثنوی معنوی، میر حسین کی سحر البیان اور شنکر نسیم کی گلزارِ نسیم اہم مثنویاں ہیں۔

### ii۔ مخمس

مخمس عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب پانچ ہے۔ مخمس بھی ہیئت کے لحاظ سے شاعری کی ایک قسم ہے۔ اس کو پنج پہلو کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں جبکہ پانچواں مصرعہ پہلے چاروں مصرعوں سے مختلف ہوتا ہے۔

### iii۔ مثمن

مثمن بھی ہیئت کے اعتبار سے شاعری کی ایک قسم ہے جس میں مصرعوں کی تعداد آٹھ ہوتی ہے۔ پہلے چھ مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جبکہ آخری دو مصرعے مختلف قافیہ و ردیف کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ آٹھ آٹھ مصرعوں پر مشتمل ٹکڑے ہوتے ہیں۔

### iv۔ مسدس

ہیئت کے حوالے سے یہ بھی شاعری کی ایک قسم ہے۔ اس میں مصرعوں کی تعداد چھ ہوتی ہے۔پہلے چاروں مصرعے ایک جیسے قافیہ کے ساتھ لکھے گئے ہوتے ہیں پھر ایک مطلع پہلے چاروں مصرعوں سے مختلف ہوتا ہے جسے ٹیپ کس شعر کہتے ہیں۔ مسدس میں خوشی، غم، مسرت، جوش وولولہ ہر طرح کے مضمون بیان کیے جاسکتے ہیں۔

### v۔ مثلث

ایسی نظم جس میں ایک بند میں مصرعوں کی تعداد تین ہوتی ہے۔

### vi۔ مسجع

مسجع کا مطلب ہے سجا ہوا۔ مسجع نظم اور نثر دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ اگر یہ اصطلاح کسی نثری عبارت میں استعمال ہوتی ہے تو ہم دیکھیں گے کہ فقرے آپس میں کتنے زیادہ مردف ہیں۔ اور اگر اس اصطلاح کو ہم شاعر میں دیکھیں گے تو دیکھیں گے کہ مصرعے ایک دوسرے سے ملتے ہیں کہ نہیں۔ نظم میں اس اصطلاح کو صنف ترجیح کہتے ہیں جبکہ نثر میں اسے مسجع نثر کہتے ہیں۔

### vii۔ مربع

ایسی نظم جس کا ہر بند چار مصرعوں پر مشتمل ہو۔

viii۔ **ترکیب بند**

ایسی نظم جو مختلف بندوں پر مشتمل ہو۔ ہر بند کے تمام اشعار آخری دو مصرعوں کے علاوہ ایک جیسا قافیہ رکھتے ہوں۔ جبکہ آخری شعر الگ قافیے پر مشتمل ہو۔ ایسی نظم کو ترکیب بند نظم کہتے ہیں۔

ix۔ **ترجیع بند**

ایسی نظم جس کے ہر بند کے آخر پر استعمال ہونے والا مصرع دہرایا جائے اس ترتیب میں تخلیق کی جانے والی نظم ترجیع بند کہلاتی ہے۔

x۔ **مستزاد**

یہ اصطلاح کلاسیکل شاعری میں کثرت سے مستعمل تھی۔ جدید شعرا کے ہاں اس کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ شعر کے آخر پر ایک چھوٹے سے جملے کا اضافہ مستزاد کہلاتا ہے۔

xi۔ **فرد**

ایسے شعر کو کہتے ہیں جو مضمون کے حوالے سے خود کفیل ہوتا ہے۔ فرد وہ شعر ہوتا ہے جو شاعر نے کسی زمین پر کہا ہو لیکن اس ایک شعر سے آگے شاعر نہ بڑھ سکا ہو فرد کہلاتا ہے۔

xii۔ **ثلاثی**

تین مصرعوں پر مشتمل نظم جس میں نہ کسی مخصوص وزن کی قید ہے اور نہ ہی کسی موضوع کی پابندی۔

xiii۔ **آزاد نظم**

یہ نظم کی ایک قسم ہے۔ جو صرف نام کی آزاد ہے۔ اس میں بھی کہیں کہیں قافیہ استعمال ہوتا ہے۔ مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں لیکن وزن میں ہوتے ہیں۔ آزاد نظم کے حوالے سے فیض احمد فیض، میرا جی، ن۔ م راشد، ظہور نظر اور مجید امجد کے نام سر فہرست ہیں۔ مجید امجد کی نظم "آٹو گراف" کا آخری حصہ ملاحظہ کیجیے۔

میں اجنبی، میں بے نشان، میں پابہ گِل، نہ رفعت مقام ہے، نہ شہرت دوام ہے۔
یہ لوحِ دل، یہ لوحِ دم، نہ اس پہ کوئی نقش ہے، نہ اس پہ کوئی نام ہے۔

xiv۔ **نظم معریٰ**

ایسی نظم جس کے تمام مصرعے ایک مخصوص بحر میں ہوتے ہیں۔ مگر یہ نظم ردیف قافیہ کی پابندی سے آزاد ہوتی ہے۔ ملٹن کی تصنیف Paradise Lost میں یہی طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔

### xv۔ نثری نظم

کسی شاعر کا نثری پیرائے میں اظہار نثری نظم کہلاتا ہے۔ یہ وزن، قافیے اور جملوں کی خاص تعداد سے ترتیب پاتی ہے۔

### xvi۔ سانیٹ

سانیٹ مغربی شاعری کی ایک قسم ہے۔ جس میں مصرعوں کی تعداد چار ہوتی ہے۔ اس کی ترتیب کچھ یوں ہوتی ہے۔

پہلا مصرع ایک ردیف قافیہ پر، مشتمل ہوتا ہے۔ پھر ایک مکمل شعر، پھر ایک مصرعہ پہلے مصرعے کے ربط میں لکھا جاتا پھر چند بند لکھے جانے کے بعد آخر میں ایک مکمل شعر لکھ کر نظم کی تکمیل ہوتی ہے۔

### xvii۔ ہائیکو

ہائیکو جاپانی صنف شاعری ہے۔ یہ تین مصرعوں پر مشتمل ایک مکمل نظم ہوتی ہے۔ یہ اردو شاعری میں اب تک کی سب سے جدید قسم ہے۔ اس نظم کے ارکان کی ترتیب کچھ یوں ہوتی ہے۔(۵۔۷۔۵)

فلسفے کی کتاب کھولی تو
سارتر کے حروف پر تتلی
اپنی ہستی کی سوچ میں گم تھی

## ج۔ اسلوب کا تعارف:

### اسلوب (Style)

لفظ اسلوب، انگریزی کے لفظ Style کا ہم معنی ہے۔ یونانی میں سٹائیلس (Stylus) اور لاطینی میں (Style) اسلوب کا ہم معنی ہے۔ دراصل لفظ اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے جو (ا + س + ل + و + ب) مذکر واحد سے نکلا ہے۔ لفظ اسلوب کی جمع اسالیب ہے۔ نور اللغات کے مطابق یہ لفظ اسلوب ہے جس کا مطلب طرز، طور، طریقہ، اسلوب، ڈھنگ وغیرہ ہے۔

اسلوب کے لیے درج ذیل الفاظ استعمال ہوتے ہیں:

۱۔ چال، ڈھب، ڈھنگ

۲۔ طریق، رواج، رسم، روایت

۳۔ ضابطہ، طرز، طریق

۴۔ فقرے کی تشکیل کے نو

۵۔ مٹ، مجسمہ، پھتر کی مورتی

اسلوب کسی بھی فنکار کے فن پارے کا وہ مضبوط ترین اصول ہے جس کے ذریعے وہ اپنے خیالات کو قاری تک پہنچاتا ہے۔ اسلوب ایک سمندر کی مانند ہے جس میں فنکار غوطہ زن ہو کر قاری کے دل میں اپنی جگہ بناتا ہے۔ ڈاکٹر جے براؤن کے مطابق:

> ”اگر تاثر سونا ہے تو اسلوب مہر ہے جو اسے رائج کرنے کے قابل بناتی ہے اور بتاتی ہے کہ کس بادشاہ نے اسے جاری کیا“[۴۲]

کوئی بھی لکھاری اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کا قلم منفرد نہیں لکھے گا۔ ایک ادبی اسلوب کی سب سے اہم شرط (Readable) یعنی تحریر کا قابل مطالعہ ہونا ہے۔ جب تحریر پڑھنے کے قابل ہو گی تو بات پوری طرح سے قاری کی سمجھ میں آئے گی۔ تب جا کر قاری اس تحریر کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکے گا۔ محمد حسین آزاد اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”میرے دوستو زندگی کے معنی کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سونا، اور منہ سے بولے جانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کے معنی ہیں کہ خاص خوبیوں کے ساتھ نام کی شہرت عام ہو۔ اور اپنے بزرگانِ باکمال کے رویے اور رفتاروں کو دیکھنا، انھیں ہماری نظروں کے سامنے زندہ کر دکھاتا ہے۔ اور ہمیں بھی اس دنیا کے مشکل راستوں پر چلنا سکھاتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ کس طرح ہم اپنی زندگی کو اتنا طولانی اور ایسا گراں بنا سکتے ہیں“[۴۳]

اسلوب (Style) عام طور پر کسی مصنف کا انداز نگارش یا طرز بیان کا مطلب ضرور لیا جاتا ہے لیکن اسلوب کی تعریف یا تفہیم اتنی آسان بات نہیں ہے اس بات کا اعتراف ہر زمانے کے اہل علم لوگوں نے کیا ہے جنھیں اسلوب سے دلچسپی رہی ہے۔ اور اسلوب کے حوالے سے مختلف طریقوں سے سوچتے رہے ہیں۔ اسلوب کی جتنی تعریفیں، تشریحیں اور تعبیریں ہمارے سامنے آتی ہیں اسلوب کا مسئلہ اور بھی زیادہ الجھتا جا رہا ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اسلوب کے حوالے سے کسی بھی تعریف کو حتمی شکل دینا ایک مشکل ترین کام ہے۔

یہاں چند ایک ادیبوں، دانشور اور فلسفیوں، مفکروں اور اسی خاندان سے جڑے چند دیگر ماہرین علم و فن نے اسلوب کی تعریفیں پیش کر کے قاری کے ابہام کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیچری بفون کے مطابق:

"اسلوب خود ہی انسان ہے"[۴۴]

بفون کی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انگریزی کے ایک مشہور قلم کار مورخ گِبن نے کہا ہے:

"اسلوب کردار یا شخصیت کا عکس ہے"[۴۵]

سوئفٹ کا کہنا ہے کہ:

"مناسب الفاظ کا مناسب جگہوں پر استعمال ہی اسلوب کی سچی تعریف ہے"[۴۲]

ایمرسن نے اسلوب کے حوالے سے کچھ یوں بیان کیا ہے:

"انسان کا اسلوب ہی اس کی ذہنی آواز ہے"[۴۶]

شوپنہاور کے مطابق:

"اسٹائل خیال کا سایہ ہے۔"[۴۷]

اسلوب فن کار کے تابع ہوتا ہے۔ فن کار کو چاہیے کہ وہ اپنی تحریر میں بڑی خوبصوتی کے ساتھ جان ڈالے کہ بدصورت چیزیں خوبصورت لگنے لگے۔ جب فنکار بے کار اور فرسودہ الفاظ کو چھانٹ کر الگ کر دے گا تو اس کی تحریر ویسے ہی دلکش ہو جائے گی۔

جب فن کار رواں، سلیس، اور آسان بات کہنے کے بجائے مشکل پسندی کا شکار ہو گا تو وہ ناکام ہو جائے گا کیوں کہ وہ اپنا پیغام جو اپنی تحریر کے ذریعے دینا چاہتا تھا وہ نہ دے پائے گا۔ اسلوب ایسا ہو کہ مشکل سے مشکل بات آسان سے آسان الفاظ میں بیان کی جائے۔ جب اسلوب مشکل ہو گا تو نہ صرف قاری کو بلکہ مصنف کو بھی اس کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ کسی بھی فنکار کے کامیاب اسلوب کا ایک نقطہ اس کی اپنی ذاتی شخصیت بھی ہے۔ اگر فنکار کی شخصیت خوبیوں سے مزین ہے تو ہر صورت میں قاری اس کی تحریر کو قبول کرے گا۔ اگر فنکار کی شخصیت نفرت آمیز ہے تو اس کا اسلوب جتنا مرضی بہتر ہو وہ اس طرح کامیاب نہیں ہو سکتا جس طرح ہونا چاہیے تھا۔ بعض لوگوں کو ان کی موت کے بعد پزیرائی ملتی ہے۔ ان کی اصل وجہ یہی ہے کہ ان کی شخصیت کو لوگ پسند نہیں کرتے ہوتے۔ دراصل اسلوب مصنف کی شخصیت کا نہ ٹوٹنے والا ایک عنصر ہے۔

جب کسی بھی خیال کو تحریری شکل دی جاتی ہے تو وہ اسلوب کہلاتا ہے۔ اس کا کامیاب یا ناکام ہونا بعد کی بحث میں آتا ہے۔ جب کسی مصنف کے دماغ میں خیال گردش کرتے ہیں تو ان خیالات کا اظہار تحریری شکل میں ہوتا ہے۔ وہی تحریری شکل اسلوب ہے۔ مصنف کو چاہیے کہ وہ آسان الفاظ کو استعمال کر کے قاری کے لیے آسانی پیدا کرے مثلاً اگر ہم غالب اور میر کی تحریروں کو پڑھتے ہیں تو غالب کی تحریروں میں مشکل پسندی واضح نظر آتی ہے۔ جبکہ میر کے کلام میں بات آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے۔ حکیم آغا جان عیش نے غالب کی مشکل پسندی سے تنگ آکر کہا:

"کلام میر سمجھے اور زبان مرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے"

یہاں زبان میر سے مراد میر کا اسلوب ہے جو غالب کے پیچیدہ اسلوب کے مقابلے میں آسان تھا۔ شوپنہار اسلوب کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ: "اسلوب دماغ کی خارجی تصویر کا نام ہے"[۴۸]

اس تعریف سے جو بات ہمارے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے دماغ کے اندر کی ہلچل کو خارجی پیکر کا نام دیا جاتا ہے۔ جو چیز ہمارے دماغ میں گردش کر رہی ہوتی ہے اس کو تحریری انداز میں بیان کر کے مصنف سکون کی سانسیں لیتا ہے۔ اور وہ تحریری اظہار ہی اسلوب ہے۔ اسلوب کے حوالے سے کوئی بھی رائے حتمی نہیں ہے۔ البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ اسلوب سے مراد افکار و خیالات کے اظہار و ابلاغ کا ایسا طریقہ ہے جو خوبصورت اور منفرد ہے۔ اسلوب خود ہی انسان ہوتا ہے۔ کیوں کہ جب مصنف کچھ لکھتا ہے تو اس کی تحریر میں اس کی شخصیت کی واضح جھلک نظر آرہی ہوتی ہے۔ مصنف کی شخصیت اپنے تمام اتار چڑھاؤ اور رنگ و آہنگ کے ساتھ الفاظ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ انسان کا اسلوب وہی ہے جس نے انسان کی گفتگو میں مٹھاس بھری ہو۔ الفاظ کے انتخاب کا معاملہ اسٹائل یا اسلوب میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ خیال ایک ایسی شے ہے جو الفاظ کے قالب میں غوطہ ذن ہو کر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ جب کوئی فن کار معمولی خیالات کو خوبصورت الفاظ کا لبادہ اوڑھا کر کرتا ہے تو معمولی سی بات بھی دل کو چھو لیتی ہے مثلاً میر اور غالب کے کلام کو پیش کر کے اس بات کو مزید واضح کرنے کی کوشش ہے۔

ے "صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

عشق سے لوگ منع کرتے ہیں

جیسے کچھ اختیار ہے اپنا"

ان اشعار پر تو جتنا غور کریں گے اتنا ہی ہم لطف کی نئی وادی میں قدم رکھتے جائیں گے۔ لیکن اگر غالب کے کلام کی بات کریں تو غالب کا کلام گہرائیوں پر مشتمل ہے مگر اظہار پر اتنی قدرت نہیں ہے۔ جب کوئی شاعر یا ادیب اپنے خیالات و تجربات کو اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہے تو اگر وہ مصنف جس زبان میں اپنے خیالات کا ظہار کر رہا ہے اس پر عبور رکھتا ہو تو وہ الفاظ اور محاوروں کو اپنے خاص انداز میں بیان کر کے تحریر میں چاشنی پیدا کرے گا تو تب جا کر وہ ایک کامیاب مصنف کہلائے گا۔ زبان پر عبور حاصل کرنا کوئی عام بات نہیں ہے لیکن اگر کوئی ادیب عبور حاصل کر لیتا ہے تو اس کا اسلوب کامیاب اور دلکش اسلوب ہو گا۔ کیوں کہ وہ مناسب جگہوں پر محاورات، ضرب الامثال، اشعار وغیرہ کا استعمال کر کے اپنی تحریر میں چاشنی پیدا کرے گا۔ اسلوب نظم اور نثر دونوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن نثر میں اسلوب سے مراد سوچنے سمجھنے خیالات اور بیانات کا پیرایہ ادا ہے۔ جبکہ نظم میں اسلوب سے مراد ہے کہ شعر تخیل اور جذبات کی ترجمانی کا وسیلہ ہے۔ کسی بھی مصنف کے اسلوب کو سمجھنے کے لیے اس کی ذات سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ اسلوب ایک وسیلہ ہے مصنف کے جذبات و خیالات کا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مصنف اپنی بات کو پوری طرح قاری تک پہنچانے میں ناکام رہتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ مصنف کے اسلوب کا نقص سمجھا جاتا ہے۔ اسلوب خیالات کی تحریری صورت کا نام ہے اگر خیالات سیدھے سادے اور آسان نہیں تو ان کا اظہار بھی سیدھا سادہ اور آسان نہیں ہو گا اور اگر خیالات میں کہیں الجھاؤ ہے تو اسلوب بھی الجھا ہوا ہو گا۔ اسلوب کے حوالے سے ریاض احمد اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

> "اسلوب تحریر کی ایسی صفت کا نام ہے جو محض ابلاغ کے بجائے اظہار سے مختص ہے۔ ابلاغ حقائق کی پیشکش کا نام ہے اظہار اس کے مقابلے میں حقائق کے شخصی، ذاتی یا انفرادی تاثر کو پیش کرنے کا نام ہے۔ ابلاغ موضوع کی منطق تک محدود رہتا ہے اور اظہار پوری شخصیت کا احاطہ کرتا ہے۔ اسلوب ادب میں تخلیق پاتا ہے۔ بنیادی احساس کے اس اظہار سے، جو لفظ اور زبان

کی معنوی اور اشاراتی کیفیت سے قطع نظر زبان کے مخصوص طریق استعمال
ہے شروع ہوتا ہے۔"[۴۹]

اسلوب کیا ہے؟ یہ سوال ایک لحاظ سے ادب کی بنیادی قدروں سے متعلق ہے اسلوب دراصل دو طرح کا ہوتا ہے۔

۱۔ اچھا اسلوب

۲۔ برا اسلوب

اسلوب کیا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اس سوال کے کئی جوابات ہوسکتے ہیں۔ سجاد باقر رضوی تو اسلوب کو شخصیت کا ہی اظہار سمجھتے ہیں۔ اصل میں سٹائل کے دو اجزاء ترکیبی ہیں جن کے امتزاج سے اسلوب وجود میں آتا ہے یعنی کہ فنکار کی شخصیت اور اس کے خیال کا تجربہ۔ اس خیال کو (Lowell) نے اس طرح بیان کیا ہے:

"Style is the establishment of a perfect Mutual understnding between the workers and his materiale"[۵۰]

اسلوب کے حوالے سے دو مکتبہ فکر کا نام ہمارے سامنے آتا ہے۔

۱۔ افلاطون کا نظریہ اسلوب

۲۔ ارسطو کا نظریہ اسلوب

افلاطون کا نظریہ اسلوب ماننے والوں کا خیال ہے کہ اسلوب کسی جذبے کی صفت کا نام ہے جو کسی دوسری تحریر میں نہیں مل سکتی جبکہ ارسطو کا نظریہ اسلوب کے جاننے والوں کا خیال ہے کہ اسلوب کسی جذبے کے موروثی اظہار کا نام ہے۔

اسلوب کے حوالے سے افلاطونی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے نقادوں کا ایک جملہ ان کے پورے مکتبہ فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔ یعنی اسلوب کا وجود ہے یا نہیں۔ اسلوب زمانہ قدیم سے ہمیشہ دلچسپ موضوع رہا ہے۔ اس موجوع پر بے شمار کتب موجود ہیں۔ جب سے انسان نے لکھنے پڑھنے کا آغاز کیا تب سے اسلوب کا موضوع زیر بحث رہا اور ہر زمانے میں لفظ کو مرکزی حثیت حاصل رہی۔ انسانی ذہن میں خیالات کا جو ایک سلسلہ جاری ہوتا ہے ان خیالات کو موزوں الفاظ کا رنگ دینا اسلوب ہے۔ کسی ایک مصنف کا اسلوب کوئی دوسرا مصنف سو فیصد نقل نہیں کرسکتا۔ ہاں! قریب ترین پہنچ سکتا ہے اگر وہ کوشش کرے تو مگر جو چاشنی

اصل تحریر میں ہو گی وہ تقلید شدہ تحریر میں نہیں ہو سکتی۔ایک ادیب یا شاعر کسی دوسرے سے اثر قبول کر سکتاہے۔ جس طرح مشہور ہے کہ ناصر کاظمی کی شاعری میں میر تقی میر کی شاعری کا رنگ نظر آتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ناصر کاظمی کے ہاں بھی میر کی طرح چھوٹے چھوٹے اشعار میں بڑی بڑی باتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ مگر دونوں کا اسلوب الگ الگ ہے۔ مضمون ایک ہی ہوتا ہے مگر اس کو قلمبند مختلف انداز میں کیا جاتا ہے۔اور مضمون کو لکھنے کے لیے ہر مصنف کا ایک خاص انداز ہوتا اور وہی انداز ہی اسلوب ہے۔جو لکھنے والے کی شخصیت کا پتا دیتا ہے۔ادبی ذوق رکھنے والا ہر شخص یہ جانتا ہے کہ غالب کے ہاں کس طرح کا اسلوب پایا جاتا ہے۔مومن کس طرح کے اشعار کہتا ہے۔ اقبال کے ہاں کیسی تراکیب پائی جاتی ہیں۔ یہاں ایک مثال کے ذریعے بات کو مزید واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔فسانہ عجائب میں رجب علی بیگ نے سورج کے طلوع ہونے کے نظارے کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

”جس وقت زاغ شب نے بیضہ ہائے انجم
آشیانہ مغرب میں چھپائے، اور صیادان
سحر دام بردوش آئے اور سیمرغ زریں
جناح مطلاّ بال ، غیرتِ لعل، قفس سے مشرق
سے جلوہ افروز ہوا یعنی شب گزاری روز ہوا“ [۵۱]

اسی بات کو اسماعیل میرٹھی نے بہت آسان الفاظ میں صرف ایک مصرعے میں بیان کر کے بات ختم کر دی ہے۔

**رات گزری نور کا تڑکا ہوا**

ایک ہی بات کو دو مختلف فن کاروں نے بیان کیا لیکن دونوں کا انداز بیان مختلف ہے۔ان حوالوں سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر ادیب کا اپنا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ جن کی بنا پر وہ دوسرے سے ممیز ہوتا ہے۔

پسِ نظر تحقیقی کام میں تین شعرا کی تین منظوم آپ بیتیاں شامل ہیں۔”آئینہ درآئینہ“ ، ”آدھی صدی کے بعد“ اور ”غم زمانہ بھی سہل گزرا“۔ان تینوں منظوم آپ بیتیوں کا مطالعہ کرنے سے قاری تینوں آپ بیتیوں کے اسلوب سے اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے۔اسلوب کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو وزیر آغا کی آپ بیتی ”آدھی صدی کے بعد“ کا اسلوب اور ”غم زمانہ بھی سہل گزرا“ کا اسلوب قدرے مشکل ہے یہ

نسبت ''آئینہ در آئینہ'' کے کیوں کہ پہلی دونوں آپ بیتیوں میں مشکل تراکیب کا استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ''آدھی صدی کے بعد'' اور'' غم زمانہ بھی سہل گزرا''کا اسلوب مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن اگر بات کریں ''آئینہ در آئینہ'' کی تو ''آئینہ در آئینہ''میں حمایت علی شاعر نے بڑے سلیس اور آسان انداز میں اپنی پوری زندگی کو نظم کی شکل میں بیان کیا ہے۔

**د۔ تقابل کے بنیادی مباحث:**

تقابل میں دو یا دو سے زیادہ چیزوں کو سامنے رکھ کر افتراقات و اشتراکات کا تعین کر کے نتائج اخذ کرنے کا نام تقابل ہے۔ دو چیزوں کے درمیان ایک جیسی چیزوں کو الگ کرنا اور پھر ان میں جو اختلاف پایا جاتا ہے ان کو الگ کرنے کا نام تقابل ہے۔ تقابلی ادب کی آوازیں پہلی مرتبہ انیسویں صدی کے شروع میں فرانس میں سننے میں آئیں جب پہلی مرتبہ تقابل کے حوالے سے فرانسیسی اور کچھ دیگر زبانوں کے فن پاروں کو شائع کیا گیا۔ پروفیسر سوزن بیسنٹ اس کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں:

> ''تقابلی ادب مختلف ثقافتوں کے متون کا مطالعہ ہے، یہ ایک کثر العلمی مضمون ہے جس کا تعلق زمان اور مکان کے بعد میں پیدا ہونے والے ادب کے درمیان رشتوں کے نقوش سے متعلق ہو''[۵۲]

ادبی روایات کی بات کی جائے تو ہماری ادبی روایت کا ایک طاقتور گٹھ جوڑ ملتا ہے۔ سندھ، سرحد، بلوچستان، پنجاب، کشمیر، گلگت بلتستان کی زبانوں میں بہت زیادہ ادبی ذخیرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر زبانوں کی بات کریں تو اردو میں بہت سی زبانوں کی آمیزش ہے۔ یہ مختلف زبانوں کی آمیزش بھی ہماری قومی ثقافت کو چار چاند لگانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ہماری ثقافت میں مختلف لوگوں کی آمد سے بھی رنگارنگی آئی ہے۔ یعنی جب انگریز ہندوستان میں آئے تو جہاں انھوں نے اردو زبان کی خدمت کی ہے وہاں ہمیں انگریزی زبان کا راستہ بھی دکھایا ہے۔ اور پھر ہم دیگر یورپی زبانوں کو سیکھتے چلے گئے۔ ان زبانوں کو سیکھنے کے لیے ترجمہ نے اہم کردار ادا کیا۔ ہم کسی زبان کو اسی صورت میں اچھی طرح سیکھ سکتے ہیں جب ہم ترجمہ کر کے اسے اپنی زبان میں نہ لے آئیں گئے۔ اس لیے تقابلی ادب کو سمجھنے کے لیے ترجمہ ایک اہم مضمون کی حثیت رکھتا ہے۔ تقابلی ادب تو ترجمہ کو اپنی ہی ایک شاخ قرار دیتا ہے۔ مگر اب اس خیال کو چیلنج کیا جا چکا ہے کہ جب کسی کلچر میں تبدیلی رونما ہوتی ہے تو تب بڑے پیمانے پر ترجمہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب کوئی قوم یا ملک مسلسل جدوجہد کر کے کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں تو تب ترجمے کے میدان

میں وسعت آتی رہتی ہے اور جب اپنا مقصد حاصل کر لیتے ہیں تو پھر ترجمے کے پھیلاؤ میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ تقابلی ادب میں پینٹنگ، سنگ تراشی، آرکی ٹیکچر، موسیقی، فلسفہ، سیاسیات، سماجیات، سائنس مذہب سبھی کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ اور ایک ادب کا دوسرے ادب کے ساتھ تقابل کیا جاتا ہے۔ تقابلی ادب کے دو بڑے دبستانوں میں فرانس کا دبستان اور امریکہ کا دبستان شامل ہیں۔ امریکی دابستان سے تعلق رکھنے والے اسکالرHenry Remakکا خیال کہ تقابلی ادب کسی ایک ملک کی حدود سے نکل کر ادب کے مطالعہ کا نام ہے۔ جبکہ فرانسی دبستان سے تعلق رکھنے والے اسکالرز نےHrnry Remakکے نظریے کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ تقابلی ادب کی بنیاد ہی کسی ملک کی حدود و قیود ہیں۔ ریمیک کے مطابق تو کوئی بھی دو چیزوں کے درمیان تقابل کیا جاسکتا ہے چاہے وہ چیزیں ادب کے زمرے میں آتی ہوں یانہ آتی ہوں۔امریکی دبستان سے تعلق رکھنے والوں کا خیال ہے کہ ادب اور سیاست دونوں کو الگ الگ ہونا چاہیے۔پروفیسر آرتھر مارش کہتا ہے:

"ادب کے مجموعی مظہر کا جائزہ، ان کا تقابل کرنا، گروہ بندی کرنا، قلم بندی کرنا، ان کے اسباب کی تحقیق اور نتائج کا تعین کرنا یہ ہے تقابلی ادب کا اصل مطلب"[۵۳]

ادب میں وسعت صرف ایک ہی صورت میں ہو سکتی ہے کہ وہ حدود و قیود کی پابندی سے آزاد ہو کر صرف اور صرف ادب کا مطالعہ بنے۔ ویلک کہتا ہے کہ تقابلی ادب میں تاریخ ایک ہیرو کا کردار ادا کرتی ہے لیکن تاریخ صرف اور صرف ثقافتی ہونی چاہیے۔ دو یا دو سے زیادہ ایک جیسی اصناف کو ایک دوسرے کے سامنے لا کر ان میں افتراقات اور اشتراکات کا تعین کر کے نتائج اخذ کرنا تقابل کہلاتا ہے۔ دو مختلف چیزوں کے درمیان تقابل نہیں کیا جا سکتا۔ دو یا دو سے زائد زبانوں تہذیبوں، ادبوں کے درمیان بھی تقابل کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کے اختلافات اور مماثلتوں کو نکال کر الگ کیا جاسکتا ہے۔ تقابل ایک مشکل ترین کام ہے۔ اور تقابل کا عمل ناقص ترین عمل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک صنف سو فیصد کسی دوسری صنف کے معیار پر پورا نہیں اترتی ہوتی۔ اگر تقابل کے دوران خامیاں زیادہ ہوں تو یہ بھی طریقہ درست

نہیں اور اگر خوبیوں کی بھرمار ہو تو یہ بھی درست عمل نہیں ہے۔ تقابل میانہ روی کا دوسرا نام ہے۔ جس میں خوبیاں اور خامیاں برابر ہونی چاہیے۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات میں ابولا عجاز صدیقی تقابلی مطالعے کے حوالے سے کچھ یوں رقمطراز ہیں۔

"موازنہ مشترک بنیاد رکھنے والی دو چیزوں کا تقابلی مطالعہ ہے۔ اصولاً موازنہ میں ترجیح کا سوال شامل نہیں لیکن بالعموم موازنہ کرنے والا نقاد ایک فنکار یا فن پارے کی دوسرے فن پارے میں ترجیح ثابت کرنے کی خواہش سے کلی اجتناب نہیں برت سکتا۔ بعض اوقات نقاد کا مقصد یہ ہوتا کہ ایک ادب پارے کے دوسرے ادب پارے یا ایک فن کار کی دوسرے فن کار پر ترجیح ثابت کی جائے"[۵۴]

تقابلی ادب کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ ان نکات سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ تقابلی مطالعہ چوں کہ دو مختلف تہذیبوں اور علاقوں کے تحت لکھے گئے ادب کا مطالعہ ہے اس لیے یہ ایک عالمگیر معاشرے کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔

۲۔ تقابلی مطالعہ کے تحت مصنف اپنی تحریروں کو دیگر ممالک کے درمیان آشکار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

۳۔ دو تہذیبوں کے درمیان لکھے گے ادب کا تقابل کیا جا سکتا ہے۔ دو ملکوں کی زبانوں کا مطالعہ بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ کسی بھی فن پارے کے ساتھ ساتھ تہذیبی، ثقافتی پس منظر ماحول، سماجی حالات و واقعات، زبان، اسلوب، اصناف، اور موضوعات کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔ اور یوں معلومات دنیا بھر کے خطوں میں پھیلتی چلی جاتی ہے۔

۴۔ تقابلی مطالعہ سے ایسے ادب کو فروغ ملتا ہے جو حدود و قیود سے آزاد ہوتا ہے۔

۵۔ تقابلی مطالعہ سے مختلف علاقوں کی زبان اور کلچر سے واقفیت ہوتی ہے۔

تقابلی مطالعہ کی روایت کی اگر بات کی جائے تو اس کی ابتداء ۱۹ویں صدی کے شروع میں فرانس میں سنی گئی ہے۔ مغرب میں تقابلی ادب کے تین بڑے دبستان سامنے آتے ہیں۔

۱۔ فرنچ سکول آف تھاٹ French school of Thought

۲۔ جرمن سکول آف تھاٹ German school of Thought

۳۔ امریکن سکول آف تھاٹ Amercan school of Thought

### فرانسیسی دبستان:

فرانسیسی دبستان کی ابتداء۱۹۰۵ء میں ہوئی ہے۔ اس وقت ادب میں ماخذات کا مطالعہ کیا جاتا تھا کہ کن ماخذات کے تحت کوئی ادب تخلیق پاتا ہے۔ ابتداء میں یہ تحریک اپنے اثرات چھوڑتی ہوئی نظر نہ آئی۔ مگر اس تحریک نے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک عروج پکڑا۔ یہ وہ دور تھا جب تمام عالم دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے نبرد آزما تھا۔ اس کے تناظر میں ایسے ماخذات اور اثرات کا موازنہ کیا جاتا تھا جو کسی بھی تحریک، جرم، یا حادثے کا سبب بنتے تھے اور یہ جاننے کی کوشش کی جاتی تھی کہ ایک نظریہ یا نقطہ نظر ادب کے زریعے ایک قوم سے دوسری قوم تک کیسے سفر کرتا ہے اور کس طرح دو یا دو سے زائد اقوام جو کہ مختلف جغرافیائی حالات سے تعلق رکھتی تھیں وہ کس طرح ایک مرکز پر جمع ہوتی ہیں۔ اس دبستان کے تحت صرف یورپین ممالک کے ادب کا جائزہ لیا جاتا تھا اور اس کی بنیاد قوم پرستی ہوتی تھی۔ یہ جائزہ حب الوطنی کی بنیادوں پر کیا جاتا ہے۔

### جرمن دبستان:

اس دبستان کا آغاز انیسویں صدی کے آخر پر ہوا اور اس کا نقطہ عروج ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۹ تک نظر آتا ہے۔ اس دبستان کے تحت سماجی پس منظر رکھنے والے ڈراموں اور Love Songs کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا تھا۔ اور اس تقابل کے بنیادی اصول ساختیات کی بنیاد پر وضع کیے جاتے تھے۔

### امریکن دبستان:

یہ دبستان فرنچ سکول آف تھاٹ کے رد عمل کے طور پر آیا۔ اس میں انھوں نے ادب کو سرحدی بنیادوں سے ماورا کر دیا۔ کیونکہ فرنچ سکول آف تھاٹ صرف یورپین ممالک اور قوم پرستی تک محدود تھا۔ اس لیے انھوں نے ادب کو سرحدوں کی حدود سے آزاد قرار دیا۔ اور تقابلی مطالعے میں تمام اقوام کے تخلیق کردہ اور لکھے گئے ادب کو شامل کر دیا اور اس میں چینی زبان سے لے کر عربی زبان کے ادب کو شامل کیا گیا۔

### تقابلی ادب کی اقسام

تقابلی ادب کی دو اقسام ہیں۔

### بیانیہ تقابل:

بیانیہ تقابل میں ادب کے خارج کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بیانیہ تقابل میں کسی بھی چیز کی ظاہری ساخت، ابواب، فن لوازم کے حوالے سے بات کی جاتی ہے۔ جب کسی بھی فن پارے کے تقابلی مطالعے کی بات کرتے ہیں تو دو نکات بہت اہمیت کے حامل ہیں یعنی داخلی اور خارجی محرکات۔ خارجی محرکات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس دور میں کوئی فن پارہ تخلیق ہوا ہے اور اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کیسے تھے۔ کیوں کہ جب بھی کوئی ادیب ادب تخلیق کر رہا ہوتا ہے تو وہ دراصل اپنا عہد لکھ رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اس ادیب کی تحریروں میں اس عہد کی جھلک واضح دکھائی دیتی ہے۔ جب کہ داخلی محرکات میں کسی بھی ادیب کی شخصیت، اس کے حالات وغیرہ زیر بحث آتے ہیں۔

**اقداری تقابل:**

اس طریقہ تقابل کو تعینِ قدر بھی کہا جاتا ہے۔ تقابل کے اس طریقے میں ایک مرکزی پیمانہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اور اس کے اصول و ضوابط طے کر لیے جاتے ہیں۔ اور پھر دو یا دو سے زائد چیزوں کا اس مرکزی بنیاد پر تقابل کیا جاتا ہے۔ اور یہ واضح کیا جاتا ہے کہ کون سی چیز اس مرکزی ضابطے کے قریب ہے اور کونسی چیز دور ہے اور کونسی اس مرکزی پیمانے پر پورا اترتی ہے۔ مثلاً ایک معیاری نظم کا معیار طے کر کے دو نظموں کو اس مرکزی معیار کے تناظر میں باہم تقابل کر کے معیار اخذ کیے جاتے ہیں۔ دونوں نظموں کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد ہی پتا چلتا ہے کہ کون سی نظم مطلوبہ ضابطے پر پوری اترتی ہے اور کون سی نہیں۔ جو نظم تقابلی ضابطے کے زیادہ قریب ہو گی اس کو معیاری نظم کہتے ہیں اور جو نظم تقابلی ضابطے سے دور ہو گی اس کو غیر معیاری نظم کہتے ہیں۔

**ہ۔ منظوم آپ بیتی نگاروں کا اجمالی تعارف**

**1۔ وزیر آغا- مختصر تعارف:**

ڈاکٹر وزیر آغا کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وزیر آغا کی پیدائش ۱۸ مئی، ۱۹۲۲ء کو سرگودھا میں ہوئی۔ وزیر آغا نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مختلف سکولوں سے حاصل کی۔ تعلیم کے سلسلے میں ان کو ایک بار ساہیوال کے کسی سکول میں داخل کرایا گیا۔ ایک سال مکمل ہونے کے بعد وزیر آغا سرگودھا واپس چلے آئے اور اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ یہیں سے شروع کیا۔ ۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اور ایف اے کے لیے ان کو پھر کچھ عرصے کے لیے سرگودھا چھوڑنا پڑا۔ وہ گورنمنٹ کالج جھنگ میں داخل ہوئے وہ ایف اے میں اپنے کالج میں پہلے نمبر پر آئے۔ پھر وہ اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے لیے لاہور چلے گئے۔ ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کی ڈگری مکمل کی اور اسی کالج میں ایم اے

میں داخلہ لے لیا اور معاشیات میں ماسٹر ڈگری ۱۹۴۳ء میں مکمل کی۔ ایم اے کرنے کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا تعلیم سے کافی عرصہ دور رہے۔ اس دوران وہ زراعت اور اس سے ملتے جلتے کاموں میں مصروف رہے۔ ۱۹۵۱ء کی بات ہے جب وزیر آغا کو دوبارہ خیال آیا کہ تعلیم مکمل کر لینی چاہیے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لیے اپنی تحقیقی کاوشیں شروع کیں۔ ان کے تحقیقی کام کی تکمیل کے لیے نگران کے طور پر ڈاکٹر عبادت بریلوی کو مقرر کیا گیا۔ آخر کار ۱۹۵۶ء میں ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر وزیر آغا سے ڈاکٹر وزیر آغا کہلائے۔ وزیر آغا کی زندگی کا درمیانی دور ان کے لیے ہر اعتبار سے اہم دور تھا۔ اس عرصہ میں یعنی ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۵۹ء تک کا عرصہ ہر اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی پہلی کتاب ''مسرت کی تلاش'' ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری کی تکمیل ۱۹۵۶ء میں پی ایچ ڈی کے مقالے کی اشاعت۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ مولانا صلاح الدین سے دوستی کا آغاز بھی اسی دہائی کا مرہون منت ہے۔ اس کے بعد وزیر آغا نے مولانا صلاح الدین کے ساتھ مل کر ۱۹۶۰ء میں اپنی صحافتی زندگی کا آغاز،، ادبی دنیا،، کے شریک مدیر کی حثیت سے کیا۔ وزیر آغا نے پانچ سال تک ''ادبی دنیا'' میں پورے خلوص اور محنت سے کام کیا۔ آخر کار یہ سفر ختم ہوا اور ۱۹۶۲ء میں ایک نیا ماہنامہ "اوراق " جاری کیا۔ اوراق ایک ایسا رسالہ تھا جس نے نئے لکھاریوں کو لکھنے کا موقع فراہم کیا۔ وزیر آغا اس دور کے حاکم وقت صدر ایوب خان کے دور حکومت میں سیاست میں بھی لیتے رہے۔ لیکن جلد ہی ان کا اس کام سے جی بھر گیا اور انھوں نے سیاست کو چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی و ادبی خدمات:

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ | ''شام اور سائے'' | (نظمیں) | ۱۹۶۴ء |
| ۲۔ | ''دن کا زرد پہاڑ'' | (نظمیں اور غزلیں) | ۱۹۶۹ء |
| ۳۔ | ''غزلیں'' | | ۱۹۷۳ء |
| ۴۔ | نردبان | (نظمیں) | ۱۹۷۹ء |
| ۵۔ | ''آدھی صدی کے بعد'' | (منظوم آپ بیتی) | ۱۹۸۱ء |
| ۶۔ | ''گھاس میں تتلیاں'' | (غزلیں نظمیں) | ۱۹۸۵ء |
| ۷۔ | ''اک کتھا انوکھی'' | (غزلیں نظمیں) | ۱۹۲۲ء انگریزی ترجمی وزیر آغا |

۸۔ ''اک کتھا انوکھی'' یونانی ترجمہ Danee Papastrato ۱۹۹۴ء

۹۔ ''اک کتھا انوکھی'' سویڈیش ترجمہ Eva. M Alander ۱۹۹۵ء

اس کے علاوہ وزیر آغا پر ۱۴ باقاعدہ کتب لکھی جا چکی ہیں۔ الزبیر، تسطیر، اخبار اور مخزن سمیت ۱۴ رسائل نے "ڈاکٹر وزیر آغا نمبر" شائع کیا۔

ایم اے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سند کے حصول کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا پر مختلف موضوعات پر ۱۶ تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ وزیر آغا نے جو کچھ بھی لکھا حقیقتوں پر مبنی لکھا۔ وزیر آغا ایسے شاعر اور ادیب گزرے ہیں جو دوسروں کے لیے جیتے تھے۔ ان کے چاہنے والے آج بھی ان کا نام لے کر رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ وزیر آغا نے جس بھی موضوع پر لکھا ہے کمال لکھا۔ اُن کی تنقید کی کتب پڑھ لیں، خاکہ نگاری کا مطالعہ کریں یا شاعری کو پرکھیں وہ ہر فن مولا نظر ہوتے ہیں۔ لیکن انہوں نے جب طویل نظمیں لکھنے کا آغاز کیا تو اِن کی نظمیں "آدھی صدی کے بعد"، "اک کتھا انوکھی" نے اردو نظم کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ اختر حسین جعفری کے حوالے سے مشہور ہے کہ وہ مجید امجد، میراجی، ن۔م۔ راشد اور وزیر آغا کو ایک برابر دیکھتے تھے۔ اختر حسین جعفری کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دیگر جدید شعرا کی طرح وزیر آغا بھی جدید شعراء کی فہرست میں شامل ہیں۔ وزیر آغا کے ادبی کارناموں کی بات کوئی منٹوں، گھنٹوں، دنوں یا ہفتوں کی بات نہیں ہے بلکہ اس شخصیت کے محاسن کو بیان کرنے کے لیے پوری زندگی کی ضرورت ہے۔ کائنات میں ایسے لوگ بہت قلیل ہوں گے جو ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہوں۔ یہ وزیر آغا ہی ہیں جو غزل، نظم، انشائیہ، آپ بیتی، سفر نامے، رسائل و جرائد بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ان کی تہ در تہ شخصیت کی اتنی پرتیں ہیں کہ ان کو شمار کرنا آسان نہیں۔ اس حوالے سے احمد فراز اپنے الفاظ کو کچھ یوں پروتے ہیں:

"بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو ساری عمر لگے"

زندگی ایک دھوکہ ہے۔ اس دھوکے کو ایک نہ ایک دن ختم ہونا پڑتا ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک جتنے بھی انسان بلکہ ذی روح اس دنیا میں آئے ان کو لوٹ کر واپس جانا ہوتا ہے جیسے کہ القران میں بھی ارشاد ہے کہ:

"کُل نفسُ ذائقة الموت" القران

بالکل ایسے ہی ادب کی دنیا کا ایک بڑا نام ۸ ستمبر ۲۰۱۰ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ اور اردو ادب کا ایک عہد تمام ہوا۔ وہ اپنے بارے میں یہ کہہ کر ابدی نیند سو گے۔

"اب تو آرام کریں سو چتی آنکھیں میری

لیکن تمام عمر ہی چلنا پڑا مجھے"

### 2۔ حمایت علی شاعر ایک مختصر تعارف:

اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات نے حضرت انسان کو اس دنیا میں پھول کی طرح بنا کر بھیجا ہے۔ ہر انسان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے تا کہ انسانیت کا بھرم قائم رہے۔ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہوتی ہے جو اس کو مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتی ہے۔ ادیبوں کی سب سے بڑی خوبی ان کے اندر تخلیقی فن ہے جو ان کو ہمیشگی دیتا ہے۔ پروفیسر حمایت علی شاعر اردو ادب کے توانا شاعر تھے۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا قلم نثر، نظم، تحقیق، صحافت اور نغمہ نگاری کے میدان میں برابر چلتا رہا۔ حمایت علی شاعر کی پیدائش ۱۴۔ جولائی 1926ء میں اورنگ آباد انڈیا میں ایک فوجی گھرانے میں ہوئی۔ ان کا پہلا نام حمایت طراب تھا۔ حمایت علی شاعر نے ریڈیائی ڈراموں میں بھی اپنا جوہر دکھایا۔ وہ اداکاری بھی کرتے رہے۔ اس لیے ان کی زندگی کے جس بھی گوشے کو اٹھا کر دیکھا جائے وہ اپنی مثال آپ ہے ان کی پیدائش حیدرآبد دکن میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہی حاصل کی ہے۔ چونکہ زندگی جبر مسلسل کا دوسرا نام ہے۔ حیدر آباد میں زندگی کے اتار چڑھاؤ سے کافی عرصہ کھیلنے کے بعد جب ان کا دل کھٹا پڑا تو ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے اور پھر پاکستان کے ہی ہو کر رہ گے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد حمایت علی شاعر سندھ یونیورسٹی میں درس و تدریس کا کام سرانجام دینے لگے۔ حمایت علی شاعر نے ادب میں مختلف اصناف میں تیر آزمائے۔ مگر شاعری ان کا بنیادی حوالہ ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دنیا میں کئی بھی مشاعرہ ہو حمایت علی شاعر کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی تھی۔ شاعری ان کا بنیادی حوالہ ضرور ہے مگر حمایت علی شاعر نے تنقید اور تحقیق کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ حمایت علی شاعر نے گیت نگاری، اداکاری اور کہانی کاری میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ انسان جب ہوش سنبھالتا ہے تو اس کو کچھ نیا کرنے کا تجسس بے قرار کیے ہوا ہوتا ہے۔ انسان اس وقت تک چین میں نہیں آسکتا جب تک وہ اپنے مقام تک نہ پہنچ سکے۔ حمایت علی شاعر نے اپنے ادبی ورثے میں بہت کچھ چھوڑا ہے۔ ان کی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد اور خاص کر کے ان کی خودنوشت "آئینہ در آئینہ" کو پڑھنے کے بعد قاری صحیح طور پر حمایت علی شاعر کو پہچان لیتا ہے۔ ،، آئینہ در آئینہ ،، منظوم آپ بیتی ہے جس میں تین ہزار سے زائد اشعار ہیں۔ جس نے حمایت علی شاعر کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں حمایت علی شاعر نے ہفت روزہ "نگار" میں بھی اپنی زندگی کی پیچیدگیوں کو بڑے احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔ حمایت علی

شاعر کی کہانی جو دس قسطوں پر مشتمل ہے بعنوان "شاعر کی کہانی شاعر کی زبانی" مسلسل کچھ عرصہ تک "نگار" کی رونق بنی رہی۔ حمایت علی شاعر کا تعلق فلم کی دنیا سے بھی رہا ہے۔ اس لیے وہ فلم سے شغف رکھنے والوں کی دلچسپیوں سے بھی واقف تھے۔ کچھ عرصہ ریڈیو پاکستان کا رخ کیا اور ریڈیو پاکستان کراچی ،، مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا،، کے عنوان سے اپنی یادداشتیں سناتے رہے۔

بچپن میں ہی والدہ کا انتقال حمایت علی شاعر کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ والد نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں نے حمایت علی شاعر کو اتنا پیار دیا کہ سگی ماں بھی اتنا نہ دے سکتی۔ اس حقیقت کو حمایت علی شاعر نے ،، آئینہ در آئینہ ،، میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

"سو مجھ کو میرے مقدر سے زیادہ ملا
جو مہربان ملا مجھ کو دل کشادہ ملا"

حمایت علی شاعر کی زندگی میں ابتدا ہی سے مشکلات کا پہاڑ کھڑا تھا۔ ان مشکلات نے حمایت علی شاعر کو کمزور نہیں بلکہ اندر سے زیادہ مضبوط کیا۔ حمایت علی شاعر نے اپنی ساری زندگی تخلیقی کاموں میں صرف کی ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں "آگ میں پھول"، "مٹی کا قرض"، "ہارون کی آواز"، "چاند کی دھوپ" اور "تشنگی کا سفر تجھ کو معلوم نہیں"، "جاگ اٹھا ہے سارا وطن" منظوم سوانح حیات "آئینہ در آئینہ" "حرف حرف روشنی" اور ایک کلیات بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ "دودِ چراغِ محفل" کے عنوان سے بھی کام کیا ہے۔ جس کا عنوان "عقیدت کا سفر" ہے۔

حمایت علی شاعر نے پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان "پاکستان میں اردو ڈراما" سندھ یونیورسٹی سے مکمل کیا۔ حمایت علی شاعر نے سندھ کے دو اخبارات "جناح" اور "منزل" کے لیے بھی کام کیا۔ سندھ ہی میں "آرژنگ" کے نام سے ایک ثقافتی ادارے کا آغاز بھی کیا۔

**3۔ ادیب سہیل مختصر تعارف:**

ادیب سہیل کا تعلق اردو ادب کے ایسے خاندان سے تھا جس نے ہمیشہ اردو ادب کی خدمت کی ہے۔ ادیب سہیل ایک جاندار فنکار تھے۔ آپ کی پیدائش ۱۸ جون ۱۹۲۷ء کو مونگیر ضلع بہار، برطانوی ہند میں ہوئی۔ ان کا اصل نام سید محمد ظہور الحق تھا۔ تقسیم کے بعد وہ ہجرت کر کے کراچی چلے آئے اور اپنی زندگی کا بقیہ حصہ کراچی میں ہی گزارا۔ ادیب سہیل نے گریجویشن (جامعہ راج شاہی) سے مکمل کی۔ لکھنے کا باقاعدہ آغا کیا تو کچھ عرصے کے لیے ذکی چواروی کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعد میں اپنا قلمی نام ذکی چواروی سے بدل کر ادیب سہیل رکھ لیا اور آج تک سید ظہور الحق ادیب سہیل کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ لکھنے کی ابتداء

۱۹۴۶ء میں افسانہ نگاری سے کی۔ ۱۹۵۴ء میں ایک افسانہ بعنوان ”زخم اور قہقہہ“ لکھا جو میراجی اور اختر الایمان کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے ”خیابان“ میں شائع ہوا۔ ادیب سہیل نے لکھنے لکھانے کا جب باقاعدہ آغاز کیا تو ان کی تحریر جابجا فنون، اوراق، شاہراہ، نقوش، افکار، سیپ، ادبیات، قند، تحریر روشنائی، آئندہ، مکالمہ اور بیاض میں نظر آتی رہتی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں ماہ نامہ سیپ نے کراچی سے ادیب سہیل کی ادبی خدمات پر خصوصی گوشہ شائع کر کے نئے محققین کے لیے راہیں آسان کیں۔ اس کے علاوہ جون ۲۰۰۱ء میں سہ ماہی،، کہکشاں،، کراچی نے بھی ادیب سہیل پر ایک خصوصی گوشہ شائع کیا۔

ادیب سہیل کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ ادیب سہیل ایک خوش قسمت شاعر تھے کہ انھوں نے ایک مختصر وقت میں ادب کے طویل فاصلے طے کر کے اپنا ادبی مقام پیدا کر لیا۔ ادیب سہیل کے قلم سے زیادہ تر شاعری ہی لکھی گئی ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں ”بکھراؤ کا حرف آخر“ ”کچھ ایسی نظمیں ہوتی ہیں“ موسیقی کے موضوع پر بھی ان کی ایک کتاب موجود ہے۔ ادیب سہیل احمد ندیم قاسمی کے جریدے ”فنون“ میں فرہنگ موسیقی کے عنوان سے مسلسل مضامین لکھتے رہے اور ایک منظوم آپ بیتی ”غم زمانہ بھی سہل گزرا“ لکھی۔ ادیب سہیل کی ادبی خدمات پر لکھے گے مقالات میں

(۱) ”ادیب سہیل ایک مطالعہ“ ایم اے کی سطح پر یہ تحقیقی مقالہ ہے جو سندھ یونیورسٹی سے ۲۰۰۰ء میں مکمل ہوا۔ اس مقالے کو لکھنے والی طالبہ فرخندہ جمال ہیں۔ جبکہ نگرانی کے فرائض ڈاکٹر سید جاوید اقبال نے انجام دیے۔

(۲) ادیب سہیل کے ادبی کام پر دوسرا مقالہ بعنوان،، ادیب سہیل: "فن اور شخصیت،، اردو یونیورسٹی کراچی کی طالبہ نے ۲۰۰۲ء میں پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال کی نگرانی میں مکمل کیا۔ اس مقالہ کی تکمیل ربابہ خلیق خان نے کی۔

اس کے علاوہ سہیل مختلف رسائل کی ادارت بھی کرتے رہے جن میں روزنامہ ”پاسبان اے ڈھاکا“ ماہ نامہ افکار کراچی، ماہ نامہ ”قومی زبان“ کراچی شامل ہیں۔ پاکستان ریلوے میں بطور اکاؤنٹس ملازمت بھی کی۔ اس کے علاوہ مختلف ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں حصّہ لیتے رہے۔ ٹیلی وژن میں بحثیت محقق و مسودہ نویس بھی کام کرتے رہے، ریڈیو پاکستان، راولپنڈی کے لیے ایک سال ہفتہ وار پروگرام "ساز کہتے ہیں“ لکھا۔ ریڈیو پاکستان، کراچی کے لیے کئی سیریل لکھے اور نغمہ نگاری بھی کرتے رہے۔ یوں ایک وسیع مطالعہ رکھنے والے اور اردو ادب کی خوب خدمت کرنے والے ادیب سہیل کی زندگی کا سورج اپنی گردش مکمل کرنے کے بعد ۸ مارچ

۲۰۱۷ء کو کراچی میں ایسا ڈھلا کہ پھر نہ آیا۔ ہاں! ایک بات ضرور ہے کہ ان کا ادبی سرمایہ ان کو ہمیشہ زندہ رکھے ہوئے ہے۔ رہتی دنیا تک ادیب سہیل کا نام ادبی محفلوں میں یاد رکھا جائے گا۔

# حوالہ جات


۱۔ محمد طفیل، ''تصریحات''، نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء ص، ۷۰۔

۲۔ صبیحہ انور، ڈاکٹر ''اردو میں خود نوشت سوانح حیات'' نامی پریس، لکھنو، ۱۹۸۲ء، ص، ۱۹

۳۔ مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغِ اردو، لاہور ۱۹۶۴ء ص، ۷۵۔

۴۔ ریحانہ خانم، آپ بیتی کیا ہے (مضمون)، مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور ۱۹۶۴ء ص، ۹۶۔

۵۔ یوسف جمال، انصاری ''آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں'' (مضمون)، مشمولہ نقوش آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو لاہور ۱۹۶۴ص ۷۰

۶۔ ایضاً، ص ۷۰۔

۷۔ ایضاً، ص ۷۰۔

۸۔ سید عبداللہ،، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، مکتبہ خیابان ادب، لاہور ۱۹۷۷ء ص ۲۹۲۔

۹۔ ندیم احمد، ڈاکٹر، ''بیسویں صدی میں خود نوشت سوانح عمری''، مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء ص ۸۶۔

۱۰۔ ریحانہ خانم، آپ بیتی کیا ہے؟ (مضمون)، مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء ص ۸۷۔

۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور ص، ۶۲۴۔

۱۲۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات (ترمیم و اضافہ جات کے ساتھ) نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۱۶ء ص، ۱۰۴

۱۳۔ ''ماہ نور'' اشاعت خاص اکتوبر ۱۹۶۴ء

۱۴۔ بحوالہ: محمود زکی کی ''کالی داس ایک مطالعہ'' ص، ۴۴

۱۵۔ عارف نقوی، منظوم ڈرامے کی روایت، پبلی کیشن ڈویژن، سافت وئیر ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ، ۲۰۰۱ء ص، ۳۴

۱۶۔ اردو لغت (تاریخی اصولوں پر) جلد چہارم، اردو لغت بورڈ، کراچی، ص، ۳۹۹۔

۱۷۔ ابوالاعجاز صدیقی، اصنافِ ادب، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۲، ص، ۱۴۵

۱۸۔ امیر خسرو، کلیات ہندی امیر خسرو، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، ۲۰۱۷ء، ص، ۳۳

۱۹۔ شمیم احمد، اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، ص، ۱۸۳.

۲۰۔ مومن خان مومن، کلیاتِ مومن، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸، ص، ۳۳۳

۲۱۔ فرمان فتح پوری ڈاکٹر، اردو کی منظوم داستانیں، انجمن ترقی اردو پاکستان ۲۰۰۲ء ص، ۱۷

۲۲۔ عارف نقوی، منظوم ڈرامے کی روایت، پبلی کیشن ڈویژن سافٹ وئیر ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۰۱ء، ص، ۴۱

۲۳۔ ایضاً ص، ۴۳

۲۴۔ ایضاً ص، ۴۴

۲۵۔ ایضاً ص، ۴۵

۲۶۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیلاب پرنٹرز گوالمنڈی، راولپنڈی، ۲۰۱۶ء ص ۱۸۱

۲۷۔ ادارہ مترجمین، المنجد، (عربی۔اردو) کراچی، دار الاشاعت، ۱۹۷۴ء، ص ۱۱۴۵

۲۸۔ سید احمد دہلوی مولوی، فرہنگ آصفیہ، جلد سوم و چہارم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور (۱۹۸۶)) ۱۹۸۵)ء، ص ۶۳۷

۲۹۔ عنوان چشتی ڈاکٹر، اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے، انجمن ترقی اردو، دلی، ۱۹۷۵ء ص ۱۵

۳۰۔ شمیم احمد، اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص، ۱۴

۳۱۔ گوپی چند نارنگ، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص، ۸۱

۳۲۔ ادبی تنقید کے اصول، کلیم الدین احمد، پروفیسر، کے جی سیدین میموریل ٹرسٹ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1983ء، ص ۶۰

۳۳۔ اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے "عنوان چشتی، ڈاکٹر، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۷۵ء، ص ۵۹

۳۴۔ محمد راؤف، روسی ہیئت پسندی، نظریات، بنیادیں اور جہات، مشمولہ، الحمد، (اسلام آباد: شعبہ اردو، الحمد اسلامک یونیورسٹی، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۵ء) شمارہ ۴، ص ۴۴

۳۵۔ شمیم احمد، اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص، ۱۴

۳۶۔ جابر علی سید، تنقید و تحقیق، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۸۷ء، ص، ۷۵

۳۷۔ حسن محمد، ڈاکٹر، ہیئتی تنقید، کاروانِ ادب، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص، ۲۵

۳۸۔ ایضاً، ص، ۸۲

۳۹۔ ایضاً، ص، ۹۴، ۹۳

۴۰۔ ارشد محمود، ناشاد، ڈاکٹر، اردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر، مجلس ترقی ادب، لاہور، اگست، ۲۰۰۸ء، ص، ۲۸

۴۱۔ ایضاً، ص، ۲۹

۴۲۔ سیدہ، محسنہ، نقوی، پروفیسر، ڈاکٹر، اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر و روایت (منتخب مقالات) رضا پرنٹرز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء، ص، ۱۰۳

۴۳۔ ایضاً ص، ۹۲

۴۴۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، زبان، اسلوب اور اسلوبیات، بھٹو پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۶۶

۴۵۔ ایضاً، ص، ۱۶۶

۴۶۔ ایضاً، ص، ۱۶۶

۴۷۔ ایضاً، ص، ۱۶۶

۴۸۔ ایضاً، ص، ۱۶۶

۴۹۔ سیدہ، محسنہ، نقوی، پروفیسر، ڈاکٹر، اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر و روایت (منتخب مقالات) رضا پرنٹرز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء، ص، ۱۰۰

۵۰۔ قاسم یعقوب، اردو میں اسلوب اور اسلوبیات کے بنیادی مباحث (منتخب مقالات)، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۱۷، ص ۱۰۶

۵۱۔ قاسم یعقوب، اردو میں اسلوب اور اسلوبیات کے بنیادی مباحث (منتخب مقالات)، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۹۱

۵۲۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، زبان، اسلوب اور اسلوبیات، بھٹو پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص، ۱۷۶

۵۳۔ سوزن بیسنٹ، ترجمہ، توحید احمد، تقابلی ادب ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵، ص، ۵

۵۴۔ ایضاً، ص، ۵، ۴

۵۵۔ ابو الاعجاز، صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، سن ندارد، ص ۱۸۸

باب دوم

## "آدھی صدی کے بعد" کا ہیئتی و اسلوبی مطالعہ

### الف۔ "آدھی صدی کے بعد" کا ہیئتی مطالعہ:

تحریر ایک فن ہے اور اس فن کی خوبی یہ ہے کہ ہم کوسوں دور ہونے کے باوجود بھی اپنے جذبات دوسروں تک بڑی عمدگی کیساتھ پہنچاسکتے ہیں۔ ادیب آزاد خیال ہوتا ہے اور اسے جو چیز اچھی لگتی ہے وہ اس کا اظہار تحریری شکل میں کرتا ہے۔ جب ادیب اپنے جذبات کا اظہار تحریری شکل میں کرتا ہے تو تخلیق ہونے والی چیز کی وہ شکل کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے جس سے اس کی تخلیق کی تہہ تک جانا قاری کے لیے آسان ہوتا ہے۔ اس ظاہری شکل وصورت کو ہئیت کہتے ہیں۔ ہیت ایک طریقہ کار ہے جس کے ذریعے مصنف قاری تک اپنے جذبات کو بڑی آسانی کے ساتھ منتقل کر سکتا ہے۔ ہیت ایک ایسا ذریعہ ہے جو قاری اور ادیب کے درمیان پل کا کردار ادا کرتا ہے۔ قاری جب کسی ہیئتی فن پارے کو پڑھے گا تو اس کو سمجھنے کے بعد اس ہئیتی فن پارے کے بارے میں اپنی رائے قائم کر سکے گا۔ ہئیت ایک خاص قسم کے طرز اظہار کا نام ہے۔ جس کی اپنی ایک صورت ہوتی ہے۔ جس کی بنا پر وہ پہچانا جاتا ہے۔ مثلاً اگر غزل کی بات کریں تو ہم غزل کے لوازمات کو دیکھیں گے پھر جا کر اس کو غزل کا نام دیں گے۔ غزل کی پہچان کے لیے قافیہ، ردیف، مطلع، مقطع اور اشعار کی تعداد کا اندازہ لگانے کے بعد غزل کو غزل کہیں گے۔ اگر ان لوازمات میں سے ایک بھی شامل نہیں ہوتا تو غزل کو غزل نہیں کہا جاسکتا۔ بالکل ایسے ہی مثنوی کی ہئیت کی بات کی جائے تو اس میں بھی دیکھا جائے گا کہ مثنوی کے ہر شعر کا الگ قافیہ ہو گا۔ نظم کو تب ہی نظم کہَ سکتے ہیں جب وہ اپنے لوازمات پورے کر رہی ہو گی۔ جب اس میں مسلسل ایک ہی خیال کو بیان کیا گیا ہو گا۔ المختصر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر شعری ہئیت اپنی قابل شناخت صورت ضرور رکھتی ہے۔ جس کو دیکھتے ہی پتا چل جاتا ہے کہ یہ فلاں فن پارے کی ہئیت ہے۔ ہئیت کے حوالے سے اہل علم کے درمیان اختلافات پایا جاتا ہے۔ اہل علم نے ہئیت کے دائرے میں تکنیک، آہنگ، لفظیات، اور اس کے علاوہ بہت سے محسنات کلام کو شامل کر کے اسے مشکل بنادیا ہے۔K.P.Ker کے خیال کے مطابق:

"اہل علم نے ہیت کو خطرناک حد تک قابل گرفت اصطلاح بنادیا ہے"[1]

ہئیت ایک سانچا ہے۔ جس میں ادیب خود کو ڈال کر اپنے جذبات کا ظہار کرتا ہے۔ جب کسی ادیب کے دماغ میں کوئی خیال آتا ہے تو وہ خیال اپنی تحریری شکل چاہتا ہے۔ جب کوئی ادیب اس خیال کو کوئی شکل دیتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی ہئیت ہوتی ہے۔ ادیب یا فن کار اسی ہئیت کے وسیلے سے ہی اپنی بات دوسروں تک آسانی کے ساتھ پہنچا سکتا ہے۔ ہئیت اور مواد، اسلوب اور معنی کی اصطلاحیں قدیم دور سے ادبی تنقید کا حصہ ہیں۔ اکثر ان اصطلاحوں کو ایک دوسرے کی ضد کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ اس کے علاوہ ان ہئیتوں کی تنقید کو معنی پر مبنی تنقید سے جدا کر کے دیکھنے کی کوشش بھی کی جاتی رہی ہے۔ ہئیت پرست تنقید نگاروں نے اپنا سلسلہ عہد قدیم کے بڑے نام ارسطو سے جوڑنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مگر ارسطو ہیئتی تنقید کے معاملے میں افلاطوں سے متاثر نظر آتا ہے۔ احساسِ جمال کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ تاریخ کی ابتداء سے اور تہذیب کے سامنے آنے سے بہت پہلے انسان نے ہمیشہ فطرت کو اپنا مقصد جانا ہے۔ انسان نے قدرت کے نظاروں دریا ، جنگلوں، پہاڑوں، چشموں یا اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی الٹی سیدھی لکیروں سے لذت لیتا رہا ہو گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے ذہن میں کچھ ایسے سوالات بھی اُمڈے ہوں کہ اس غیر تربیت یافتہ ذہن میں ایک مخصوص شے کِس لیے خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ خیر وہ فلسفہ جمالیات ہو یا تنقیدی احساس ان دونوں کی ابتدائی صورتیں انسان کے پہلے تہذیبی دور میں سوالیہ نشانوں کی صورتوں میں پوشیدہ ہیں۔ اگر تنقید آور تخلیق کی بات کریں تو ان کی الگ الگ ذاتیں ہیں۔ اور تخلیق کو ہمیشہ تنقید پر اولیت دی گئی۔ اسکارٹ جیمس کے مطابق:

> ''اسکارٹ جیمس نے تخلیقی فن کار کو ایک ایسے انجنئیر سے تشبیہ دی ہے
> جس نے جنگل اور پہاڑ کاٹ کر سڑک نکالی ہو''[۲]

وزیر آغا اردو ادب میں ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کی ہر صنف کو آزمایا ہے۔ وزیر آغا کی نظم کا مطالعہ کریں یا نثر دیکھیں وہ ہر میدان میں کامل ادیب کی خصوصیات سے مالا مال نظر آتے ہیں۔ وزیر آغا نے پابند نظم، آزاد نظم، نظم مصریٰ کو بھی خوب برتا ہے۔ وزیر آغا نے نظم کو اپنا ذریعہ اظہار بنا کر کئی فکری گھتیاں سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ثقافتی و معاشرتی نقوش اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ نظم کی ہیئت میں اپنا ایک الگ مقام پیدا کیا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں ہے کہ آزاد نظم کی کوئی مقررہ ہیئت نہیں ہے۔ ہئیت کا تعلق تخلیق شدہ اصناف کے داخلی اور خارجی رویہ سے ہے۔ شاعری میں ہیئت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل شاعر اپنے خیالات کا ظہار چاہتا ہے۔ وہ اظہار کسی نہ کسی ہیئتی صورت میں

ہی ممکن ہے۔ بعض اوقات لوگ صنف اور ہئیت کو ایک دوسرے کے متبادل استعمال کرتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے۔ صنف ایک وسیع دائرے کا نام ہے۔ جبکہ ہئیت کا دائرہ کم ہے۔ اگر بات کی جائے نظم کی تو نظم ایک صنف ہے۔ جبکہ مخمس، مسدس، ہائیکو وغیرہ شعری ہیتیں ہیں جن کی ہیت کو دیکھنے کے بعد ہم اس نقطے پر پہنچتے ہیں کہ یہ کیا ہیں۔ یہاں وزیر آغا کی نظم اور منظوم آپ بیتی " آدھی صدی کے بعد "کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ " آدھی صدی کے بعد " اپنی ہیئت کے اعتبار سے آزاد نظم ہے۔ ہئیتی اعتبار سے مواد اپنی ہئیت خود لے کر آتا ہے۔ اور وہ مواد پہلے اپنی ہیئت کا تعین کرتا ہے پھر اظہار کا ذریعہ بنتا ہے۔ وزیر آغا کی اس منظوم آپ بیتی نے بھی کچھ ایسا ہی کیا ہے۔ وہ اپنی ہیئت کو خود لے کر آئی ہے۔ اس نظم میں خیالات کا ایک تسلسل ہے جو مل کر ایک منظوم آپ بیتی کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ وزیر آغا کی اس نظم کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے بعض مصرعے ایک ایک لفظ پر مشتمل ہیں۔ مثلاً۔۔۔۔۔۔ اترے، تازہ، روٹیاں، آواز، پھول، سمندر، یلغار، دانے، پٹاخے وغیرہ۔ یہ وزیر آغا کی نظم " آدھی صدی کے بعد " کی ہیئتی خوبی ہے۔ ان کا ایک ایک مصرع جو ایک ایک لفظ پر مشتمل ہے وہ اس نظم کی ہئیت میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اور پچھلے واقعے کو اگلے واقعے کے ساتھ بڑی عمدگی سے ساتھ جوڑتا ہے۔ اور ان مختصر مصرعوں میں بڑے گہرے مفاہیم پنہاں ہوتے ہیں۔ وزیر آغا کی طویل نظم "آدھی صدی کے بعد" کی ہیتی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے پہلے آزاد نظم کی روایت پر بحث ضروری ہے۔

اس تعریف کی روشنی میں تخلیق سے مراد کوئی فن پارہ ہے۔ جب کوئی فن پارہ تخلیق ہو کر سامنے آتا ہے تو اس کی کی کوئی نہ کوئی ہیئت ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ پہچانا جاتا ہے۔

۱۔ فیروز اللغات کے مطابق ہئیت سے مراد ہے:

"بناوت، ساخت، صورت، شکل، حالت، کیفیت، طور، طریق، ۱۵۲۸ء "[۳]

فیروز اللغات میں ہیئت واحد ہے جبکہ ہئیت کی جمع ہئیات ہے۔

۲۔ وارث سرہندی ایم اے کی علمی اردو لغت میں ہئیت کے درج ذیل معانی بیان ہوئے ہیں۔

"بناوٹ، ساخت، صورت، شکل، حالت، کیفیت، طور 'طریق، وغیرہ ۱۱۷۰ء "[۴]

۳۔ جہانگیر اردو لغت میں ہیئت کے جو معانی بتائے گے ہیں۔

"خاکہ، نقشہ، بناوت، ساخت، صورت، کیفیت، جمعیت وغیرہ۔ "[۵]

ایڈوانس اردو لغت کے مطابق ہیئت کے معانی:

ا "صورت، شکل، چہرہ مہرہ۔

۲۔ ڈول، ساخت، بناوٹ، دھج۔

۳۔ حالت، حال، کیفیت، ڈھنگ، طور، طریق۔"[۱۷]

۴۔ ہیئت ایک قسم کا علم ہے جس میں اجرام فلکی سے متعلق جانا جاتا ہے۔

کچھ لغات کو چھاننے کے بعد ہیئت کے معانی ظاہری صورت، بناوٹ، ترتیب اور تشکیل کے سامنے آتے ہیں۔ کوئی بھی فن ظاہری صورت کے علاوہ کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ہیئت ہی ہے جو کسی فن پارے کو نام دیتی ہے۔ ادب کے جتنے بھی فن پارے ہیں وہ ایک مخصوص نام کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہیئت اپنے نام کی ہی وجہ سے باقی فن پاروں سے مختلف نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر مثنوی کو ہی لیجئے مثنوی اپنے فنی لوازمات کی بنا پر پر مثنوی کہلائے گی۔ یعنی مثنوی میں شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم ردیف ہوں گے۔ اس کے علاوہ مثنوی ایک طویل نظم ہوتی ہے، جس میں طویل قصوں، داستانوں اور جنگوں کے واقعات کو نظم کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔ ان لوازمات کی بنا پر ہم مثنوی کو مثنوی کہیں گے۔ یہ سارے لوازمات مل کر مثنوی کی ہیئت کو ترتیب دیتے ہیں۔ ایک قاری مثنوی کی ہیئت کو دیکھ کر یہ بتانے کے قابل ہو جاتا ہے کہ یہ مثنوی ہے۔ کسی بھی فن پارے کی ہیئت اس کو ایک الگ مقام دیتی ہے۔ ڈرامے کی ہیئت بھی کچھ تقاضے رکھتی ہے۔ ڈرامے کی ہیئت میں مکالموں کے ذریعے کہانی کا تانا بانا بُنا جاتا ہے اور کرداروں کو ایکشن کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ساری چیزیں مل کر ڈرامے کی ہیئت میں کارگر ثابت ہوتی ہیں۔ پھر اگر اردو شاعری کی آبرو غزل کی بات کریں تو غزل ایک خاص ترتیب سے وجود میں آتی ہے۔ ایک اچھی غزل کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس کا پہلا شعر مطلع ہو یعنی پہلے اور دوسرے مصرعے میں قافیہ اور ردیف ایک دوسرے جیسا ہو۔ پھر دوسرے تیسرے حتیٰ کہ آخری شعر میں بھی اگر دیکھیں تو یہ شعر کے دوسرے مصرعے کا قافیہ پہلے مکمل شعر سے ملتا ہو۔ پھر غزل کا آخری شعر مقطع ہو۔ یہ ساری چیزیں ملتی ہیں تو ایک غزل کی ہیئت کو ترتیب دیتی ہیں۔

المختصر کہ ہر صنف ادب کی ایک مخصوص ہیئت ہوتی ہے جو اس کو دوسری اصناف سے ممتاز کرتی ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی اس حوالے سے بیان کرتے ہیں:

”ہر فن کار زندگی کا نقشہ ایک خاص طریقہ پر ایک خاص شکل میں پیش کرتا ہے۔بغیر کسی مخصوص شکل یا طریقے کے زندگی کا نقشہ کھینچ ہی نہیں سکتا۔“[۷]

کسی بھی ہیئت کی تخلیق کے بعد اس ہیئت کے اندر لکھنے والے کی شخصیت بھی نظر آتی ہے۔ کیونکہ ہئیت اور اسلوب کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ اسلوب کسی بھی فن کار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر ایک ہیئت کی الگ پہچان ہوتی ہے۔ یعنی جب کوئی چیز تخلیق ہو کر سامنے آتی ہے تو نقادوں کے لیے بہت سے سوالات بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ یعنی وہ کون سا طرز اظہار تھا جس کو فنکار نے اپنایا ہے۔ شعری ہیئتیں ہوں یا پھر نثری ان میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ یہ ہیئتیں معمولی سی تبدیلیوں کی وجہ سے اپنا الگ مقام حاصل کر لیتی ہیں۔ جب ہم ہیئت کے حوالے سے تحقیق کرنا شروع کرتے ہیں تو ابتدا میں صنف اور ہیئت کی بحث میں پھنس جاتے ہیں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ صنف کا تعلق کسی فن پارے کے مواد اور موضوع سے منسلک ہوتا ہے۔ جبکہ اس مواد اور موضوع کو جب ترتیب دے کر کوئی ادبی صنف تخلیق کی جاتی ہے تو اس صنف کی ظاہری شکل و صورت ہیئت کہلاتی ہے۔ بعض ادبی اصناف ایسی ہیں جو ایک ساتھ صنف بھی ہوتی ہیں اور ہیئت بھی۔ مثلاً غزل کی بات کی جائے تو غزل اپنے فنی لوازمات کو جب پورا کرتی ہے تو وہ غزل کہلاتی ہے۔ یہ بیک وقت صنف بھی ہے اور ہیئت بھی جبکہ نظم میں ایسی بات نہیں ہے۔ نظم اپنی خاص ہیئت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ شمیم احمد صنف اور ہیئت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”شعری ہیئتوں کی شناخت کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے اس لیے کہ ان کی شناخت بہت حد تک ظاہری صورت سے متعلق ہوتی ہے۔ لیکن صنف سخن کی شناخت میں تھوڑی بہت پیچیدگی ضرور ہے کیونکہ بعض اصناف کی پہچان ہیئتی اصولوں پر منحصر ہوتی ہے جبکہ بعض اپنے موضوع کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں اور بعض دونوں میں اپنی شناخت کا انحصار کرتی ہیں۔ بعض اصناف ایسی ہیں جو اپنے وزن ہی کی وجہ سے اپنی صنفی شناخت قائم کرتی ہیں۔“[۸]

انگریزی میں ہیئت کا لفظ (Form) اور صنف دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ مغربی تنقید نگاروں کے ہاں یہ لفظ (Form) اور ہیئت دونوں طرح سے ملتا ہے۔ جیسا کی پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اصطلاحی معنی و مفہوم کے حوالے سے ہیئت (Form) اور صنف ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ صنف کا تعلق کسی بھی تخلیق

شدہ چیز کے مواد سے ہے۔ جبکہ ہیئت سے مراد اس مواد کے ذریعے تخلیق شدہ فن پارہ ہے۔ اردو ادب میں بہت کم ایسا ہے کہ کوئی صنف بیک وقت ہیئت بھی ہو اور صنف بھی۔ ہاں! اردو غزل میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں صنف بھی ہے اور ہیئت بھی۔ جب غزل کی ہیئت کا مطالعہ کرتے ہیں تو پھر ایک بات جو آشکار ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ غزل ہیئت ہے صنف نہیں۔ کیوں کہ غزل کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں اس کی ظاہری شکل آنا شروع ہو جاتی ہے اور اس کی ہیئتی خد و حال مثلاً قافیہ، ردیف، مطلع، مقطع وغیرہ ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ شمیم احمد کے مطابق

"غزل ایک ہیئتی صنف ہے"[۹۹]

چوں کہ پسِ نظر تحقیقی مقالے میں اردو ادب کی تین منظوم آپ بیتیوں کا مطالعہ شامل ہے جو ہیئت اور اسلوب پر مشتمل ہے۔ اس لیے ہیئت اور اسلوب دونوں کو بیان کرنا ضروری امر ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں شامل آپ بیتیوں میں "آدھی صدی کے بعد" "غم زمانہ بھی سہل گزرا" کی ہیئت آزاد نظم کی سی ہے جبکہ "آئینہ در آئینہ" جو حمایت علی شاعر کی بہترین منظوم آپ بیتی ہے۔ آپ بیتی، مثنوی کی شکل ہے۔ اس لیے پہلی دو آپ بیتیوں کا اسلوبی مطالعہ کرنے سے پہلے یہ دونوں آپ بیتیاں جس ہیئت میں لکھی گئی ہیں یعنی آزاد نظم کی ہیت میں لکھی گئی ہیں تو پہلے آزاد نظم کی مختصر روایت اور نظم کی بدلتی ہوئی حالتوں کو زیر بحث لایا جائے گا۔

نظم کے معنی ترتیب دینا، تنظیم کرنا ہے۔ ہر نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کو شاعر اپنے ذہن میں رکھ کر نظم تخلیق کرتا ہے۔ نظم میں موضوعات کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اردو ادب میں ہر طرح کے موضوع پر نظم لکھی جا چکی ہے۔ اردو ادب میں نظیر اکبر آبادی نظم کا ایک بڑا حوالہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کا نام بھی نظم کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا نام بھی نظم کے شعراء میں آتا ہے۔ نظم کے قبیلے سے تعلق رکھنے والوں میں حفیظ جالندھری، احسان دانش، اختر شیرانی، فیض احمد فیض، مجید امجد ن ۔ م راشد اور میراجی جیسے لوگ شامل ہیں۔ ان تمام لوگوں نے نظم کو خوب چمکایا ہے۔ ان کی وجہ سے اردو نظم نے خوب فروغ پایا ہے۔ ان تمام شعرا نے مختلف ہیئت پر نظمیں قلم بند کی ہیں۔ نظم کے ابتدائی دور کی اگر بات کریں تو ابتدائی دور میں پابند نظم کا رواج عام تھا۔ مگر نئے لکھنے والوں کا رجحان بہت کم تھا۔ اس طلسم کو ن۔ م راشد نے توڑا اور ان کا ساتھ میراجی نے دیا ہے تو آزاد نظم وجود میں آئی ہے۔ آزاد نظم کے ابتدائی تجربہ کاروں میں ن۔ م راشد اور میراجی کے نام

سر فہرست ہیں۔ اس کے بعد مجید امجد اور دیگر شعراء نے بھی آزاد نظم کی طرف توجہ دی اور آزاد نظم لکھ کر اس کام کو مزید تقویت پہنچائی۔ اردو میں آزاد نظم مغربی اثرات کے تحت آئی ہے۔ اس بات کی تائید کرتے ہوئے ڈاکٹر عنوان چشتی لکھتے ہیں:

"فرانس کی ،،ورس لبرا،، انگریزی شاعری-"Free Verse" اور اردو میں آزاد نظم کہلاتی ہے۔"[۱۰]

اس بات کو مزید واضح کرنے کے لیے شمیم احمد لکھتے ہیں:

"آزاد نظم کی ہیئت کے لیے فرانسیسی میں "ورس لبرا،، کی اصطلاح مروج ہے۔ انگریزی میں اس کو Free Verse کہا جاتا ہے اور ہم نے تراجم کا سہارا لیتے ہوئے انگریزی لفظ Free Verse کا ترجمہ کر کے اس صنف کو آزاد نظم کا نام دیا ہے"[۱۱]

خاطر غزنوی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"آزاد نظم فرانس کی پیداوار ہے وہاں آزاد نظم ویر لبرے کے نام سے موسوم ہے اور اس کو اس کو ایجاد کرنے والا شاعر لافورگ ہے۔ انگریزی میں اس کو Free Verse کہتے ہیں جبکہ اردو میں یہ آزاد نظم ہے"[۱۲]

ان تمام لوگوں کو آرا سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ آزاد نظم کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ آزاد نظم کی داغ بیل ڈالنے میں فرانس کے ساتھ ساتھ امریکہ اور انگلستان کے نام بھی شامل ہیں۔ دراصل آزاد نظم امریکہ اور فرانس کے خاص ثقافتی ماحول کی تخلیق ہے۔ جہاں مذہب کی اقدار دم توڑ رہی تھیں اور انسان ترقی کر کے موت کے قریب ہو رہا تھا۔ انسان نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ اس کی جگہ مشین نے لے لی تھی۔ یک دم صعنتی ماحول کی چکاچوند کے خلاف اعلان بغاوت کے لیے شاعروں نے آزاد نظم کا سہارا لیا اور اپنے جذبات لکھ ڈالے۔ یہ وہی حادثات تھے جو یورپ میں انسانیت کے ساتھ رونما ہو رہے تھے۔ جب آزاد نظم برصغیر پاک وہند میں آئی تو اس نظم نے یہاں کے مظلوموں کو بھی اپنے جذبات کے اظہار کا موقع فراہم کیا۔ ڈاکٹر محمد حسن آزاد نظم کے تخلیق میں آنے کے متعلق لکھتے ہیں:

"آزاد نظم کا عروج اسی دور میں ہوا جب شاعر کاوش اور سماجی قید سے بچ کے لاشعور کی آزادی اور انفرادیت کی ساری گھٹن اور شکست خوردگی کو کاغذ پر

اس بے ترتیبی کی حالت میں انڈیل دینا چاہتا تھا۔ اور آزاد نظم نے کسی حد تک
اس خواہش کو پورا کیا۔ اس دور کی آزاد نظم عام طور پر اس قسم کے غیر سماجی
جذبات کا آئینہ بنی رہی گو کہ بعد میں کچھ ایسی آوازیں بھی پیدا ہوئی جن میں
سماجی آہنگ موجود تھا"[۱۳]

مطالعے سے جو بات آشکار ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آزاد نظم کا ماخذ مغرب ہے۔ جب آزاد نظم یورپ سے سفر کرتی ہوئی برصغیر پہنچی تو وہ اپنے ساتھ اپنے موضوعات بھی لے آئی۔ اور لکھنے والوں کو مجبور کیا کہ تم ایسے موضوعات پر لکھو جن کو شعراء بھول گئے تھے۔ اس طرح آزاد نظم نے برصغیر کی تہذیب و ثقافت کو اجاگر کرنے کا موقع فراہم کیا۔

Free Verse اور آزاد نظم میں ایک فرق واضح دکھائی دیتا ہے۔ انگریزی میں آزاد نظم نے پرانے قواعد وضوابط کی نفی کرتے ہوئے آوازوں کے اتار چڑھاؤ کے اصولوں کو اپنایا ہے۔ لہجے اور ترتیب کا لحاظ بھی دیکھا گیا۔ جبکہ اردو میں آزاد نظم کے لیے ایسا کوئی اصول نہیں ہے۔ اردو میں آزاد نظم آزاد ہونے کے باوجود بھی کچھ پابندیوں کو شکار ہے۔ اردو میں آزاد نظم بحر کے متعلق تو آزاد ہے مگر وزن کی پابندی پھر بھی ضروری ہے۔

اس خیال کو شمیم احمد کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ہماری آزاد نظم عروضی پابندیوں سے قطع انحراف نہیں کرتی اردو کی آزاد
نظمیں کسی حد تک بحر اور اس کے وزن کی پابند ہوتی ہیں۔ صرف اتنا ہے کہ
کہیں کہیں وزن کے ارکان کسی مصرعے میں زیادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے
وہ مصرع طوالت اختیار کر جاتا ہے۔ اور کسی مصرعے میں ارکان کم ہوتے
ہیں جس کی وجہ سے مصرع مختصر ہو جاتا ہے"[۱۴]

اس بحث کو واضح کرنے کے لیے یہاں ن۔ م راشد کی ایک آزاد نظم درج کرنا ضروری امر ہے۔

"زندگی سے ڈرتے ہو"

زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی تو تم بھی ہو، زندگی تو ہم بھی ہیں
آدمی سے ڈرتے ہو؟

آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں۔

آدمی زبان بھی ہے، آدمی بیان بھی ہے

اس سے تم نہیں ڈرتے

حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آئین سے، آدمی ہے وابستہ

آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ

اس سے تم نہیں ڈرتے؟

ان کہی سے ڈرتے ہو؟

جو ابھی نہیں آئی، اس گھڑی سے ڈرتے ہو؟

اس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو

(ن۔م راشد)

صدیق کلیم بھی اردو آزاد نظم کے حوالے سے اپنے جذبات کا کچھ یوں اظہار کرتے ہیں:

"اردو میں آزاد نظم کے شعراء کی ہر نظم کسی نہ کسی مروجہ بحر میں ہے صرف ارکان کی تعداد میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے اور آزاد نظم وجود میں آتی ہے"[۱۵]

آزاد نظم کی اس بحث کو مزید طاقتور بنانے کے لیے یہاں تصدق حسین خالد کی ایک نظم پیش کی جارہی ہے۔

"خموشی چھارہی ہے

شام ہے

تاریکیوں کے ہاتھ پھیلتے ہیں

خموشی اور تنہائی

پتنگا دامن میں رنگیں سنبھالے اڑ گیا

ساکت فضاؤں میں

اندھیرے میں

خموشی اور تنہائی

بدن کیوں کانپ اٹھا ہے"

جس طرح کائنات کی تمام اشیاء تبدیلی چاہتی ہیں وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ یہ چیزیں اپنے روپ بدلتی ہیں بالکل ایسے ہی ادب میں بھی ہر دور میں ہر صنف نے ایک نیا انداز اپنایا ہے۔ چونکہ لکھنے والوں کا تعلق اس کائنات سے ہے اور جو لکھنے والا ہے وہ کائنات کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور لکھاری اپنے آپ کو اس ماحول میں داخل کر کے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار قلم کے ذریعے کرتا ہے۔ انسان کی سب سے بہترین خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے جد جہد کرتا ہے اور اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے وہ شاعری، مصوری، خطاطی، موسیقی اور فنون لطیفہ کا سہارا لیتا ہے۔ تاریخ کے ورق الٹنے سے پتا چلتا ہے کہ ادبیات عالم میں نثر کا ظہور بعد میں ہوا ہے جبکہ نظم نے پہلے جنم لیا ہے۔ اس لیے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ دیگر ادبیات کی طرح اردو زبان و ادب کی ابتداء بھی شاعری سے ہوئی ہے۔ شاعری نثر کے مقابلے میں زیادہ اثر رکھتی ہے۔ اگر کوئی بات نثری انداز میں کہی جائے تو اس میں روکھا پن محسوس ہوتا ہے جبکہ اسی بات کو اگر شاعری کا لبادہ اوڑھا کر بیان کیا جائے تو وہ بات زیادہ اثر رکھے گی۔ بڑی سے بڑی نثری کتاب وہ اثر نہیں رکھتی جتنا کہ ایک شعر اثر رکھتا ہے۔ شاعر ایک شعر کے ذریعے سے ماضی کا پورا واقع بیان کر دیتا ہے۔ مثلاًعلامہ محمد اقبال ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی"

اس شعر میں ایک ایسے واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکنے کا حکم دیا اور حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینک دیا گیا۔ تب اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور آگ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس واقع کو اگر نثری شکل میں بیان کیا جائے تو اتنا مزہ نہیں دیتا جبکہ اس واقع کو شعری انداز میں بیان کریں تو پڑھتے ہوئے قاری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک اور جگہ شاعر حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے واقعے کو ایک شعر سے یوں بیان کرتا ہے:

"کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی"

شاعر پر قدرت کا ایک خاص کرم ہوتا ہے۔ تب تو اتنے خوبصورت انداز میں اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔ امداد امام اثر اس خیال کو کچھ یوں بیان فرماتے ہیں:

> ''شاعر رضائے الٰہی کی ایک ایسی نقل ہے جو الفاظ یا معنی کے ذریعے ظہور میں آتی ہے۔ رضائے الٰہی سے مراد فطرت اللہ ہے اور فطرت اللہ سے مراد وہی قوانین ہی جہنوں نے حسب مرضی الٰہی نفاذ پایا جاتا ہے اور جن کے مطابق عالم درونی و بیروانی نشوو نما پائے گے۔ اس عالم درونی و بیرونی کی نقل صحیح جو الفاظ کے با معنی کے ذریعے عمل میں آتی ہے وہ شاعری ہے''[١٦]

ایک اچھا شاعر دور بین کی مانند ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کے مختلف زاویوں کو دیکھتا ہے خاص کر کے مناظر فطرت کا بہت شیدا ہوتا ہے۔ شاعری ویسے ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ شعر لکھنے کے لیے خونِ جگر کو خشک کرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر ذہن کی پرتیں کھلتی ہیں اور شعر ادا ہوتا ہے۔ ایک مشہور انگریزی نقاد جانس اپنی خود نوشت میں شاعری کے حوالے سے راقمطراز ہے:

> ''یہ کہنا آسان ہے کہ شاعری کیا نہیں ہے۔ روشنی سے ہم سب واقف ہیں لیکن روشنی کیا ہے یہ بتانا آسان نہیں ہے''[١٧]

نظم اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں مفاہیم اور کیفیت کا مربوط ہونا لازمی امر ہے۔ اس کے علاوہ نظم میں ارتقا اور تسلسل بھی ضروری ہے۔ نظموں میں آزاد نظم تخلیق کرنا بہت مشکل عمل ہے کیونکہ جہاں لفظ نظم کے لیے آزاد استعمال ہوا ہے وہاں نظم نگار کو آزاد نظم لکھتے ہوئے کچھ پابندیوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ آزاد نظموں کے اس مشکل ترین عمل کے حوالے سے ضیاء جالندھری ایک جگہ لکھتا ہے:

> ''آزاد نظم کہنا زیادہ مشکل ہے پابند نظم میں مصرعوں اور قافیوں سے سہارا مل جاتا ہے جبکہ آزاد نظم میں آپ کوئی بات نہیں کہہ سکتے اگر بات کہنے کو نہ ہو تو اس کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ آپ ایک آہنگ پیدا کریں کیونکہ قافیہ اور یکسانیت کی قید نہیں تو یہ ضروری ہے کہ آپ اتنی ہی بات کہیں جتنی ضروری ہو۔''[١٨]

آزاد نظم کی ابتدا کی بات کریں تو اس کے ابتدائی نقوش انیسویں صدی کے آخر میں فرانس سے ملتے ہیں۔ انگریزی ادب میں Free Verse کی ابتداء بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی ہے۔ جب انگریزی ادب

میں فری ورس نے پھیلنا پھولنا شروع کیا تو وہاں سے اس نے اپنے اثرات چھوڑے اور فری ورس کی شاخیں اردو میں آزاد نظم کے بنانے میں کار گر ثابت ہوئیں۔ اردو میں آزاد نظم کے بانیوں میں جو پہلا نام آتا ہے وہ تصدق حسین خالد کا ہے۔ پروفیسر حنیف کیفی اپنی کتاب ''اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم'' میں اس بات کی وضاحت پیش کر چکے ہیں۔ کچھ نقادوں کے خیال میں ن۔ م راشد وہ پہلے نظم نگار ہیں جنھوں نے پابند نظم کے طلسم کو توڑا تھا۔ ہم اس بحث میں پڑے بغیر اس تحقیقی مقالے کے لوازمات کو پورا کریں گے۔ چونکہ اس تحقیقی مقالے کا موضوع ہی کچھ ایسا ہے کی آزاد نظم کا تذکرہ کیے بغیر اس کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس تحقیقی مقالے میں شامل تین منظوم آپ بیتیوں میں دو کا تعلق آزاد نظم کی ہیئت سے ہے جن میں ڈاکٹر وزیر آغا کی منظوم آپ بیتی ''آدھی صدی کے بعد'' اور ادیب سہیل کی منظوم آپ بیتی ''غم زمانہ بھی سہل گیا'' شامل ہیں۔

چونکہ آزاد نظم کی بنیاد ہی آہنگ پر رکھی گئی ہے۔ اس میں کسی خاص بحر کا سالم رکن وزن کا نمائندہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آزاد نظم کی ہیئت ایک مشکل ترین عمل ہے۔ لیکن آزاد نظم کے لکھنے والوں نے اس چیلنج کو بڑی خوش اسلوبی سے قبول کیا ہے اور آزاد نظم کے کامیاب تجربات کیے ہیں۔ تصدق حسین خالد اپنے مجموعے کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''میں اس بات کی پر زور تردید کرتا ہوں ہم آزاد شعراء اس لیے لکھتے ہیں کہ قوافی اور ردیف کی بندشوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے غالباً اس الزام کو لگانے والوں کو یہ علم نہیں کہ آزاد شعر میں اچھی نظم کہنا بہت مشکل ہے اور روایتی طرز میں جہاں قوافی اور ردیف کا سہارا مل جاتا ہے بہت آسان ہے۔''[۱۹]

یہاں آزاد نظم کی چند مثالیں پیش کر کے اس بحث کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۔

''کسی سائے کا نقش گہرا نہیں ہے
ہر اک سایہ اک آنکھ ہے
جس میں عشرت کدوں کا رساخواہشوں
ان کہی دل نشیں داستانوں کا میلہ گھا ہے
مگر آنکھ کا سحر پلکوں کی چلمن کی ہلکی سی جنبش ہے

اور کچھ نہیں ہے
کسی آنکھ کا سحر دائم نہیں ہے"
(منیر نیازی)

***

"اس کا چہرہ اس کے خدو خال یاد آتے ہیں
ایک برہنہ جسم آج تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا رات بھر
جس نے ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے"
(ن۔ م راشد)

۴۔

"یہ آواز جو تم نے ہونٹوں پہ اپنے
سجائی ہوئی ہے
تمھاری صدا، کون جانے، کہاں ہے!
کہاں ہے تمہاری صدا؟
بولتے کیوں نہیں ہو؟"
(وزیر آغا)

درج بالا حوالے دینے کے بعد آزاد نظم کی ہیئت کو جاننے میں مدد ملی ہے۔ آزاد نظم کچھ پابندیوں اور کچھ آزادیوں کے تال میل سے تخلیق شدہ صنف ہے جو اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ آدھی صدی کے بعد وزیر آغا کی بہترین نظموں میں سے ایک نظم ہے۔ یہ نہ صرف ان کی طویل اور بہترین نظم ہے بلکہ اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے تقریباً تمام واقعات کو بتدریج قلم بند کیا ہے۔ اور اس طویل نظم کو منظوم آپ بیتی کا نام دیا ہے۔ اس نظم کی ہیئت بھی آزاد نظم کی طرح ہے۔ جس میں چھوٹے چھوٹے خیال کو بڑے احسن طریقے سے جوڑا گیا ہے۔ طویل نظم لکھنا کوئی آسان بات نہیں ہے بلکہ کئی سالوں کے خیال کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اور وہ

خیالات زماں و مکاں کے حوالے سے اہم ہوتے ہیں۔ کچھ مغربی مفکرین نے طویل نظم کو ناممکن قرار دیا ہے۔ مثلاً کولرج کا خیال ہے:

"طویل نظم نہ تو پورے طور پر شاعرانہ ہو سکتی ہے اور نہ ہی ہونی چاہیے"[۲۰]

ایڈگر ایلن پو طویل نظم کے خیال کو رد کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہم جس چیز کو طویل نظم کہتے ہیں وہ دراصل مختصر نظموں کا سلسلہ ہوتا ہے
یعنی مختلف شاعرانہ تاثرات کا"[۲۱]

دراصل طویل نظمیں اپنے کینوس کے اعتبار سے مختصر نظموں کے مقابلے میں الگ ہوتی ہیں۔ کچھ چھوٹی نظمیں اپنے اندر پورا جہان آباد کیے ہوئے ہوتی ہیں۔ وہ معنی کے اعتبار سے بہت گہری ہوتی ہیں۔ اور جب قاری غور کرتا چلا جاتا ہے اس کے ذہن کی مزید پرتیں ہٹتی جاتی ہیں۔ مگر جب طویل نظم کی بات کرتے ہیں تو بعض اوقات وقت و حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے طویل نظم لکھنا ضروری ہوتا ہے۔

شمس الرحمان فاروقی لکھتے ہیں:

"طویل نظم کے لیے دو طرح کے جواز ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ آپ کے پاس Narative Them ہے، کوئی بیانیہ، کوئی کہانی، کوئی واقع، کوئی Complication واقعہ، رزمیہ کی سطح کا ہو یا پھر کوئی سادہ واقع جیسے "آدھی صدی کے بعد،، یا "آئینہ در آئینہ،، دوسرا یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی آدمی ایسے Theme کا اظہار کرنا چاہے جو Meditative ہو جس میں ذات و کائنات کے بڑے مسائل پر اظہار کرنا مقصود ہو Meditative tone میں"[۲۲]

ڈاکٹر ناصر عباس نئیر کے خیال میں:

"ایک بڑی نظم ساز کی طرح ہوتی ہے۔ جس میں معنی کی متعدد دھنوں کے امکانات مضمر ہوتے ہیں۔ نظم کی گہری ساخت میں معنی کا تعدد کبھی ہم آہنگ ہو کر ایک "مہابیانیے،، کو تشکیل دیتا ہے اور کبھی معنی کی کثرت ایک متن کے اندر ذیلی معنی بیانیوں کی صورت میں ہوتی ہے"[۲۳]

ایک عام طویل نظم لکھنے اور منظوم آپ بیتی لکھنے میں بھی بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک عام طویل نظم میں فنکار اپنے خاص خاص خیالات کو قلم بند کر کے نظم تخلیق کرتا ہے جبکہ منظوم آپ بیتی میں یہ خاص و عام واقعات کا ایک ترتیب کے ساتھ لکھنا ضروری ہوتا۔ اگر منظوم آپ بیتی کے دوران کوئی واقعہ رہ جاتا ہے تو فن کار اپنی تخلیق میں پوری طرح انصاف نہیں برت سکتا۔ "آدھی صدی کے بعد" وزیر آغا کی منظوم آپ بیتی ہے

جس کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری ان کی زندگی کے تو ریباً ہر گوشے سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔" آدھی صدی کے بعد،،وزیر آغا کی ہئیت کے اعتبار سے آزاد نظم کی ہئیت پر لکھی گئی ہے۔اس کی مثال بیان کر کے بحث کو مزید بہتر بنایا جائے گا۔اس طویل نظم میں وقت کو بڑے خوبصورت انداز میں منقسم کیا گیا ہے۔

”شب کا پچھلا پہر
پھڑ پھڑاتے ستارے
گھنی گھاس کی نوک پر آسماں
سے اترتی نمی
اور پورپ کے ماتھے پہ
قشقے کا مدھم نشاں
رات ایک آبنوسی جواں رتھ
شرارے اگلتے ہوئے اسپِ وحشی
کے پلو سے بندھنے کو تیار!
ہلکی ہلکی ہوا
اور میں
اپنے معصوم دل میں
مسرت کی دولت چھپائے
شکستہ سی اک بیل گاڑی میں
خوشبوں میں لپٹی ہوئی چھٹیوں کو
کھلونوں کی صورت
دھڑکتے ہوئے اپنے سینے سے بھینچتے
قلاقند اور شہد ایسے دنوں
رس بھری نرم جامن سی
تازہ رتوں کے لیے
کتنا بے تاب!

اور منتظر!

منتظر اس ہمکتی ہوئی ایک ساعت کا جب

بیل گاڑی

***

میرے گاؤں کی شہ رگ میں

اترے

معاً بیل گاڑی سے میں کود کر

یا بیل کھوئے ہوئے اپنے گھر میں

لپک کر گھسوں

ماں کے سینے سے ٹکراؤں

ہونٹوں کی حیرت سے کھلنے کا

اور پو کے پھٹنے کا منظر

میں دیکھوں

مسرت کی زر تار کرنوں میں

لپٹے ہوئے

نرم بوسوں کی شبنم کو

الجھے ہوئے اپنے بالوں میں

پھر میں ہنسے لگوں!"

المختصر ہیئت کے نقطۂ نظر کے حوالے سے اُردو کے دیگر ادیبوں نے بھی ہیئتی تجربات کیے مگر منظوم خودنوشت کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔

## (ب) ”آدھی صدی کے بعد“ کا اسلوبی مطالعہ:

”آدھی صدی کے بعد،، میں وزیر آغا نے اپنی زندگی کے تقریباً تمام واقعات کو منظوم شکل میں لکھ کر منظوم آپ بیتی لکھنے کا رواج ڈالا۔ ”آدھی صدی کے بعد“ اردو ادب کی پہلی منظوم آپ بیتی ہے جس میں فنکار کی زندگی کے تمام پہلو شامل ہیں۔ اس کا اسلوب قدرے مشکل ہے مگر قاری جب اس منظوم آپ بیتی میں پوری طرح غوطہ زن ہوتا ہے تو پھر وہ وزیر آغا کی زندگی کے مختلف واقعات کو جانے بغیر نہیں رہ سکتا۔

”آدھی صدی کے بعد“ ڈاکٹر وزیر آغا کی زندگی کی بہترین تصویر کشی کرتی ہے۔ اس آپ بیتی میں ادیب کی زندگی کے تلخ واقعات کو بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قانون فطرت ہے کہ ہر شخص اپنی کہانی سنانا چاہتا ہے۔ کچھ لوگ اس کہانی کا اظہار تقریر کے ذریعے کرتے ہیں اور کچھ قلم کا سہارا لے کر واقعات کو کاغذ پر بکھیر دیتے ہیں۔ کاغذ پر بکھرے الفاظ ایک مدت گزر جانے کے بعد بھی اپنی اہمیت قائم رکھتے ہیں ان تحریروں کو پڑھنے کے بعد قاری ماضی کی حسین یادوں میں چلا جاتا ہے اور تخلیق کار اس کے ساتھ عہد بہ عہد سفر بھی کرتا رہتا ہے۔

”آدھی صدی کے بعد“ مختلف ادوار پر پھیلی ہوئی ہے جس میں زندگی کے تمام واقعات و مشاہدات کا بڑی باریکی اور تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ وزیر آغا نے اس آپ بیتی میں بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے واقعات کو بڑی ترتیب کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ وزیر آغا کا بچپن خستہ حالی میں گزرا ہے اور آہستہ آہستہ بہتری کی طرف قدم رکھے گے۔ وزیر آغا نے پہلے پانچ سال کا کوئی واقعہ بیان نہیں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس اندھیر نگری میں جھانکنے کی بہت کوشش کی مگر کہیں کچھ نظر نہیں آیا۔ وزیر آغا نے اپنی اس طویل نظم میں زندگی کو بہت قریب سے دکھایا ہے۔ اور دکھانا بھی چاہیے کیونکہ سب سے بڑا ادب وہی ہے جو زندگی کی شاخ سے پھوٹتا ہے۔ " آدھی صدی کے بعد“ کے بعد کے واقعات کی ترتیب اس خوبصورت انداز میں کی گئی ہے واقعات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ منظر نگاری میں بھی لکھاری نے کوئی فرق نہیں چھوڑا۔ یوں یہ نظم ایک داستان کی ہئیت لگتی ہے۔ اس نظم کے واقعات اس طرح ہیں جیسے کہ ایک عہد خود عمل سے گزر رہا ہے اور اپنی زندگی گزار رہا ہے۔ نظم کے پہلے حصے کی اگر بات کریں تو اس میں ایک بیل گاڑی اور رتھ کا ذکر ملتا ہے۔ رتھ اپنے ساتھ آریا لائے تھے اور وہ کسی ممتا کے متلاشی تھے۔ ان لوگوں نے برصغیر میں زرعی معاشرہ قائم کیا تھا۔ اس طرح اس آپ بیتی کا پہلا حصہ بچے اور ممتا کا ہے۔

”بیل گاڑی

مِرے گاؤں کی گرم شہ رگ میں

اترے

معاً بیل گاڑی سے میں کود کر

یا بیل کھوئے ہوئے اپنے گھر میں

لپک کر گھسوں

ماں کے سینے سے ٹکراؤں

ہونٹوں کی حیرت سے کھلنے کا

اور پو کے پھٹنے کا منظر

میں دیکھوں۔۔۔۔۔۔۔۔“

نظم کے پہلے حصے میں واضح طور پر ایک بچے کا اپنی ماں کی تلاش کا منظر پیش کیا گیا ہے کہ میں کسی بیل گاڑی سے اتر کر اپنی باہیں کھولے ہوئے بھاگ کر اپنی ماں کے سینے سے لگ کر تمام پیار سمیٹ سکوں اور پھر ماں کے ہونٹوں کے کھلنے کا منظر بھی میں دیکھ سکوں۔ پھر میری ماں جب مجھے بوسہ دے تو اس کے نرم ہونٹوں کی کشش بھی میں محسوس کروں اور اپنے الجھے ہوئے بالوں میں شبنم کو میں گرتے محسوس کر سکوں اور پھر میں ہنسنے لگوں۔ اس پورے واقعے میں ماں اور بچے کے پیار کو بڑی عمدگی کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ اور اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے یوں لگتا ہے میں خود ماضی کا حصہ ہوں اور یہ سب کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ ”آدھی صدی کے بعد“ وزیر آغا کی طویل نظم ہے۔ طویل نظم کے حوالے سے رفیق سندیلوی کا خیال ہے:

> ”طویل نظم میں خیال یا مواد کو ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرنے کے لیے ایک وسیع و عریض جنگل کی ضرورت ہوتی ہے ظاہری بات ہے کہ ہرن کو دوڑنے کے لیے ایک وسیع و عریض جنگل درکار ہوتا ہے۔ شعر کے چھوٹے سے پیضے میں جس قدر بھی جوہری توانائی کیوں نہ ہو اسے طویل نظم کے قلب اور قلب کی وسعت کے متقابل نہیں رکھا جا سکتا۔ جدید اردو شاعری میں نظموں کا رجحان دراصل بڑی شے کو گھیرے میں متحرک کرنے کا رجحان ہے“[۲۴]

طویل نظم کوئی یوں ہی وجود میں نہیں آجاتی بلکہ طویل نظم مختلف مختصر نظموں کے ملاپ کے تاثرات کا نام ہے۔ طویل نظم چھوٹی چھوٹی کڑیوں کے ملنے سے وجود میں آتی ہے۔اور یہ چھوٹی چھوٹی کڑیاں چھوٹے چھوٹے واقعات کا دوسرا نام ہے۔ طویل نظم مسلسل خیالات کو ترتیب دینے کا نام ہے۔ شاید شیدائی طویل نظم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''طویل نظم کا خاصا یہ ہے کہ وہ مختصر نظم کی تمام موضوعات مثلاً شعری مواد، تخلیقی لفظیات، فنی لوازم، بر محل زباں و بیان اور اسلوب کی چاشنی وغیرہ سے مملو تو ہوتی ہے مگر ربط استانزوں اور بے طوالت سے گریز لازم ہے۔ ایک ہی بات کو گھما پھرا کے دہراتے رہنا اور بیانیہ انداز اختیار کرنا قصے کو خوامخواہ طول دینا، کہانی میں سے کہانی نکالنا۔ غیر ضروری کرداروں اور عصری واقعات کی بھرمار کرنا اور بلند آہنگ جذباتیت سے کام لینا اسے طویل نظم کے فن سے بری طرح متاثر کر سکتے ہیں''۔[۲۵]

مختصر نظم اور طویل نظم کا بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ مختصر نظم کسی ایک خاص پہلو کا احاطہ کرتی ہے جبکہ طویل نظم موضوع کے متعلق کئی جڑے ہوئے واقعات کو بتدریج بیان کرتی ہے۔ "آدھی صدی کے بعد'' میں وزیر آغا کی زندگی کے تمام واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ بچپن، جوانی، بڑھاپا ایک ایک عہد کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے۔ طویل نظم کی مثال ایسے ہے جیسے ایک پگڈنڈی سڑک کا روپ اختیار کرے۔ اس جملے کا مطلب یہ ہوا کہ پگڈنڈی گاؤں کا کچا راستہ ہوتا ہے جو ایک حد تک طویل ہوتا ہے۔ جب اس پگڈنڈی سے نکل کر سڑک کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے تو واقعات کچھ مختلف طرح کے پیش آتے ہیں۔ آپ بیتی ہو یا طویل نظم ہو ان میں واقعات انسان کے گھر سے شروع ہو کر بڑے بڑے شہروں تک چلے جاتے ہیں اور ان واقعات کی ایک مخصوص ترتیب ہوتی ہے۔ جن کے جڑنے سے آپ بیتی مکمل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی اس منظوم آپ بیتی میں اپنے واقعات کے ساتھ ساتھ لوگوں کے واقعات کو بھی درج کیا گیا ہے۔

''آدھی صدی کے بعد'' وزیر آغا کی پہلی طویل نظم ہے اور اسی کو آپ بیتی کا نام دیا گیا ہے۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد انگریزی نظم نگار شیکسپئیر کی نظم ''All the world a stage'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جس نظم میں شیکسپئیر نے عمرِ رواں کی ساٹھ سیڑھیاں گنوائی ہیں اور ہر ایک سیڑھی کو مکمل کرنے کے بعد کسی بھی شخص کے احساسات، جذبات اور خیالات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس طرح وزیر آغا نے بھی ''آدھی

صدی کے بعد" میں پانی کے دھارے کو تمثیل کے طور پر بیان کیا ہے "جھرنے"۔ شاعر کی زندگی کے دو اہم ادوار یعنی بچپن اور لڑکپن کا نام ہے۔ یہ حصہ رات گئے سے شروع ہو کر پوری تہذیب کو اپنے گھیرے میں لے کر ساتھ ساتھ شاعر کے اپنے جذبات و احساسات کو اپنی لپیٹ میں لے کر آگے بڑھتا ہے۔

"دن کا پچھلا پہر
اوڈیس
اور اوڈیس کے جرار ساتھی
چری یا جرے، دھان اور نیشکر
کے پر اسرار کھیتوں کا
کالا سمندر"[۲۶]

***

"سر شام سوندھی سی خوشبو سے
سر شام
چھٹی پر بوندوں کی
یلغار
دانے
میرے لانبے بھٹوں سے ٹوٹے ہوئے
زرد دانے پٹاخے"[۲۷]

***

"شب کی کالی قبا
اور درختوں کے بھاری ذخیرے کے پیچھے
گھسٹنا، محافظ شعاؤں کے

***

گھیرے میں آگے کو آتا ہوا
چاند
گاؤں کے لڑکوں کی

تیر و تبر سے مسلح سیر
اپنے سالار کے حکم پر
آگے بڑھتی"[۲۸]

***

"نصف شب
جیسے خوشبو بھری گود
رستے ہوئے زخم پر جیسے پھایا
بدن کو تھپکتی ہوئی چاندی
سر کے ژولیدہ بالوں میں پھرتی ہوئی
ریشمی انگلیاں"[۲۹]

نظم کے اس حصے میں خالص دیہاتی تہذیب اور لوگوں کے رہن سہن کو بیان کیا گیا ہے۔ اس حصہ میں گاؤں کے لوگوں کا آپس میں رکھ رکھاؤ قابل تحسین ہے۔ اس حصہ میں بچپن کے جذبات و احساسات کو بڑے احسن طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس حصے میں آکر قاری اپنے آپ کو پوری طرح دیہاتی ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ وہ پگڈنڈیوں کا مزہ، کھیتوں کے ہرے بھرے سمندر، بچپن کے دوستوں کے ساتھ مختلف اوقات میں وقت گزارنا۔ سب کچھ اپنی اپنی جگہ بڑی ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ وزیر آغا نے "آدھی صدی کے بعد،، میں منظر کشی بہت خوبصورت انداز میں کی ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ شاعر نے اس نظم کی تخلیق میں منظر نگاری کی خوبصورتی کو اپنے فنکارانہ انداز میں برتا ہے تو غلط نہ ہو گا۔

"آدھی صدی کے بعد" میں شاعر نے مختلف واقعات کو مختلف اوقات میں تقسیم کیا ہے۔ "آدھی صدی کے بعد،، میں وقت ہی ہے جو مختلف واقعات کو جوڑ کر ایک طویل نظم تخلیق کرنے میں وزیر آغا کا معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس نظم میں وزیر آغا نے علاقائی انداز اپناتے ہوئے واقعات کو دلکش بنایا ہے۔ جہاں اوڈیس کی علامت میں بچپن کا ایک حسین زمانہ جو بے پرواہی کا غماز ہے وہاں دوسری طرف سوئمبر کی علامت استعمال کی گئی ہے۔ سوئمبر ایک رسم ہے جہاں لڑکی اپنے خاوند کا انتخاب اپنی مرضی سے کرتی ہے۔ مگر یہاں پر سوئمبر ایک بوٹی کے نام کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جو جیت کی علامت ہے اور اس بوٹی کو حاصل کرنے کے بعد قہقہے اٹھتے ہیں۔

یہاں یہ علامت اس وقت کے لیے استعمال ہوئی ہے جب پورا کنبہ ایک ساتھ کھانا کھا رہا ہو اور گول بوٹی اس کے ہاتھ میں آجائے اس کو خوش قسمت قرار دے کر قہقہہ لگایا جاتا ہے۔ اس نظم کا اسلوب انتہائی سنجیدہ اور سلیس ہے۔ اسلوبی حوالے سے یہ نظم کامیاب ترین نظم ہے۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ میرے جسم و جاں سے گاؤں کی تہذیب کی خوشبو آرہی ہے۔ اس حوالے سے غلام ثقلین نقوی لکھتے ہیں:

> ''گاؤں کی بُو د باس سے ان کی (وزیر آغا) شخصیت کبھی محروم نہیں ہوئی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا بیش تر حصہ شہروں کی پر شور زندگی سے دور رہ کر وزیر کوٹ میں تخلیق ہوا ہے۔ یعنی گاؤں ان کی ذہنی روحانی، جذباتی اور تخلیقی زندگی کا ایک مستقل پس منظر اور پیش منظر ہے کھلی فضاؤں کی وسعت اور گہرائی اور تازہ ہوا کی خوشبو ان کی تحریر کا نہیں ان کے کردار کا بھی جزولاینفک ہے''[۳۰]

وزیر آغا نے یہ سفر مختلف طریقوں سے کیا ہے اور ہر آنے والے دن نے انھیں کچھ نئے ہدف دیے۔ اصل میں وزیر آغا کا یہ سفر پوری کائنات کا سفر ہے۔ وزیر آغا نے ایک انسان کے تمام المیوں کو جوڑ کر دلکش بنایا ہے۔ ارمان نجمی نظم کے اس حصے کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''جھرنا'' میں گاؤں کی معصوم فضاؤں میں پلنے والا بچپن تہذیبی مظاہر کے پس منظر میں کس طرح اپنی ذات سے آشنائی حاصل کرتا ہے۔ اس کی جزئیات کی دلکش تصویریں اپنی مٹی کی خوشبو کے ساتھ روح میں اتر جاتی ہیں اور ہمیں خود بچپن کی خوشگوار یادوں میں گم کر دیتی ہیں''[۳۱]

جس طرح کے واقعات کا ذکر ہمیں وزیر آغا کی منظوم آپ بیتی میں ملتا ہے ہر انسان کا بچپن انھی واقعات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انسان جس جگہ رہتا ہے اور زندگی بسر کرتا ہے وہ اس جگہ اور ماحول کا بہترین نقاد ہوتا ہے۔ وہ ہر گزرے ہوئے سال میں بہت کچھ سیکھ چکا ہوتا ہے۔ بہت سے چھپے رازوں کو نظم کی مالا میں پرونا یقیناً ایک شاعر کا بہترین کارنامہ ہو سکتا ہے۔ "آدھی صدی کے بعد" کا یہ سفر خراماں خراماں آگے چلتا ہے اور شاعر اپنی جوانی کے لیے ندی بطور استعارہ استعمال کرتا ہے۔ بچپن اور بڑھاپا بھی انسان کی زندگی کے تلخ دور ہوتے ہیں۔ جوانی کے واقعات اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ جوانی ایک ایسی عمر ہوتی ہے جہاں پر انسان اپنے ہر

فیصلے کو آخری فیصلے کے طور پر لیتا ہے۔ جس نے جوانی کے معاملات اچھے انداز میں طے کر لیے سمجھو وہ کامیاب ہے اور " آدھی صدی کے بعد "کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وزیر آغا بہت صوبر اور مضبوط ارادے کے مالک انسان تھے۔ ندی چونکہ پر شور ہوتی ہے۔ اس میں لہروں کے اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ بالکل جوانی بھی پر شور ندی کی مانند ہوتی ہے۔ بچپن ایک سنہری دور ہوتا ہے مگر اس میں پختگی نہیں ہوتی۔ جوانی میں ہر چیز معنی خیز ہوتی ہے۔ عمر کے اس حصے میں انسان ہنسنے اور رونے کی کیفیت کو بڑے معصومانہ انداز میں محسوس کرتا ہے۔ جوانی میں انسان کا جوش اور ولولہ آسمان سے باتیں کرتا ہوتا ہے۔ انسان ہر چیز کا بغور مشاہدہ کرتا ہے اور چیزوں کو چھو کر اپنی تمنا کو پروان چڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ جوانی خطرناک ترین دور ہوتا ہے۔ اس زمانے میں کئی طرح کے سوالات انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ وزیر آغا پر بھی جوانی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ " آدھی صدی کے بعد،، میں ان اثرات کو کچھ یوں بیان کیا گیا ہے۔

"زمانے کی رفتار پر خندہ زن ہے؟
زمانہ تو بھیگا ہوا ایک چابک ہے
میرے بدن پر
مسلسل
انوکھے سفر کی کہانی سی اک
لکھ رہا ہے
مجھے لوح محفوظ گردانتا ہے
میں ایک خود لنگڑا تا رستا قلم ہوں،،[۳۲]

* * *

"جوانی کی تصویر کو دیکھتا
تو عارض کی رنگت میں گھن کر
چنبیلی کی خوشبو میں ڈھل کر
دھڑکتی ہوئی سانس بن کر
پگھلتی ہوئی موم بتی کی
رستی ہوئی آنکھ میں
ڈولتا ہے،،[۳۳]

کہ شاید

٭٭٭

"ہاں وہ پاگل زمانہ
عجب شان سے آ گیا تھا
جوانی نے
بچپن کی ایک کینچلی کی طرح
اپنے تن سے علیحدہ کیا
اور خود گھر کی دہلیز کو پار کر
کھلے شہر میں
تیز خوشبو بنی مشتہر ہو رہی تھی" [۳]
ٹھہرا ہوا اک جزیرہ تھا
مرکز تھا
ہر دم ابھرتے ہوئے دائروں کا" [۳۵]

٭٭٭

"اور میں
جیسے میں خود بھی
حیرت میں ڈوبے زمانے کی
آنکھوں سے بس خود کو ہی
دیکھتا تھا" [۳۶]

٭٭٭

"مگر پھر بھی
کوئی اڑتی سرگوشی۔۔۔۔۔ تتلی

نہ جانے کدھر سے

مری سمت آتی!

مری سمت آتی تو سمندر سے اٹھ کر

میں تینوں زمانوں کو

بچپن کے ہمجولیوں کو

گلے سے لگاتا"

میرے منہ میں باہر اچھل کر[۳۷]

☆☆☆

اچانک مجھے جیسے اُبکائی آتی

غلاظت

اور بغض

مجھے اپنی مٹھی میں لے کر

مسلتا[۳۸]

***

"اور میں سوچتا

اس قیامت سے

کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکے گا

تو پھر فائدہ؟

کیوں بے کار

رسی کے زینے پر چڑھتا رہوں"[۳۹]

***

"مجھے

تب مجھے

موت کے لمس کی آرزو

ہر گھڑی گدگداتی

میں خوشبو کی صورت

بدن سے نکل کر اڑوں

سب پکڑتے رہیں

میں نہ ہر گز رکوں""[40]

ہر انسان کی زندگی کے تین درجے ہوتے ہیں یعنی بچپن جو نادانی کی عمر ہوتی ہے اس دور میں انسان تقریباً ایسا کچھ کر لیتا ہے جس کو بعد میں سوچ کر وہ نادم ہوتا رہتا ہے۔ مگر کمسنی کی اس عمر کی غلطیوں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ یہ عمر یعنی بچپن گزارنے کے بعد جب آدمی جوانی میں قدم رکھتا ہے تو جوانی تیز رفتار ریل گاڑی کی مانند بہت جلد گزر جاتی ہے۔ مگر جوانی ہی تو ہے جو آدمی کا سنہرا دور مانا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب انسان کے اندر کچھ کر دکھانے کا جذبہ جواں ہوتا ہے۔ اور اکثر لوگ اس جذبے کو سامنے رکھتے ہوئے بڑے بڑے پہاڑوں سے ٹکرا دیتے ہیں اور کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ یہاں وزیر آغا اپنے بچپن کے زمانے کو سانپ کی کینیچلی سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جس طرح سانپ اپنی کینچلی اتار کر بالکل نئ جلد کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ بالکل میں بھی اپنے بچپن کو بھول کر جوانی کے روزگار میں مصروف رہا ہوں۔

شاعر جب عہد جوانی میں قدم رکھتا ہے تو اس کو اپنے چچا برکت علی خان کے ہاں منٹمگری (ساہیوال) بھیج دیا جاتا ہے تا کہ اس کی تعلیم بہتر انداز میں مکمل ہو سکے۔ جب وزیر آغا اپنے چچا کے ہاں تشریف لے جاتے ہیں تو دیکھ کر سب ہنسنے لگتے ہیں کیونکہ وزیر آغا نے لدھیانے کی قمیص پہنی ہوئی تھی جس پر کالے دھاگے سے کہیں کہیں نشان بنے ہوئے تھے۔ سر پہ سولا ہیٹ، خاکی رنگ کی شلوار جو گھٹنوں تک ہی تھی اور پاؤں میں ایک خوبصورت جوتی تھی۔ شاعر کہتے ہیں جونہی مجھے میرے چچا نے دیکھا تو How do you do? کے بلند ترین نعرے لگانے لگے۔ خیر چچا جان نے مجھے سینے سے لگایا اور ابتدائی دنوں میں میری خوب خاطر تواضع کی مگر میرے اندر دیہاتی پن خوب رچا بسا تھا۔ میں ایک سال تک چچا جان کے ساتھ ساہیوال رہا مگر احساس کمتری کے طلسم کو نہ توڑ سکا۔ میرے چچا برکت علی خان نے مجھے ہندوؤں کے ایک سکول میں داخل کر دیا۔ سکول کے

ہیڈ ماسٹر صاحب سے چچا جان کے مراسم بہت گہرے تھے۔ مجھے والد صاحب کی طرف سے حکم تھا کہ سائنس مضامین میں داخلہ لینا ہے۔ میری دلچسپی سائنس مضامین میں نہ ہونے کے برابر تھی خیر والد صاحب کی خواہش کا بھرم رکھتے ہوئے سائنس پڑھنا شروع کی۔ لیکن جلد ہی میں جان گیا کہ شاید میں سائنس کے لیے بنا ہی نہیں اور چچا جان سے درخواست کی کہ مجھے اس سائنس کے چنگل سے آزاد کرایا جائے اور چچا جان نے درخواست قبول کر لی اور میں آرٹس کا طالبعلم بن گیا۔ اردو کی پہلی کلاس نے ہی میری زندگی میں کھویا ہوا سکون مجھے واپس کر دیا تھا۔ جلد ہی میں اپنے اردو کے استاد کی نظروں میں آ گیا اور پھر استاد جی اور میری خوب بنی۔ وزیر آغا کی نظم ''آدھی صدی کے بعد'' میں شاعر نے جوانی کو ایک ندی کے مترادف کہا ہے۔ ارمان نجمی اس خیال کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ندی میں جوانی سے لے کر بلوغت کے واقعات و تجربات کی باز آفرینی ہے۔
> بے فکر و سرمستی کا یہ دور جلد گزر جاتا ہے اور ایک اضطراب انگیز زمانے کا
> آغاز ہوتا ہے''[۴۱]

جوں جوں انسان زندگی گزارتا جاتا ہے اس کی زندگی کے نئے گوشوں کی خبر ملتی رہتی ہے۔ ہر وقت انسان کا ایک سا نہیں ہوتا بلکہ زندگی دھوپ و چھاؤں کی مانند ہوتی ہے۔ دھوپ سے مراد انسانی زندگی میں مصیبتوں اور تکلیفوں کا دور ہوتا ہے جبکہ چھاؤں سکون اور راحت کا ایک جھونکا ہے۔ شاعر نے بڑی گہرائی سے اپنی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ اسی فکری گہرائی کی وجہ سے شاعر نے چھوٹے چھوٹے واقعات کو جوڑ کا اپنی ایک منظوم آپ بیتی ترتیب دی اس حوالے سے وزیر آغا رقم طراز ہیں:

> ''اس شاہراہ پر بچپن، جوانی اور بڑھاپا محض تین سرنگیں ہیں جن میں سے ہر
> مسافر کو بہر حال گزرنا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک سرنگ کا اپنا
> ایک رنگ ہے اور اپنی ایک خوشبو ہے۔ مسافر جب اس میں سے گزرتا ہے تو
> سرنگ کا رنگ اور خوشبو اس کے بدن بلکہ اس کی شخصیت تک کو تبدیل کر
> دیتی ہے۔ مگر سرنگ کسی عنوان بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ اپنی جگہ سدا سے
> قائم ہے اور شاید ہمیشہ قائم رہے''[۴۲]

نظم کے اس حصے میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ چوں کہ.... جو ندی ہوتی ہے اس میں سکون ہوتا ہے۔ جبکہ ندی دریا کا روپ اختیار کرتی ہے تو اضطراب و بے چینی کی کیفیت تیز تر ہو جاتی ہے۔ اور

نظم کے اس حصے میں شاعر ابھی تک ندی کی پر سکون موجوں میں مست زندگی بسر کر رہا ہے۔ سید الثقلین نقوی نظم کے اس حصے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ندی ابھی دریا کا حصہ نہیں بنی تھی۔ وہ اپنی ذات کی کشمکش میں مصروف تھی وہ اپنے آپ کو زمانے کی گردش کا محور قرار دیتی تھی۔ وہ ہوا کے سمندر میں ٹھہرا ہوا اک جزیرہ تھی۔ جس کے گرد لمحوں کی چنچل گوپیاں رقص کرتی تھیں۔ وہ ایک سورج تھی کہ سبز ریشم میں ملبوس دھرتی اس کے گرد گھومتی تھی۔ یہ جوانی کی نرگیست کا دور تھا۔ ایک رومانوی عہد جس میں انسان اپنے آپ کو ایک شہر کا نہیں بلکہ سارے جہاں کا دل سمجھتا تھا۔ سارا زمانہ اسے دیکھتا ہے۔ ایک آئینہ جس میں اپنی صورت نظر آتی ہے اور تینوں زمانے اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں"[۴۳]

یہ دور شاعر کی زندگی کا بہترین دور سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب شاعر ہر چیز کی تہ میں جا کر اس کی حقیقتوں کو جاننے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ جوانی کا زمانہ شاعر کو مضطرب رکھتا ہے۔ اور اس اضطراب کی کیفیت میں شاعر مکمل جذباتی نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ جذبات ہیں جو زندگی کی حقیقتوں کو سامنے لانے میں شاعر کا ساتھ دیتے ہیں۔ وزیر آغا "ندی" کو خودی کا استعارہ قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کامل انسان وہی ہے جس میں ندی کی سی خصوصیات پائی جائیں۔

نظم کے اس حصے کو رشید نثار یوں بیان کرتے ہیں۔

"یہ حصہ شعور، وجدان، تجربے، احساس اور تعقل کا حصہ ہے۔ اس حصے میں شاعر جنون اور اپنی ذات میں مرتکز جوان، ایک شاعرانہ شائبے کی صورت میں موجود ہے۔ اسے اظہار کی صورت دینے میں وزیر آغا نے چابک دستی سے کام لیا ہے اس اظہار میں ضرورتیں بھی ہیں اور بصری لوازمات بھی، ان میں آشنائی زندگی سے گریز اور عہد سامنے آتا ہے۔ جن میں انسان ایک دوسرے کا گلا کاٹ کر اپنی حیوانیت کے پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ شاید یہ دوسری جنگ عظیم کا دور ہے جس میں ہر طرف خوف و ہراس اور تعفن موجود ہے"[۴۴]

واقعی یہ وہ زمانہ ہے جس زمانے میں وزیر آغا وزیر کوٹ میں مکین تھے۔ اچانک حملہ ہوا اور لوگوں میں خوف وہراس پھیل گیا تھا۔ فصلیں تباہ ہو چکی تھیں۔ کھیت اجڑ چکے تھے۔ لوگ مر رہے تھے۔ انھی دنوں وزیر کوٹ گاؤں میں چند بارودی گولے پڑے تھے جنھوں نے وزیر آغا کے گھر کو خاصا نقصان پہنچایا تھا مگر جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس منظر کو بھی وزیر آغا نے بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور رشید نثار کی اس رائے سے سو فیصد اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں انسانی جسم میں چھپے حیوان درندے انسانیت کو ختم کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

جھرنے اور ندی کے بعد آدھی صدی کے بعد کا تیسرا حصہ دریا ہے۔ دریا اصل میں پکی عمر کی علامت ہے۔ دریا وزیر آغا کی زندگی کے پہلے دو حصوں کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرتا ہے۔ نظم میں شاعر کی زندگی کا یہ حصہ پر سکون دکھائی دیتا ہے چوں کہ جوانی اضطراب کا دوسرا نام ہے جب کہ پکی عمر میں انسان پر سکون ہو جاتا ہے اور جوش سے کام لینے کے بجائے ہوش سے کام لیتا ہے۔ اس عمر میں پختگی اتنی آچکی ہوتی ہے کہ جسم کے ساتھ ساتھ عقل و شعور کی منزلیں بھی پختہ ہو چکی ہوتی ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب انسان بہت سے تجربات اور مشاہدات سے گزر چکا ہوتا ہے اور اس دور میں الفاظ کا چناؤ واقعی معنی خیز ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے انسان کے پاس بہت سا علم اکٹھا ہو چکا ہوتا ہے۔ اس حصے سے چند اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"مرے گرد
سونے کی کنگن کا حلقہ بنا تھا
زمانہ
سلگتا ہوا تیز
قوسِ عدم سے نکل کر اڑا تھا" [۴۵]

***

"معاً میں نے
پھولوں کے گجروں کی درزوں سے دیکھا
میں ندیوں کے جھرمٹ میں محصور
پلکوں کی ٹھنڈی سلاخوں کے پیچھے
کھڑا تھا" [۴۶]

* * *

"عجب روشنی تھی

مہکتے ہوئے سبز باغات

پنچھی

کسانوں کے گھر

کھیتیاں

میرے دامن میں

گوٹے کناری کی صورت

رکھتی تھیں"[۴۷]

* * *

"کبھی جب ہوا

کالے مردہ پہاڑوں سے

پلو چھڑا کر

مری سمت آتی

اور رنگین فرغل پہنتی

دبے پاؤں چلتی

میرے گھر کی چوکھٹ سے ٹکرا کے

رکتی"[۴۸]

* * *

"سحر

روز کمرے کی چق کو ہٹاتی

میرے پاس آتی

میرے نرم بستر کی چادر کو بدلتی

مجھے جیسے پَر مار کر

گھر سے باہر نکلنے پہ

مجبور کرتی"[۴۹]

* * *

"ادھر میں
اپنی آرام کرسی میں لیٹا ہوا
آتے جاتے زمانوں کو تکتا تھا
اور اونگھتا تھا"[۵۰]

* * *

"لو تاریخ کا رخ
بدلنے لگا
کہ دریا کہ اپنے کناروں کے اندر تھا
بادل کی بے رحم چانک
کی ضربوں سے
پاگل ہوا"[۵۱]

* * *

"اور پھر یوں ہوا
سرسراتی سی پرچھائیں
یم راج کی
میری پیہم روانی پہ
برہم ہوتی"[۵۲]

* * *

"مٹ گئی
نیلے آکاش کا
آخری ابر پارہ بنے
اپنے اندر اتر کر
فضاؤں میں تحلیل ہوتی گئی

اور میں

اپنے بوجھل پپوٹوں کی محبس سے

آزاد ہو کر

ہزاروں برس کی گھنی نیند سے

جیسے بیدار ہو کر تحیر میں ڈوبا

انوکھی چکاچوند کے

روبرو آگیا"[۵۳]

اس حصے میں وزیر آغا مشاہدات کی دنیا میں مکمل غرق نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ میں زمانے کو بڑی گہری نگاہ سے دیکھتا ہوں زمانہ میرے سامنے سے بڑی تیزی کے ساتھ گزرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ مختلف چیزوں کے ساتھ زمانے کو تشبیہ دیتے ہیں۔ کبھی مکڑیوں، شہد کی مکھیوں اور کبھی ریشم کے کیڑوں کی تہ داریوں کو زمانے والوں کے ساتھ ملاتے ہیں۔ وزیر آغا نظم کے اس حصے میں بیان کرتے ہیں کہ ایک وقت ہوتا ہے جب انسان اپنی ذات کی حدوں کے اندر ہی زندگی بسر کرتا ہے۔ وقت گزرتے ہوئے وہ زندگی کے ایک ایسے میدان میں قدم رکھتا ہے جب انسان اپنی ذات کا خول توڑ کر باہر نکلتا ہے اور وسیع کائنات کے دریا میں بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ اصل میں یہ وہ سٹیج ہے جب انسان اندر سے پختہ ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آنے لگتی ہیں اور اس زمانے میں تخلیق کا آغاز ہونے لگتا ہے۔ اس دور میں انسان کو سوچنے سمجھنے کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ اس معرفت کے علاوہ انسان کے الفاظ بے معنی سے نظر آتے ہیں۔ اس دور میں انسان کا مطالعہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ یہ وسیع مطالعہ ہی انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات تلاش کرے کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ میری ذات کا مقصد کیا ہے؟ مجھے اس دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس نظم میں کائنات کی تقریباََ ہر چیز کا ذکر ملتا ہے۔ کائنات کی کوئی بھی چیز بے مقصد نہیں تخلیق کی گئی بلکہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ شاعر اشیا کی تخلیق کے مقصد کی تلاش میں غوطہ زن ہے۔ اور شاعر نے اس دریا سے کائنات کی تخلیق کے مقاصد کو نکال کر قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔ نظم کا یہ حصہ شاعر کی پوری زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ نظم کے اس حصہ کو شاعر نے دریا کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ کیوں کہ دریا مسلسل چلتا رہتا ہے اس میں ٹھہراؤ نہیں ہے۔ دریا مسلسل سفر میں رہتا ہے اس کو کسی نئے جہاں کی تلاش رہتی

ہے۔ بالکل ایسے ہی وزیر آغا زندگی کے اس حصہ میں داخل ہو کر ہمیشہ کھوج میں لگا رہتا ہے کہ کائنات کیا ہے؟ اسی میں دوران وزیر آغا شادی کے حسین بندھن میں بندھتے ہیں اور ذہنی سکون پاتے ہیں۔ وزیر آغا شام کی منڈیر سے میں خود رقمطراز ہیں کہ شادی کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میں بہت سی مشکلات کاٹ کر جنتِ گم شدہ میں واپس آیا ہوں۔ وزیر آغا بچپن کے زمانے میں بہت پر مسرت لمس سے خوب واقف تھے مگر بعد میں ان کو کچھ نامساعد حالات کا سامنا بھی رہا۔ ۱۹۴۹ء میں جب وزیر آغا کی شادی ہوئی تو وہ لکھتے ہیں مجھے یوں لگا جیسے پہلی بار مسرت ایک تیز ہوا کے جھونکے کی طرح میرے جسم سے ٹکرائی اور میں اس جھونکے سے اتنا لطف اندوز ہوا ۔ اور قیام کر ڈالا۔ قیام سے مراد یہ نہیں کہ قدم روک لیے بلکہ ذہنی اضمحلال سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا اور سکون کی وادی میں جا بسا تھا۔ اسی دور میں وزیر آغا کہتے ہیں کہ مجھے یوں لگا کہ ڈوبتے ہوئے سمندری جہاز کو لنگر مل گیا ہو اور اب اس جہاز کو کوئی خطرہ نہ رہا ہو۔ یہ وہ دور تھا جب شاعر کو اپنے پاؤں کے نیچے زمین کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ شادی کے بعد شاعر کو ایسا لگا کہ اس نے صرف ایک لڑکی سے شادی نہیں کی بلکہ اس کرہ عرض کی ہر چیز سے شادی کر لی ہے۔ یہ وہی دور ہے جب شاعر زراعت میں دلچسپی لینے لگا اور زراعت کو بطور پیشہ اختیار کر لیا۔ زمین کے ساتھ انھیں کچھ عشق ہو گیا تھا اور وہ اپنی فصلوں کو دیکھ کر بہت خوشی محسوس کرتے تھے۔ وزیر آغا خود کہتے ہیں زراعت کا پیشہ میں نے اس لیے اختیار کیا تھا کہ مجھے اس میں سکون ملتا تھا پیسہ کمانا میرا مقصد ہر گز نہیں تھا۔ میں پورا پورا دن کھیتوں میں مصروف رہتا اور اپنی فصل کی نشو و نما کا جائزہ لیتا رہتا۔ اسی دوران میں میرا واسطہ حشرات الارض سے رہتا تھا۔ میں ہر چیز کو جو ذی روح تھی اس کو ایک خاندان قرار دیتا تھا۔ جس طرح انسان زندگی گزارنے کے لیے دوسرے انسانوں کا سہارا لیتے ہیں بالکل جانور بھی اپنے معاملات زندگی گزارنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کے متقاضی ہوتے ہیں۔ جانوروں کا معاشرہ ایک پر سکون معاشرہ ہے جبکہ انسانوں کے اندر مل جل کر رہنے میں کافی تضاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب پرندے یا جانور کسی انسان کو دیکھتے ہیں تو وہ بہت خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ وزیر آغا ویسے تو بچپن ہی سے لکھنے لکھانے کا کام کرتے رہتے تھے اور کئی ادبی تنظیموں سے منسلک تھے۔ "ادبی دنیا،، میں ان کی باقاعدہ تحریریں چھپنا شروع ہوئیں جس کی وجہ سے وزیر آغا کی تخلیقی صلاحیتوں میں بہت زیادہ ابھار آیا ۱۹۴۸ء میں وزیر آغا نے نصیر آغا کے نام سے باقاعدہ لکھنے کا آغاز کیا۔ اس دور میں وزیر آغا نے پہلی بار اپنے اصل نام کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ اس دور میں وزیر آغا کا سب سے اہم موضوع محبت ہے اور محبت کو جاننے کی بھرپور کوشش کی اس دور میں محبت پر ایک مضمون قلم بند کیا جس کا عنوان ہی محبت کا تاریخی ارتقا ہے۔ اس مضمون کو جب مولانا صلاح

الدین نے پڑھاتو وہ بہت خوش ہوئے اور اس کی تعریف میں پورا ایک پیراگراف لکھ دیا۔ یہ دور وزیر آغا بڑی تیزی کے ساتھ گزار رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں جیسے ریل پلیٹ فارم پر آجائے اور مسافر اپنا سامان جلدی جلدی سمیٹنے کی کوشش میں لگے تا کہ سفر کا آغاز کیا جاسکے۔ اس دور کے حوالے سے وزیر آغا کہتے ہیں کہ میری زندگی بھی کچھ ایسے ہی گزر رہی ہے۔ میرے اندر کا سامان بھی بکھرا پڑا ہے۔ ٹوٹی ہوئی طناب، پھٹا ہوا خیمہ، اور بے شمار نقوش یا ان نقوش میں سب سے تکلیف دہ نقش شمس آغا جو میرا بھانجا اور بہت اچھا دوست بھی ہوتا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے دل کی ہر بات بیان کرتے تھے۔ شمس چونکہ ایک حادثے میں لاپتا ہو جاتا ہے تو اس سانحہ کے بعد وزیر آغا بے چینی کی زندگی بسر کرنے لگے تاہم ساتھ ساتھ پڑھنے لکھنے کا کام جاری و ساری رہتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان دنوں ایک انگریز مفکر لن یوٹانگ کی کتاب "The importance of living" کا مطالعہ کیا جارہا تھا اور لن یوٹانگ مجھے بتارہا تھا کہ یہ زندگی اور اس کے مظاہر مایا یا سراب نہیں ہیں بلکہ اصل مقیقس ہیں۔ یہاں ہمیں شاعر مطالعے کے بعد ایک دنیا کو دریافت کرنے کی جستجو میں مگن نظر آتا ہے۔ اپنی ذہنی الجھاؤ کو سلجھاتے سلجھاتے وزیر آغا حسرت کی تلاش کے موضوع پر ایک نئی کتاب لکھ دیتے ہیں۔ اس کتاب کے حوالے سے وزیر آغا "شام کی منڈیر سے،، میں بیان کرتے ہیں:

> "جب مجھے اس کتاب کا پہلا نسخہ ملا تو شام ہو رہی تھی۔ کتاب کا نسخہ بذریعہ
> ڈاک آیا تھا اور ڈاک گاؤں میں شام کو آتی تھی۔ یہ میری پہلی کتاب تھی۔
> مجھے اس بات کا بالکل یقین نہیں تھا کہ میں کسی کتاب کا مصنف بن سکتا ہوں۔
> اس لیے میں دیر تک اس کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا"[۵۴]

اس کے بعد وزیر آغا پر خدا کی اتنی رحمت برسی کہ بیس کتابیں لکھ ڈالیں۔ "آدھی صدی کے بعد" کا چوتھا حصہ سمندر ہے۔ سمندر گہرا اور وسیع ہوتا ہے۔ جس میں آئے دن طوفان کناروں سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے دریا خود کو اس میں شامل کر کے اپنے وجود کی نفی کر دیتے ہیں۔ اس نظم کا آغاز ہی کچھ یوں ہوتا ہے کہ ابتدا جھرنے سے ہوتی ہے۔ جھرنا ندی بنتا ہے۔ ندی دریا کا لباس پہن لیتی ہے اور پھر آخر پر دریا خود کو سمندر کے حوالے کر کے کہانی کو نقطہ عروج پر ختم کر دیتا ہے۔ اس پورے دورانیہ کو ناقدین پچاس سال کا عرصہ قرار دیتے ہیں۔ مگر تسلسل ابھی تک برقرار ہے ٹوٹا نہیں۔ سمندر کس طرح اپنی گہرائیوں اور وسعتوں کو بیان کرتا ہے ملاحظہ کریں:

> "وہ چھن بھر میں

کتنا بڑا ہو گیا تھا!
اچھلتے ہوئے شوخ جھرنے
جوں ندیاں
سبھی دست و بازو تھے اس کے "۵۵؎

***

"وہاں جس جگہ آج
ایک صحرا اُچھا ہوا ہے
کبھی، صدیوں پہلے
وہاں بڑ کا ایک پیڑ رہتا تھا
ہر روز میں آگے بڑھ کر
چرن اس کے چھوتا تھا"۵۶؎
"وہ ہر روز مجھ کو
گلے سے لگاتا"۵۷؎

***

"اور پھر یوں ہوا
میں نے اک بار پھر
اپنا بہروپ بدلا
خود اپنے ہی اندر سے باہر نکل کر
جہاں جس جگہ اب سے پہلے
خنک ریت کا ایک صحرا اُچھا تھا
میں پتوں کا ایک تاج
سر پر سجائے
کھڑا ہو گیا۔"۵۸؎

***

میں نے دیکھا

ہوا ہر جگہ تھی

مگر اب بلاؤ

تو بیدار ہوتی

ہر ایک شے کو بیدار کرتی

سجل اوس کی کرچیوں کو

زمین پر گراتی"[۵۹]

* * *

"معاً

میں نے دیکھا

زمین پر ہوا تھی

ہوا کے تڑختے ہوئے قافلے تھے

مگر سبز دھرتی کی

ٹھنڈی تہوں میں

جڑوں کی پر اسرار وحدت تھی

سب قافلے

ایک نقطے میں سمٹے ہوئے تھے"[۶۰]

جدید شعرا کے ہاں سمندر کو بطور علامت استعمال کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے میرا جی ایک اہم نام ہے جس نے سمندر کو بطور علامت اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ وزیر آغا کی نظم "آدھی صدی کے بعد" میں بھی آخری حصے میں سمندر کو بطور علامت استعمال کیا گیا ہے۔ مجید احمد کی نظموں میں بھی سمندر کے حوالے ملتے ہیں۔ وزیر آغا کے ہاں سمندر ایک خاص معنویت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ نظم کا یہ حصہ بہت اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس حصے میں شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کا امتحان ہے کہ شاعر کس طرح اپنی زندگی کے آخری دور کو سمندر کے ساتھ تشبیہ دے کر اپنے شخصی دائرے میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ تخلیق ادب کے عقب میں کچھ حوادث کار فرما ہوتے ہیں۔ وزیر آغا کی اس طویل نظم "آدھی صدی کے بعد" کے پیچھے بھی ہلا دینے والا ایک واقع کار فرما ہے۔ جس نے وزیر آغا کو دوبارہ زندگی عطا کرتا ہے۔ یہ ۱۹۸۰ء کی بات تھی کہ جب وہ لاہور میں روزگار کے لیے سفر کر رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ راستے میں شیخوپورہ سے پہلے تھوڑے فاصلے پر ہماری

گاڑی خراب ہو گئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے چہل قدمی کو اہم جانا اور قریب سے گزرتی ہوئی ریل کی پٹری پر چل پڑا۔ گاڑیوں کا رش اتنا زیادہ تھا کہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ریل گاڑی پٹڑی پر آ گئی اور مجھے دیکھتے ہی ڈرائیور نے زور دار ہارن بجائے مگر گاڑیوں کے شور میں ریل گاڑی کی سیٹی کہیں گم ہو گئی۔ موت کا فرشتہ میرے سر پر منڈلا رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک گدھا گاڑی والے کو میری زندگی کا محافظ بنا کر بھیجا اور اس گدھا گاڑی والے نے مجھے دھکا دیا اور میں پلک جھپکنے سے پہلے ہی پٹڑی سے اتر اور ریل گاڑی میرے کپڑوں کو چھوتے ہوئے گزر گئی۔ میں بہت دیر تک ششدر رہا کہ یہ ہوا کیا ہے۔ میں موت کو قریب سے دیکھ کر جب اس دنیا میں واپس آیا تو پورا جہاں مجھے روشن لگ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری روح کو سنہری پر لگ گئے ہیں۔ اور میرے وجود کی دوبارہ سے تخلیق ہوئی۔ یہ واقع صرف مجھے دوبارہ زندگی ملنے کا نہیں ہے بلکہ اس واقعے نے مجھے مکمل طور پر جھنجوڑ کر رکھ دیا اور اس کے رد عمل کے طور پر "آدھی صدی کے بعد" ایک طویل نظم وجود میں آئی جس میں زندگی سے جڑے اور بھی بہت سے واقعات شامل ہیں۔

نظم کا آخری حصہ سمندر ہے۔ چوں کہ سمندر وسعت کی علامت ہے جو اپنے اندر بہت سے چھوٹے بڑے جھرنوں، ندیوں، دریاؤں کو لیے بیٹھا ہے۔ وزیر آغا کی زندگی کا آخری حصہ بھی سمندر کی مانند ہے جو۔ نظم کے اس حصہ میں عرفان و آگہی کی کئی منازل طے کیے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس حصہ میں وزیر آغا زماں و مکاں کی سرحدیں عبور کر چکے ہیں۔ نظم کے آخری حصے میں ہوا کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ہوا بھی حرکت و عمل کی علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ نظم کے اس حصے میں جزو سے زیادہ کل کو اہمیت دی گئی ہے۔ انفرادیت کو اجتماعیت کے مقابلے میں کمزور کہا گیا ہے۔

"آدھی صدی کے بعد" ایک نظم ہے جو اسلوبی حوالے سے اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ ڈاکٹر رشید نثار، "ڈاکٹر وزیر آغا اور ہمارا عہد" میں آدھی صدی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

آدھی صدی کے بعد ایک طویل نظم ہے جو ڈاکٹر وزیر آغا کی زندگی کے چار ادوار پر محیط ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا بچپن بہت شاہانہ نہیں گزرا ہے۔ اس دور میں وزیر آغا کو کھانے، پینے، اوڑھنے، پہننے ہر طرح کی پریشانی نے اپنے چنگل میں لیا ہوا تھا۔ حادثے آنکھ کھولتے ہی شروع ہو گے تھے۔ اس لیے شاعر نے ایک طویل نظم بڑی مہارت کے ساتھ تخلیق کر کے قاری کو دی ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں

"سب سے بڑا ادب وہ ہے جو زندگی کی شاخ سے پھوٹتا ہے"[۱۶]

اس نظم کا مطالعہ کرنے سے وزیر آغا کی تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ نظم میں پنہاں مقاصد سے بھی آگہی حاصل ہوتی ہے۔ شاعر نے اس نظم میں ایک ایک واقعے کو ایک ایک سوچ کو بڑے مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔ نظم کی منظر نگاری شاعر نے ایسے کی ہے کہ قاری پوری طرح سے اس ماحول میں چلا جاتا ہے جس ماحول میں واقعہ لکھا گیا تھا۔ اس نظم کے واقعات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں جیسے ایک بچے کی زندگی بسر ہو رہی ہو اور اس کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص ترتیب کا لحاظ رکھا ہو۔ اس نظم کے ابتدائی حصے میں رتھ اور بیل گاڑی کا حوالہ ملتا ہے۔ رتھ اپنے ساتھ آریالے کر آئے تھے۔ جنھوں نے برصغیر کی دھرتی میں زراعت کو متعارف کرایا تھا۔ اور اس حصے میں ماں بیٹے کی بے پناہ محبت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم کے واقعات کو شاعر نے لاشعور میں سجا کر رکھا تھا تب ہی ایک خوبصورت نظم تخلیق ہوئی ہے۔ "آدھی صدی کے بعد" کی ابتدا میں وزیر آغا کا بچپن بڑا چنچل نظر آتا ہے۔ وہ کبھی صبح کی بھاگ تھامے نظر آتے ہیں اور کبھی شام کی آغوش میں سکون کرتا ہوا دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر کبھی پرندوں کی آواز سے لطف لیتا ہے کبھی گائے کے دودھ کی دھار سے بجتا ساز بیان کرتا ہے تو کبھی گاؤں کے تندور کی روٹیوں کی مہک کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ تمام واقعات ہیں جن کو شاعر ایک لڑی میں پروتے ہوئے نظم کو مکمل کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں بچہ اپنے کردار کے فطری عمل میں تھک کر سکون کرتا ہے تو یہ سکون اس کو تھوڑی دیر بعد دوبارہ طاقتور بنا دیتا ہے۔ وہ چیزوں کو پھر سے ایک نقاد کی نظر سے دیکھتا اپنی زندگی گزارنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ واقعات کو شاعری کا لباس اوڑھا کر قاری کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ واقعات کو شاعری کی زبان میں بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وزیر آغا نے اس کام میں اپنے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ نظم جوں جوں اپنی جوانی کے دائرے میں داخل ہوتی ہے تو وزیر آغا کے دکھ مزید واضح ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ نظم کے دوسرے حصے میں سکون نظر آتا ہے۔ کیوں کہ دوسرا حصہ ہی ندی ہے۔ شاعر یہاں جھرنے کی ہلچل سے نکل کر ندی کے پر سکون ماحول میں داخل ہوتا ہے مگر اندرونی ضطراب پوری طرح ختم نہیں ہوتا۔

"آدھی صدی کے بعد" شاعر کو دو طرح کی کیفیت سے گزارتا ہے۔ ایک وہ ماضی جس میں حسین یادیں دفن تھیں مگر تمام یادیں ذہن کے تہ خانے میں ترتیب وار محفوظ تھیں۔ اور شاعر پچاس سالوں کی محفوظ کی ہوئی یادوں سے لطف لے کر نظم تخلیق کرتا ہے۔ جبکہ دوسری کیفیت حال کی ہے۔ جب نظم تخلیق کرتا ہے تو اسے یوں لگتا ہے پچاس سالوں کا سفر گویا اس نے ایک لحظہ بھر میں مکمل کر لیا ہو۔ شاعر کھلی آنکھوں سے

پچاس سال پیچھے چلا جاتا ہے اور تمام راستوں پر دوبارہ سے سفر کرنا شروع کرتا ہے۔ یہ واقعات دلچسپ بھی ہیں اور بہت تکلیف دہ بھی۔ کیوں کہ جن واقعات کو جوڑ کر شاعر نے اپنی منظوم آپ بیتی کی عمارت تعمیر کی ہے ان میں کچھ حسین اور خوبصورت لمحات بھی ہیں اور کچھ خون آلودہ واقعات بھی بھوک، افلاس، تنگ دستی، جنگ و جدل، ہجرت، بچپن، ہمجولی، کھیت، دریا، میل جول یہ سارے موضوعات ”آدھی صدی کے بعد“ کا حصہ ہیں۔ وزیر آغا ”آدھی صدی کے بعد“ کے حوالے سے کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> ”میری یہ نظم بیسویں صدی کے پچاس سالوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ان پچاس سالوں میں ملکی اور شخصی سطح پر جو واقعات رونما ہوئے وہ اس نظم کا موضوع نہیں ہیں مگر ان واقعات اور سانحات نے میری زندگی کے اندر جو گھاؤ پیدا کیا اور جو نشیب و فراز جنم دیے۔ ان سب کی باز آفرینی اور ان کے وسیلے سے زندگی کے پر اسرار معنی تک رسائی کی کوشش۔ بس یہی اس نظم کا میدان تگ و تاز ہے“[۶۲]

”آدھی صدی کے بعد“ ابھی اپنے آخری مراحل میں تھی کہ وزیر آغا کو ہندوستان کا سفر کرنا پڑا۔ سفر بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا۔ اس سیمینار میں دنیا بھر سے بڑے بڑے ادیب اور شاعر شامل تھے۔ جب پاکستانی وفد پہنچا تو سب سے زیادہ گرم جوشی سے اس وفد کا ستقبال کیا گیا۔ گوپی چند نارنگ، بلراج کومل، محمود ہاشمی اور ان کے ساتھ بہت سے دوسرے ادبا استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ وزیر آغا نے صاف الفاظ میں پاکستان اور ہندوستان کی ادبی فضا کا تذکرہ کیا ہے کہ پاکستان میں جب کوئی مقالہ نگار اپنا مقالہ پیش کرتا ہے تو سامعین کی توجہ ہی نہیں ہوتی جبکہ ہندوستان میں جب کوئی مقالہ نگار اپنا مقالہ پیش کرتا ہے تو مقالہ نگار کے فوراً بعد ایک مبصر سٹیج کی زینت بنتا اور مقالے پر کھل کر تنقید کرتا اور داد وصول کرتا۔ شاعر لکھتے ہیں کہ میں دہلی میں نوروز تک ٹھہرا۔ مجھے دنیا بھر سے آئے ہوئے ادبا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ نوروز گزارنے کے بعد وزیر آغا جب لاہور آتے ہیں تو طبعیت کچھ ناساز معلوم ہوتی ہے۔ تب تک ”آدھی صدی کے بعد“ مکمل ہو چکی تھی۔ وزیر آغا کی داخلی سیاست اتنی پھیل چکی تھی کہ نظم ایسے مکمل ہوئی جیسے کہ وہ خود ایک خواب سے گزر رہے ہوں۔ وزیر آغا نے جب اس کائنات کا سفر شروع کیا تو زندگی کے اس سفر میں آگہی ان کی روشنی کا مینارہ بن کر سامنے آئی۔ آگہی ہے کیا؟ آگہی تو گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہے۔ وہ ایک حد تک کسی جگہ میں جانے کے بعد واپس اسی طرف لوٹتی ہے۔ جہاں سے اس نے آغاز کیا تھا۔ بالکل ایسے

ہی ایک انسان ایک وقت میں دو طرح سے سفر کرتا ہے۔ ایک سفر اس کا جسمانی ہوتا ہے جبکہ دوسرا سفر روحانی ہوتا ہے۔ وہ جب جسمانی سفر کے دوران میں چیزوں کو دیکھتا ہے تو ان کا حل ذہنی سفر کے ساتھ تلاش کرتا ہے۔ انسان ذی روح ہے جسے آگہی نصیب ہوئی ہے۔ جب انسان اس دنیا کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو وہ اس آگہی سے ایک ایسا دیا روشن کر جاتا ہے کہ جس میں اس کی روشنی تادیر روشن رہتی ہے۔ بالکل ایسے ہی وزیر آغا نے "آدھی صدی کے بعد" میں انسان کی حقیقت، کردار و اخلاق کو ایک منظوم آپ بیتی کی صورت میں بیان کیا ہے۔ چوں کہ کائنات کی آگہی خود انسان ہے۔ اس نظم میں وزیر آغا نے وقت کی تقسیم کو بھی بیان کیا ہے۔ صبح ہو یا شام، دن ہو یا رات ہر وقت کو بڑے احسن طریقے سے شاعری میں بیان کیا ہے۔

"ادھر شام
پھولوں کا گجرا بنی
روبرو آ کے رکتی
ادھر میں بڑے باغ کے
سرد پھولوں کی جانب لپکتا" [۶۳]

چوں کہ وزیر آغا کی زندگی کا ایک خوبصورت وقت لارنس گارڈن میں گزرا ہے۔ اس لیے بلبل کی طرح وزیر آغا بھی گل کو اپنا محبوب سمجھتے تھے۔ وہ سرد پھولوں کو اپنے رخسار کے ساتھ مس کر کے تخیلاتی دنیا میں محو ہو جاتے۔ اس لیے ان کی اس نظم میں فطرت کے ساتھ گہرے لگاؤ کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ یہ دور وزیر آغا کی زندگی کا رومانوی دور کہلاتا ہے۔ اس کے بعد پھر سے وزیر آغا کو اپنے گاؤں کی ناگفتہ بہ حالت یاد آتی ہے اور وہ کسانوں کی تقدیر بدلنے کا آغاز کرتے ہیں۔ کسانوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اچھی کارکردگی دکھانے والے کسان کو انعام دینے کا اعلان کرتے ہیں تاکہ کسان اپنے کھیتوں میں پوری دلچسپی سے کام کریں اور ملک بہتری کی طرف جائے۔ وزیر آغا کے ہر کام میں تخلیقی عنصر ضرور موجود ہوتا تھا۔ وزیر آغا کی اس آپ بیتی کے حوالے سے شمیم حنفی لکھتے ہیں کہ:

"وزیر آغا کی آپ بیتی میں نہ صرف یہ کہ انسانی وجود اور فطرت کے مظاہر کا تناسب و توازن برقرار ہے بلکہ اس توازن و تناسب نے پورے بیانیہ کو اخلاقیات سے روشناس کرادیا" [۶۴]

شیر از احمد کا وزیر آغا کی زندگی کے حوالے سے خیال ہے کہ: ”یہ سفر آدمی سے انسان تک کا سفر معلوم ہوتا ہے ”[۶۵] چونکہ آدمی سے انسان تک کا سفر مشکل عمل ہے اور آدمی کو انسان بننے کے لیے بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے اپنے لیے نفس امارہ کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ تب جا کر کہیں خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے۔ رفیق سندیلوی "آدھی صدی کے بعد“ کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ان کا معاشیاتی جوہر قدم بہ قدم ایک دوسرے کے بغل گیر ہے۔ “[۶۶]

آدھی صدی کے بعد“ میں وزیر آغا چھ مقامات کے حوالے دیتے ہیں۔ جن میں ”سوئمبر“، ”اڈیس“، ”قاف“ ، ”شانگری لا“، ”لچھمن“، ”ریکھا“ اور ”یم راج“۔

سوئمبر کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک رسم تھی جو ہندوؤں میں رائج تھی۔ اس رسم میں لڑکی اپنا پتی خود تلاش کرتی ہے۔ آدھی صدی کے بعد میں دوسرا حوالہ "اڈیس “کا ہے۔ "اڈیس“ یونانی رزمیہ داستان کا مرکزی کردار ہے۔ جس کے قصے ہر کسی کو معلوم ہیں۔

”اڈیس“ آوارہ خرامی کی علامت ہے۔ تیسرا حوالہ اس نظم میں ”قاف “کا ملتا ہے۔ قاف ایک پہاڑ کا نام ہے جو تاریخی اعتبار سے اہم ہے۔ عبد الحلیم شرر نے ”فردوس بریں“ میں اس پہاڑ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہمارے پرکھوں کا خیال ہے کہ اس پہاڑ میں پریاں آباد ہیں۔ ”آدھی صدی کے بعد“ میں چوتھا حوالہ ”شانگری لا “کا ہے۔ شانگری لا مشہور زمانہ ناول،، لاسٹ سوریراں،، کا ایک شہر ہے۔ جو تبت میں واقع ہے۔ وزیر آغا اس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”وقت تھم چکا ہے اور لوگوں کی عمریں طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئیں ہیں۔ اس شہر کو دوسری جنگ عظیم کے دوران شہرت ملی ہے۔ جب ایک سوال کے جواب میں کہ مشرق البعید میں امریکہ کے فوجی اڈے کس کس مقام پر ہیں اور ویلٹ نے مسکرا کر کہا یہ اڈے شانگری لا میں واقع ہیں ”[۶۷]

نظم کا اگلا حصہ ”لچھمن ریکھا“ ہے۔ اس واقعے میں سیتا اور رام کی بے پناہ محبت کو دکھایا گیا ہے۔ سیتا رام سے ہرن کے شکار کی خواہش کرتی ہے۔ رام سیتا کے ایک اشارے پر جان نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ وہ جب شکار کی غرض سے اپنی کٹیا چھوڑتا ہے تو اپنے چھوٹے بھائی لچھمن سے کہتا ہے کہ تم سیتا کی حفاظت کرنا بہت دیر ہو جانے کے بعد سیتا لچھمن سے کہتی ہے وہ رام کو تلاش کرنے کی غرض سے کٹیا چھوڑے۔ لچھمن بھائی کے حکم کی تعمیل چاہتا تھا اور سیتا کی حفاظت کے لیے رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ سیتا کے بار بار اصرار پر وہ رام کی تلاش کے لیے

راضی ہو جاتا ہے۔ جاتے وقت لچھمن کٹیا کے گرد ایک لکیر کھینچ دیتا ہے اور سیتا کو کہتا ہے کہ وہ اس لکیر کو کسی بھی صورت عبور نہیں کرے گی کیونکہ سیتا کی جان کو خطرہ تھا۔ بعد میں سیتا سے بھی رہا نہ گیا اور اس نے وہ لکیر عبور کر دی۔ راون جو اس خاندان کا جانی دشمن تھا وہ سیتا کو اٹھا کر لنکا لے جاتا ہے۔

اس طویل نظم میں آخری حوالہ "یم راج،، کا ملتا ہے۔،، یم راج،، ہندو دیومالا میں موت کے فرشتے کو کہتے ہیں۔ یہ تمام حوالے وزیر آغا کی نظم "آدھی صدی کے بعد میں" بتدریج درج ہیں۔ جن کو وزیر آغا نے منظوم طریقے سے پیش کیا۔ "آدھی صدی کے بعد،، کے حوالے سے وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ”میری یہ نظم بیسویں صدی کے پچاس سالوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ان پچاس سالوں میں ملکی اور شخصی سطح پر جو واقعات رونما ہوئے وہ اس نظم کا موضوع نہیں ہیں مگر ان واقعات اور سانحات نے میری زندگی کے اندر جو گھاؤ پیدا کیا اور جو نشیب و فراز جنم دیے۔ ان سب کی باز آفرینی اور ان کے وسیلے سے زندگی کے پر اسرار معنی تک رسائی کی کوشش۔ بس یہی اس نظم کا میدان تگ و تاز ہے“[۶۸]

نظم ”آدھی صدی کے بعد “میں بہت سی خوبیاں کار فرما ہیں۔ جن میں ڈرامائی کیفیت، تحیر اور کثر المعیشت کے اوصاف واضح نظر آرہے ہیں۔ ان خوبیوں کو موجودہ دور کے ایک بڑے نقاد ڈاکٹر ناصر عباس نئیر نے اپنی تنقیدی کتاب "دن ڈھل چکا تھا،، میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نئیر لکھتے ہیں:

> وزیر آغا نے ”آدھی صدی کے بعد“اپنے باطن یا محسوسات کے (Growth) کے عمل کو صورت پذیر کیا ہے۔ اس لیے نظم میں ذات کے چند بنیادی میلانات سمٹ آئے ہیں۔ جن عوامل نے وزیر آغا کے باطن کو ساخت پذیر کیا وہ بھی سامنے آ گئیں۔ اس نظم میں وہ پہچان اور عرفان کے ایک خاص زاویے کو بیان کرتے ہیں جسے وزیر آغا کے تصورات حیات کا نام دیا جا سکتا ہے“[۶۹]

”آدھی صدی کے بعد“ کے حوالے سے نجمہ منصور کچھ اس طرح اظہار خیال کرتی ہیں:

"۱۹۸۱ء میں وزیر آغا کی شاہکار طویل نظم "آدھی صدی کے بعد" شائع ہوئی۔ بعد میں اس کے انگریزی، ڈینش، ہندی، بنگالی، پنجابی اور دیگر زبانوں میں تراجم بھی ہوئے۔ اصل میں یہ نظم کی صورت میں ان کی اپنی کہانی ہے۔ جو ان کی زندگی کے پچاس سالوں کا احاطہ کرتی ہے"[۷۰]

"آدھی صدی کے بعد" کے حوالے سے اختر حسین لکھتے ہیں:

"وزیر آغا کی طویل نظم آدھی صدی کے بعد ایک ایسی کائناتی روح ہے جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا انکار خود اپنی حقیقت کا انکار ہے۔ قاری خود ایک طویل نظم بن جاتا ہے۔ یہ وزیر آغا کا فن ہے"[۷۱]

اشفاق احمد کا خیال ہے کہ:

"اس نظم کی ایک خصوصیت امیجری ہے۔ اس طویل نظم میں وزیر آغا نے امیجری کا ایسا التزام کیا ہے کہ ان کی زندگی کے مختلف واقعات متحرک تصویروں کے روپ میں سامنے آجاتے ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے سماعت، بصارت اور لمس سے تعلق رکھنے والی امیجری کا امتزاج کیا ہے"[۷۲]

اسد بدا عوانی نے بھی "آدھی صدی کے بعد" پہ قلم اٹھایا ہے ان کے خیال میں:

"خود کلامی کا جو اسلوب اس نظم میں نظر آتا ہے اس کی مثال اس سے پہلے اردو دنیا میں نہیں ملتی۔ یہ نظم ترسیل و تحقیق کا سنگم معلوم ہوتی ہے۔ "آدھی صدی کے بعد،، کا آہنگ ایک نرم رو دریا کا بہاؤ ہے۔ جس کے دونوں کناروں پر درختوں کی قطاریں اور سبزے کے فیض ہیں۔ جس کے ساحل آسودگی کے ساتھ دیکھنے والوں کو دعوت نگاہ دیتے ہیں"[۷۳]

محمد علی صدیق کا خیال ہے کہ:

"آدھی صدی کے بعد" میں وزیر آغا ایک ایسے شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں جنھوں نے اپنی تمام نظموں کو ایک بڑی نظم میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے تا کہ وہ صرف ایک نظم کے ذریعے ہی اپنی شعری حثیت اور فکری میلانات میں تغیر و تبدل کا احاطہ کر سکیں۔ یہ یقینی طور ایک اہم نظم ہے۔ اور اس نظم

کے ذریعے شاعر اور اس کے ارد گرد کے مابین ایک گہرا ربطہ ہے۔ جو تاریخ اور
ثقافت کی پاتال میں اتر تا چلا جاتا ہے"[۴۷]

اپنی آپ بیتی سنانے کا ہر شخص خواہشمند ہوتا ہے۔ کیوں؟۔۔۔شاید اس لیے بھی کہ ہر شخص اپنے اندر خود ایک جہان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور پنہاں رکھی ہوتی ہے۔ وہ اپنی اس خوبی کو لکھ کر دوسروں تک پہنچانے کا مشتاق ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا سیاست کے میدان میں بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ وہ بتانا چاہتے ہیں کہ سیاست میں ان کا کیا کردار رہا۔ بعض لوگ خود کو زمانے والوں کے خلاف پیش کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ رائی سے پہاڑ بن جاتے ہیں۔ مقصد ہر طرح سے اپنی ذات کو ابھارنا ہوتا ہے۔ اس کے بر عکس وزیر آغا کی اس نظم میں شاعر کا مقصد صرف اپنی ذات کو نمایاں کرنا نہیں ہے بلکہ اپنی اس آپ بیتی میں دوسرے لوگوں کو بھی شامل کرنا ہے۔ جو زندگی کے ہر میدان میں وزیر آغا کے ساتھ چلتے ہوں۔ ان لوگوں میں آغا جی کے ہمجولی، اساتذہ، بزرگ، سنگی بیلی اور دشمن بھی شامل ہیں۔ ان تمام لوگوں کی وجہ سے آغا جی کی آپ بیتی مکمل ہوئی ہے۔ اس آپ بیتی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ قاری خود سامع بن جاتا ہے۔ اس آپ بیتی کو پڑھتے ہوئے قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ میں وزیر آغا کی کہانی نہیں پڑھ رہا بلکہ خود اپنی ہی کہانی پڑھ رہا ہوں۔ ایک اچھے ادیب کی پہچان ہی یہی ہے کہ اس کا لکھا ہوا جب کوئی
پڑھے تو اس کو محسوس ہو کہ میں اپنی کہانی پڑھ رہا ہوں۔ یہ ایک خوبصورت طویل نظم ہے۔ اس طویل نظم کی تعریف میں بہت سے لوگ سامنے آئے ہیں۔ جن میں ڈاکٹر انور سدید، رفیق سندیلوی، رشید نثار، غلام ثقلین نقوی، فضیل جعفری، جان عالم اور طارق حبیب شامل ہیں۔ یہ نظم موضوع اور ہئیت کے اعتبار سے ایک مکمل نظم ہے۔ اس نظم میں موضوع اور ہئیت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ہم چاہ کر بھی موضوع اور ہیت کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ شاعر نے تخیلاتی سفر بڑی خوبصورتی کے ساتھ مکمل کیا ہے۔
راجندر سنگھ بیدی اس نظم کو Great Event کہتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کا خیال ہے:

"The publication of Wazir Agha's " Half a century late" is indeed a great event. One of the greatest moderen Urdu poem and the first long poem in Urdu of its own kind. Late a century later delighs, the reader by its charming creativeness and subtle

amagery. Authenticity of emotion and experience

are visible in every line" ۴۵؎

اس نظم میں وزیر آغا خود کو ایک کوہ پیما سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح ایک کوہ پیما پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے ہوئے بہت سی مشکلات کو جھیلتا ہے تو اس کی رفتار بہت کم ہوتی ہے۔ چوٹی سر کرنے کے بعد جب پہاڑ کی دوسری جانب اترا جاتا ہے تو رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اترتے ہوئے خطرے سے نمٹنے کے لیے وہ کسی جھاڑی یا چٹان کا سہارا لیتا ہے اور چند منٹ رکتا ہے۔ اس کا وہ رکنا دراصل اس کی سوچ کو اس کے گزرے سفر کی طرف اس کو لے جاتا ہے جو اس نے چوٹی کو سر کرتے کیا ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے اسے سفر کے شروع میں لے جاتا ہے وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس نے اس سفر کے دوران کتنی مشکلوں کو جھیلا ہے۔ کن کن رکاوٹوں کو عبور کیا ہے۔ کہاں کہاں اس کو سکون ملا اور کہاں کہاں موت اس کے ساتھ ہم کلام ہوتی رہی۔ وزیر آغا نے بھی ایک کوہ پیما کی مثال دے کر اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ نظم وزیر آغا کی پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ اس نظم پر مشرقی و مغربی ہر طرح کے ناقدین نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وزیر آغا کی یہ نظم دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ ناقدین نے اس نظم کو ہر حوالے سے تسلیم کیا ہے۔ A. Russel کا خیال ہے:

"A special quality of this poem " Half a Century later" comes through as the reader attempts to decpher the meaning of images defining. The passage of soul...... The surface structure lends itself to an attempt at sensuous picturisation of the stuff of the poems experience and yet image elude The grasp They veer towards The multilaterality of preganat suggestion. The translator one feels has brought to poetry lovers a unique performance" ۴۶؎

ڈاکٹر کرشنا سری بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"Wazir Agha is a poet of unexcelled excellences.

Its poetry collection have stratled The parnassian

world. Recently he went to sweden. Nobel Prize is
must for him"[۷۷]

ڈاکٹر ستیہ پال آنند جدید اردو نظم کا ایک بڑا حوالہ ہیں۔ انھوں نے بھی وزیر آغا کی نظموں کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ڈاکٹر ستیہ پال آنند وزیر آغا کی شاعری سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ اس نظم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"Dr. Wazir Agha is a haloed name is modern Urdu poetry. in more then half a centry , he has excelled in writing both in the " Ghazal " and the "Nazam" forms of urdu verse"[۷۸]

ان تمام حوالوں سے جو بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وزیر آغا کی نظم آدھی صدی کے بعد اپنے اندر بہت سے اسلوبی پہلو کو سموئے ہوئے ہے۔ اس نظم میں زندگی کی حقیقتوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں وزیر آغا نے علامتی انداز سے زندگی کے مختلف ادوار کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس میں زندگی کا سفر ایک جھرنے سے شروع ہو کر سمندر پر ختم ہوتا ہے۔ درمیان ندی اور دریا کا بھی بہت اہم کردار ہے۔ دریا اور ندی وزیر آغا کی زندگی کا سنہری دور ہے۔ یعنی جوانی اور جوانی کے بعد کا دور۔ جوانی چوں کہ انسان کے اندر جذبات ابھارتی ہے۔ انھی جذبات کی وجہ سے انسان دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں سے ٹکر لے لیتا ہے اور پھر کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ المختصر کہ وزیر آغا نے "آدھی صدی کے بعد" میں لفظوں کی جادوگری دکھائی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ جدید اردو نظم میں اپنا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وزیر آغا اسی نظم کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

"میں ایک بازار کی رونق والے حصے سے گزر رہا تھا۔ اس وقت ایک احساس میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے بچپن میں جن بچوں، جوانوں، بوڑھوں کو اس بازار میں مصروف روزگار دیکھا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر پہاڑ کی چوٹی سے اس طرف نشیب میں کہیں کھو چکے تھے۔ مگر بازار ابھی تک وہی ہے"[۷۹]

بچپن، جوانی، بڑھاپا تقریباً ہر انسان کی زندگی میں آتا ہے۔ ہر دور کی اپنی ہی چاشنی ہے۔ انسان جس جس دور سے گزرتا ہے اس کی مہک اس کے جسم کے اندر سرائیت کر جاتی ہے۔ وزیر آغا "آدھی صدی کے بعد،، کے ذریعے اپنی واپسی کا سفر باندھتے ہیں اور واقعات ان کی آنکھوں سے سامنے خود بخود آتے جاتے ہیں۔ اس نظم کو شاعر نے جس طرح چار حصوں میں تقسیم کر کے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ جھرنا شاعر کے

بچپن کا زمانہ ہے۔ جہاں بے شمار حماقتیں سر زد ہوتی ہیں۔ پھر وہ پر شور ندی میں ڈھل کر چٹانوں سے ٹکراتا ہوا نظر آتا ہے یہ اس کی جوانی کا دور ہے، پھر دریا کا روپ دھار کر بڑے بڑے میدانوں کو چیر تا ہوا مصروف سفر دکھائی دیتا ہے یہ دور دریا کا دور ہے۔ آخر میں یہ دریا بھی خود کو سمندر کے حوالے کر دیتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ جھرنا، ندی، دریا اور سمندر تو صرف سانچے ہیں پانی جس سانچے سے بھی گزرتا ہے اپنی صورت تبدیل کر لیتا ہے۔ وزیر آغا نے واپسی کے سفر کا ارادہ اس غرض سے کیا کہ میں وہاں جاؤں جہاں سے میں آنکھیں بند کر کے گزر گیا تھا۔ اس سے وزیر آغا نے واپسی کا سفر اختیار کیا اور تمام واقعات کو ایک نظم کی شکل میں جوڑ کر لکھ دیا۔ وزیر کی نظم "آدھی صدی کے بعد" میں زیادہ حوالے نہیں ملتے لیکن جو حوالے موجود ہیں ان سے ہر قاری تقریباً اچھی طرح واقف ہے۔ وزیر آغا کی اس منظوم آپ بیتی کا تفصیل سے مطالعہ کرنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ شاعر نے "آدھی صدی کے بعد" میں اپنی زندگی کے پچاس سالوں کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ واقعات کو کبھی تشبیہ، کبھی استعارہ اور کبھی تلمیحات کا سہارہ لے کر بیان کرتے ہیں۔ "آدھی صدی کے بعد" میں شاعر نے کئی جگہوں پر بڑی خوب صورت تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ یہاں چند ایک تشبیہات کو مثال کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔

چاند جیسے جسم، رنگوں جیسے پر' قاف کی پری جیسا شہزادہ وغیرہ وزیر آغا نے جہاں تشبیہات کا استعمال کیا ہے وہاں استعارات کو بھی بڑی عمدگی کے ساتھ برتا ہے۔

مثلاً ریشمی انگلیاں' جلتی ہوئی شام' ستاروں کا گلزار' شوخ آنکھیں وغیرہ

"آدھی صدی کے بعد" میں شاعر نے روزمرہ اور محاورات کا استعمال بھی کیا تاکہ اس آپ بیتی کا حسن اور بھی نکھر جائے۔ "آدھی صدی کے بعد" میں استعمال ہونے والے روزمرہ اور محاورات میں آنکھ لگنا، خود کو پڑھنا، عارض کی رنگت، جوانی کی تصویر دیکھنا، غم کھانا، سونے کے کنگن کا حلقہ اور میں ہر روز یہاں آتا ہوں وغیرہ۔

"آدھی صدی کے بعد "اُردو کی پہلی طویل نظم ہے جس میں وزیر آغا نے اپنے حالاتِ زندگی کو شعری کالم میں بیان کیا ہے۔"آدھی صدی کے بعد "میں ویزر آغا نے غلاظت، تعفن، گالی اور بد بو جیسے کلیدی الفاظ مرتب ہونے والی تخلیقی شخصیت کی اساس ہیں اور اس میں خوف بھی موجود ہے۔ اس نظم میں تلمیحاتی انداز تعریف کے قابل ہے۔ وزیر آغا نے اس نظم میں کہیں کہیں علامتی انداز میں بات کی ہے۔ وہ بڑ کے درخت کی محبت کو ایک ماں کی محبت جیسا قرار دیتا ہے۔"آدھی صدی کے بعد "فنی و اسلوبی حوالے سے ایک کامیاب نظم ہے۔ یہ نظم وزیر آغا کا سوانحی تجربہ ہے۔ جس میں وزیر آغا نے اپنے ماضی پر پھر سے نظر ڈالی تو ان کو یوں لگا کہ زندگی کسی پہاڑ پر چڑھی تھی اور اب اترتی دکھائی دیتی ہے۔"آدھی صدی کے بعد "میں خارجی اور داخلی دونوں طرح کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہ دونوں طرح کے عناصر جب ملتے ہیں تو ان نظم کو مکمل صورت عطا کرتے ہیں۔ اس نظم کی بحر متدارک سالم مثمن ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر کی تقطیع ملاحظہ کیجئے۔

| شب کا پچھ | لا پہر | پھڑ پھڑا | کے ستا | رے گھنی | گھاس کی |
|---|---|---|---|---|---|
| فاعلن | فاعلن | فاعلن | فاعلن | فاعلن | فاعلن |
| نوک پر | آسمان | سے اتر | تی نمی | اور پو | رب کا ما |
| فاعلن | فاعلن | فاعلن | فاعلن | فاعلن | فاعلن |
| تھے پہ قش | قے کا مد | دھم نشان | | | |
| فاعلن | فاعلن | فاعلن | | | |

جب کسی ادبی فن پارے کو کامیاب بنانا ہو تو اس وقت ادیب اور شعرا اس فن پارے میں مختلف زبانوں کے الفاظ کو داخل کرتے ہیں۔ اس طریقہ کار کو وزیر آغا نے بھی " آدھی صدی کے بعد " میں برتا ہے۔ مختلف زبانوں کے الفاظ کی امیزش کی وجہ سے اس آپ بیتی میں مزید چاشنی آئی ہے۔ وزیر آغا نے فارسی الفاظ کو بڑے سلیقے کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ فارسی زبان کے الفاظ میں ژولیدہ بال، برہنہ بدن، نرم بوسا، مانوس بدن، خنک چاندنی اور نصف شب شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وزیر آغا نے عربی، ہندی، انگریزی اور سنسکرت

زبان کے الفاظ کو اس آپ بیتی میں داخل کر کے "آدھی صدی کے بعد" کے حسن میں مزید اضافہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

وزیر آغا کی یہ نظم ان کی زندگی کے بہترین پچاس سالوں کی مکمل تصویر کشی کرتی ہے۔ گویا یہ نظم وزیر آغا کے پچاس سالوں کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے جس کا ہر رنگ، ہر ڈھنگ پڑھنے والے کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

# حوالہ جات


۱۔ اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر و روایت (منتخب مقالات) محسنہ نقوی، ڈاکٹر، پروفیسر، فرحان رضا پرنٹرز، راولپنڈی، ۲۰۰۵، ص، ۲۵

۲۔ ہیئتی تنقید، محمد حسن، ڈاکٹر، کاروانِ ادب، لاہور، ۱۹۸۹ء ص، ۱۱

۳۔ فیروز اللغات، اردو (جدید ترتیب اور اضافوں کے ساتھ)، مرتبہ، الحاج مولوی فیروز الدین، مرحوم، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، کراچی، راولپنڈی، ۲۰۰۵، ص، ۱۱۷۰

۴۔ علمی اردو لغت، وارث سرہندی، ایم اے، علمی کتب خانہ لاہور، ص، ۱۱۷۰

۵۔ جہانگیر اردو لغت (جامع ترین) جہانگیر بکس، ۱۹۲۳ء ص، ۱۵۷۳

۶۔ ایڈوانس اردو لغت، آن لائن

۷۔ ناول کیا ہے؟ احسن فاروقی، ڈاکٹر، درد اکادمی شاہ عالم مارکیٹ، لاہور، ۱۹۶۴، ص ۶۷

۸۔ اردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر، ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸، ص، ۲۸، ۲۷

۹۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۰۔ عنوان چشتی، ڈاکٹر، اردو شاعری میں ہئیت کے تجربے، انجمن ترقی اردو، دلی، ۱۹۷۵ء ص، ۱۸۸

۱۱۔ شمیم احمد، اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، تخلیق مرکز، لاہور، سن اشاعت ندارد، ص، ۱۷۲

۱۲۔ خاطر غزنوی، جدید اردو ادب، سنگِ میل، پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵، ص، ۱۶۹

۱۳۔ ڈاکٹر محمد حسن، جدید اردو ادب، غضنفر اکیڈمی، کراچی، سن اشاعت ندارد، ص، ۱۷۳

۱۴۔ شمیم احمد، اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، تخلیق مرکز، لاہور، سن اشاعت ندارد، ص، ۱۷۳

۱۵۔ صدیق کلیم، فکر سخن، ارسلان پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۳، ص، ۲۰۵

۱۶۔ جدید اردو نظم کا مطالعہ، ڈاکٹر رام منوہر اردو یونیورسٹی، تحقیقی مقالہ، ۲۰۰۹ء ص، ۱۴

۱۷۔ ایضاً ص، ۱۴۰

۱۸۔ ایضاً، ص، ۶۶

۱۹۔ ایضاً، ص، ۶۷

۲۰۔ سجاد باقر رضوی، مغرب کے تنقیدی اصول، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء ص، ۲۳۲

۲۱۔ ایضاً، ص، ۳۴۲

۲۲۔ شمس الرحمان فاروقی، طویل نظم، مختصر نظم، مضمون مشمولہ اوراق، لاہور، جلد ۱۹، شمارہ ۴، ۳، مارچ، اپریل ۱۹۸۴ء ص، ۵۱، ۵۰

۲۳۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، ''اِک کتھا انوکھی کا تجزیاتی مطالعہ ''لاہور، ۲۰۰۳ء ص، ۱۳

۲۴۔ رفیق سندیلوی، وزیر آغا، ڈاکٹر، ''شخصیت و فن ''ص، ۳۳۴

۲۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''آدھی صدی کے بعد ''مکتبہ اردو زبان، ریلوے، سرگودھا، ۱۹۸۱ء ص، ۱۸

۲۶۔ ایضاً، ص، ۲۰

۲۷۔ ایضاً، ص، ۲۲

۲۸۔ ایضاً، ص، ۲۴

۲۹۔ غلام الثقلین نقوی، سید، ''آدھی صدی کے بعد ''مضمون مشمولہ، نام کا سورج، مرتبہ، ڈاکٹر انور سدید، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۹۱۸۹، ص، ۳۳۴

۳۰۔ ارمان نجمی، بیاضِ شب و روز، کاغزی پیر ہن، لاہور، ۲۰۰۱ء ص، ۶۰

۳۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''آدھی صدی کے بعد ''مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۸۱، ص، ۳۱

۳۲۔ ایضاً' ص، ۳۱

۳۳۔ ایضاً، ص، ۳۴

۳۴۔ ایضاً، ص، ۳۶

۳۵۔ ایضاً، ص، ۳۹

۳۶۔ ایضاً، ص، ۴۱

۳۷۔ ایضاً، ص، ۴۴

۳۸۔ ایضاً، ص، ۴۷

۳۹۔ ایضاً، ص، ۴۹

۴۰۔ ایضاً، ص، ۵۱

۴۱۔ ارمان نجمی، ''بیاض شب و روز''، کاغذی پیر ہن، لاہور، ص، ۶۰

۴۲۔ وزیر آغا، دیباچہ، ''آدھی صدی کے بعد''، ۱۹۸۱ء ص، ۶

۴۳۔ غلام الثقلین نقوی، سید، ''آدھی صدی کے بعد ''مضمون مشمولہ، ''شام کا سورج''، ص، ۳۳

۴۴۔ رشید نثار، ڈاکٹر، ''وزیر آغا اور ہمارا عہد''، پنڈی اسلام آباد ادبی سوسائٹی، راولپنڈی، ۱۹۹۸، ص، ۱۳۲
۴۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''آدھی صدی کے بعد''، مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۸۱ء ص، ۵۷
۴۶۔ ایضاً، ص، ۶۱
۴۷۔ ایضاً، ص، ۶۳
۴۸۔ ایضاً، ص، ۶۶
۴۹۔ ایضاً، ص، ۶۹
۵۰۔ ایضاً، ص، ۷۲
۵۱۔ ایضاً، ص، ۷۵
۵۲۔ ایضاً، ص، ۷۹
۵۳۔ ایضاً، ص، ۸۴
۵۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''شام کی منڈیر سے''، مکتبہ فکر و خیال' لاہور ۱۹۸۶ء ص، ۹۴
۵۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، "آدھی صدی کے بعد''، مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۸۱ء ص، ۹۱
۵۶۔ ایضاً، ص، ۹۳
۵۷۔ ایضاً ص، ۹۵
۵۸۔ ایضاً، ص، ۹۷
۵۹۔ ایضاً، ص، ۱۰۱
۶۰۔ ایضاً، ص، ۱۰۳
۶۱۔ رشید نثار، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر وزیر آغا اور ہمارا عہد''، فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، ۱۹۹۸ء، ص، ۱۳۰
۶۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''شام کی منڈیر سے''، مکتبہ فکر و خیال لاہور ۱۹۸۶ء ص، ۲۵۳
۶۳۔ محمد وزیر آغا، ڈاکٹر، ''آدھی صدی کے بعد''مکتبہ اردو زبان، ریلوے، سرگودھا، ۱۹۸۱ء ص، ۳۷
۶۴۔ شمیم حنفی، ''شام کے ساتھ طلوع ہوتا ہوا سورج''، مشمولہ شام کا سورج، ۱۹۹۸ء ص، ۹۲
۶۵۔ شہزاد احمد، ''شام کی منڈیر سے''، مشمولہ شام کا سورج، ۱۹۹۸ء ص، ۱۰۰
۶۶۔ رفیق سندیلوی، ''ڈاکٹر وزیر آغا شخصیت اور فن''، ص، ۱۳
۶۷۔ وزیر آغا، ''دیباچہ آدھی صدی کے بعد''ص، ۷۷
۶۸۔ ایضاً، ص، 78

۶۹۔ ناصر عباس نیئر، ڈاکٹر، ”دن ڈھل چکا تھا“، ”نظموں کا تجزیاتی مطالعہ“، مکتبہ نردبان، سرگودھا، ۱۹۹۳ء ص، ۱۰۴، ۱۰۵

۷۰۔ نجمہ منصور، ”وزیر آغا کا ادبی سفر“، سرگودھا رائٹرز کلب، سرگودھا، سن ندارد، ص، ۱۰

۷۱۔ اختر احسن، ”آدھی صدی کے بعد“، ”مضمون مشمولہ شام کا سورج“ص، ۳۹۱

۷۲۔ اشتیاق احمد، ”وزیر آغا کی شاعری“، ص، ۱۸۵

۷۳۔ اسعد بدایوانی، ”وزیر آغا کی شاعری“، مضمون مشمولہ شام کا سورج، ص، ۴۲۳، ۴۲۴

۷۴۔ محمد علی صدیقی، ”وزیر آغا اپنی ذات میں دبستان“، مشمولہ شام کا سورج، ص، ۲۵۳۶

۷۵۔ راجندر سنگھ بیدی، "Half century later" مشمولہ Presented to Wazir Agha سرگودھا اکیڈمی سن ندارد، ص، ۴

۷۶۔ A Rusel with Refrence F, Presented to Wazir Agha, Sargodha writers club, Sargodha, P, 26

۷۷۔ Karishna Srinivas, Dr, " As Above" P, 26

۷۸۔ Satyapal Anand, Dr, " As Above" P, 33

۷۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ”آدھی صدی کے بعد“ مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۸۱، ص، ۶، ۵

# باب سوم

# "آئینہ در آئینہ" کا ہیئتی و اسلوبی مطالعہ

## الف۔ "آئینہ در آئینہ" کا ہیئتی مطالعہ:

اردو شاعری کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ اپنی شاعری کی ابتدا میں تقریباً ہر شاعر نے اپنے خیالات کو بیان کرنے کے لیے پہلے پہل غزل کا سہارا لیا۔ اس کے بعد بہت سی نظمیہ اصناف متعارف ہوئیں جنھوں نے ہر زمانے میں تہلکہ مچایا۔ زمانے میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادبی مزاج بھی بدلتا رہا ہے۔ کیوں کہ معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ شعرا اور مصنفین بھی اپنے ذائقے بدل لیتے ہیں ۔ شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک حصہ غزل ہے جبکہ دوسرا نظم سے ہے۔ یعنی غزل کے علاوہ باقی تمام اصناف کا تعلق نظم سے ہے۔

تاریخی، لسانی اور ادبی لحاظ سے دکن علم و ہنر کی بہتری کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہا۔ دکن ایک ایسی سر زمین ہے جس نے بہت نامور ادبا و شعرا پیدا کیے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کی وجہ سے باغ اردو آج تک پھل پھول رہا ہے۔ دکن میں ہر طرح کی شعری و نثری اصناف کو اپنایا گیا۔

اس تحقیقی مقالہ کے باب سوم میں حمایت علی شاعر کی مشہور منظوم آپ بیتی کا ہیئتی و اسلوبی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ حمایت علی شاعر کی منظوم آپ بیتی مثنوی کی ہیئت میں ہے اس لیے آئینہ در آئینہ کا اسلوبی مطالعہ کرنے سے پہلے اس نظم کا ہیئتی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔ تاہم اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کا آغاز وارتقا بیان کر لیا جائے۔ فیروز اللغات کے مطابق: (مث،ن،وی) دو دو والا

> "مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی دو دو والا کے ہیں۔ اصطلاح میں مثنوی فارسی صنفِ ادب ہے اور وہیں سے اردو میں آئی ہے۔"[1]

مثنوی لفظ تو عربی کا ہے۔ لیکن فارسی میں اس کو زیادہ فروغ ملا۔ عربی میں مثنوی کی کوئی صنف ہمارے سامنے نہیں آتی۔ مثنوی کی بحر چھوٹی ہوتی ہے۔ لیکن شروع سے اختتام ایک ہی ہوتی ہے۔ قصیدے اور غزل میں ردیف اور قافیے کی پابندی ہوتی ہے۔ اس لیے ان میں طویل واقعات بیان کرنے مشکل ہوتے ہیں۔ مثنوی اس لحاظ سے آزاد ہوتی ہے۔ کہ اس میں قافیہ کو تبدیل کر کے واقعات کو نئے سرے سے بیان کیا

جاسکتا ہے۔ مثنوی کے اشعار میں تعداد کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ بالکل مختصر مثنویاں بھی لکھی جاسکتی ہیں۔ اور طویل مثنویاں بھی لکھی جاسکتی ہیں۔ صرف ایک بات کا خیال ضروری ہے کہ واقعات اور اشعار ایک دوسرے سے مربوط ہونے چاہیں۔ مثنوی کسی بھی موضوع پر لکھی جاسکتی ہے۔ مثنوی کے موضوعات میں حسن و عشق، مناظر فطرت، فلسفہ و حکمت، واردات قلبی، رزم و بزم، اخلاقیات و تصوف، تاریخی فرضی، تخیلاتی قصے، عاشقانہ داستانیں اور لوک کہانیاں یہ سب مثنوی کے موضوعات میں شامل ہیں۔ ایک بہترین مثنوی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اشعار ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوں۔ جس طرح ایک زنجیر کی کڑیاں مل کر اس کو ترتیب دیتی ہیں بالکل ایسے ہی مثنوی کی تکمیل کے لیے اس کے اشعار مل کر اس کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ مثنوی میں ہر واقعہ پہلے واقعے کے ساتھ جڑا ہوا ہونا چاہیے۔ کردار ایسے ہونے چاہیں کہ موقع محل کے مطابق گفتگو کرتے ہوتے نظر آئیں۔ مثنوی کا اسلوب آسان اور عام فہم ہونا چاہیے۔ روز مرہ و محاورات کا استعمال صحیح طریقے سے ہونا چاہیے۔ جب کوئی بھی ادبی فن پارہ تخلیق کیا جاتا ہے تو وہ کسی نہ کسی مخصوص ہیٔت میں سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر حنیف کیفی کے مطابق "جو چیز تصور سے اتر کر تصویر میں آجاتی ہے۔ ہم اس کو ہیٔت کہہ سکتے ہیں۔"[۲]

اس بات میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ خیالات جب اظہار چاہتے ہیں تو ان کے لیے دو ہی طریقے ہمارے پاس ہیں ان میں سے ایک تقریر کا طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ تحریر کا ہے۔ ہم جب خیالات کو تحریری لباس پہناتے ہیں تو کوئی نہ کوئی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ قاری اس تحریر کے ذریعے سے اس ادبی فن پارے کی ہیٔت کو سمجھنے میں آسانی محسوس کرے گا۔ فیروز اللغات کے مطابق ہیٔت سے مراد ہے:

"بناوٹ، ساخت، شکل، صورت، طور، طریق وغیرہ۔"[۳] ہیٔت ایک پیمانہ ہے جس میں کسی چیز کو ڈال کر اس کی شکل وصورت بنائی جاتی ہے۔ ہیٔت کے حوالے سے لوگوں کے دیے گے تصورات میں کہیں کہیں اختلاف نظر آتا ہے۔ محمد حسن عسکری نے ہیٔت کو نظر کا دھوکہ کہا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ہیت کو خواب پریشان کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"صورت ذہنیہ سے لے کر صورت جسمیہ تک جو کچھ ہے وہ ہیت ہے۔ دراصل خیالات جذباتی گریک کی مانند ہوتے ہیں۔ جو کسی ادیب یا شاعر کو لکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ محققین نے ہیٔت کے دائرے میں تکنیک ، آہنگ ، لفظیات وغیرہ کو شامل کر کے اس دائرے کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ کسی بھی ہیٔت کے تعارف کے لیے مواد پہلی ترجیح ہے۔ اس مواد کے پیچھے فن کار کا ذہن ہوتا ہے جو کہیں نہ کہیں اپنے منتشر

خیالات کو اکٹھا کر کے ترتیب دے رہا ہوتا ہے۔ جب وہ خیالات ترتیب دیے جا چکے ہوتے ہیں۔ تو پھر ان کو وہ فن کار قرطاس پر قلم کی زبان سے بکھیر تا چلا جاتا ہے۔ تحریر یا انداز میں ہمارے پاس کوئی نہ کوئی فن پارہ آجاتا ہے جس کی کوئی نہ کوئی صورت ہوتی ہے۔ اردو نظم نگاری کی بات کریں تو اردو نظم میں بھی ہئیت کے بہت سے تجربات ہو چکے ہیں جھنوں نے اردو نظم کو ایک نئی جہت سے آشنا کرایا ہے۔ ماضی میں صرف پابند نظم لکھنے کا ہی رواج تھا۔ تاریخ سے ہمیں پتا چلتا ہے اور لوگوں نے کھل کے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔""[۴]

اردو میں پہلے ریختے لکھنے کا رواج تھا اس کے بعد چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی جانے لگیں جو مثنوی کی ہیئت پہ تھی۔ ان مختصر مثنویوں میں عربی اور فارسی کی تراکیب کا کثرت سے استعمال ان مثنویوں کی زینت تھا۔ جس زمانے میں مثنوی لکھنے کا رواج عام تھا اس وقت صوفیائے کرام کے بیان اور خطابات کو مثنوی کی شکل میں محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ پہلے دور کی مثنویوں میں "پھول بن" اور "قطب مشتری"، کی تصویر ہمارے ذہین میں اترتی ہے۔ مثنوی کے حوالے سے دکن بہت زرخیز زمین معلوم ہوتی ہے دکن دور کی ابتدائی مثنوی خواب ترنگ ہے۔ شعری اصناف میں مثنوی کا میدان باقی اصناف سخن کے مقابلے میں زیادہ بڑا ہے۔ مثنوی ایک ایسی صنف ہے جس میں افسانویت اور شعریت ایک ہی وقت میں پائی جاتی ہے۔ مثنوی میں خیالات وکیفیات کو پیش کرنے کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ اردو میں منظوم داستانون کی بات کریں تو ان کا نقطہ آغاز مثنوی کی صورت میں ہی ہمارے سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے مگر عربی میں اس حوالے سے کوئی صنف موجود نہیں ہے۔ چونکہ اردو ادب فارسی ادب کے زیر اثر ہی پروان چڑتا ہے اور فارسی میں مثنوی بہت مقبول صنف شاعری ہے۔ فارسی کی بہت سی مثنویاں عالمی ادب میں اپنا الگ مقام کی حامل ہوتی ہے۔ جس طرح ہر صنف کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے۔ اور وہ صنف ایک خاص عہد میں خاص مقام رکھتی ہوتی ہے۔ بالکل ایسے ہی مثنوی نے بھی ایک خاص عہد میں بہت نام کمایا ہے۔ جب غزل عروج پر پہنچی تو بھی مثنوی کی اہمیت کم نہ ہوئی۔ اگر مثنوی کی ہیئت کی بات کریں تو اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق قوافی میں تبدیلی ہوتے رہتے ہیں۔ مثنوی ہزاروں اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم کا نام ہے۔ جس میں ہئیتی اعتبار سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ مثنوی نثری داستان کی طرح اپنے واقعات میں ربط وتسلسل رکھتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر احسن مارہروی لکھتے ہیں:

> "نظم کی تمام اصناف میں مثنوی ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اس کی وسعت اس کی ہمہ گیری اور اس کے فوائد سب سے زیادہ اور سب پر حاوی ہیں۔

جذبات جس خوش اسلوبی اور روانی سے مثنوی میں سما سکتے ہیں۔ اتنی گنجائش کسی صنف سخن میں نہیں۔ زندگی کے تمام سوانح رزمیہ یا عشقیہ ہوں یا اخلاقی۔ فلسفیانہ ہوں یا افسانہ غرض کہ تخیل کی کھپت مثنوی میں ہوتی ہے۔ اس آسانی اور وسعت کا سبب یہ ہے کہ مثنوی میں بہ لحاظ قافیہ وردیف ہر شعر جداگانہ ہوتا ہے۔ یہ قصیدہ وغزل کی طرح ایک ہی قافیہ پر اس کی بنیاد نہیں ہوتی۔ اشعار کی تعداد بھی محدود نہیں۔ ایک سے ہزار بلکہ لاکھوں تک اختیار ہے۔"[۴]

مثنوی کسی بھی موضوع پر قلم بند کی جاسکتی ہے۔ مثنوی کے موضوعات میں جنگ وجدل، تصوف، عشق وحسن تہذیب واخلاق، تاریخ، اور سوانح سب کچھ شامل ہے لیکن اردو میں عشقیہ مثنویوں کی تعداد زیادہ ہے۔ دور جدید میں قافیہ، ردیف، ربط وتسلسل کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ بعد میں شعرا نے نئے تجربات کیے ہیں۔ جن میں حمد، نعت، منقبت، مدح حاکم اور دعا وغیرہ کو بھی مثنوی کے اجزائے ترکیبی میں شامل کیا گیا۔ یہ لوازمات مثنوی کے اصل ارکان میں شامل نہیں ہیں۔ پروفیسر عتیق صدیقی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"حقیقت تو یہ ہے کہ مثنوی نگار شعرا نے صرف بیان وواقعات، قصہ اور اس میں ابتدا انتہا اور اختتام کو ملحوظ رکھا ہے۔ اب اس کو چاہیے ارکان مثنوی سمجھا جائے یا مثنوی کے لوازم۔"[۵]

حالی کو اردو تنقید کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ مقدمہ شعر وشاعری تنقید کے حوالے سے الطاف حسین حالی کی بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ حالی نے اردو مثنوی پر تنقید کرتے ہوئے درج ذیل اصول بیان کیے ہیں۔

ا: "ربط کلام ہو جو کہ ہر مثنوی اور مسلسل نظم کی جان ہے۔

۲: جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اس کی بنیاد ناممکن فوق العادت باتوں پر نہ رکھی جائے۔

۳: مبالغہ آرائی سے گریز کرنی چاہیے کہ جو کسی چیز کے حسن کو ختم کر دے۔

۴: حالات کے مطابق کلام میں نکتہ چینی کرنی چاہیے۔ بالخصوص قصے کے بیان میں ایسا ضروری ہے۔

۵: جو حالت جس چیز کی بیان کی جائے وہ نیچر اور عادت کے مطابق ہو۔

۶:	قصے میں کچھ باتوں کا لحاظ ضروری ہوتا ہے۔ کہ ایک بیان دوسرے بیان سے انکار نہ کرے

۷:	قصے میں ایسی باتیں جن کا واضح الفاظ میں کہنا ضروری نہیں ہے۔ ان واقعات کو علامتی انداز میں بیان کیا جائے"[۶]

حمایت علی شاعر کی منظوم آپ بیتی "آئینہ در آئینہ "مسلسل نظم کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ اور "آئینہ در آئینہ "میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ حقیقی زندگی کے بہت قریب ہیں۔ آئینہ در آئینہ میں مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا جاتا تو وہ اس آپ بیتی کی خامی سمجھا جاتا اور فنی اعتبار سے "آئینہ در آئینہ "ایک ناقص آپ بیتی سمجھی جاتی۔ آئینہ در آئینہ میں وقت وحالات کے مطابق واقعات میں نکتہ چینی کی گئی ہے۔ اگر بے موقع نکتہ چینی کی جاتی تو یہ بھی اس منظوم آپ بیتی کے حق میں اچھا نہیں تھا۔ "آئینہ در آئینہ "میں حمایت علی شاعر نے جو واقعات بیان کیے ہیں ان میں ربط ہے اور واقعات نیچر اور عادات کے مطابق ہیں۔ "آئینہ در آئینہ "کے اندر ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جو مشاہدے کے خلاف ہو۔ "آئینہ در آئینہ "میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو واضح طور پر نہیں کہنی چاہیے تھیں شاعر نے ان کو علامتی انداز میں بیان کر کے بات کو آگے بڑھایا ہے۔

الطاف حسین حالی کے بعد مثنوی پر تنقیدی نظر مولانا شبلی نعمانی نے بھی ڈالی ہے۔ انہوں نے بھی کچھ اصول اپنی شہرہ آفاق کتاب شعر العجم میں بیان کیے ہیں۔

> "حسن ترتیب، کریکٹر، کریکٹر کا اتحاد، واقعہ نگاری واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ جس چیز کا بیان کیا جائے۔ اس طرح کیا جائے کہ جس طرح ایک ماہر فن کرتا ہے۔ یعنی اس کی تمام اصل خصوصیات و جزئیات بیان کی جائیں۔ واقعہ نگاری میں جزوی باتوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ واقعہ نگاری میں ایسی بات نہ آئے جس سے واقعہ ناممکن یا مشکوک ہو جائے"[۷]

"آئینہ در آئینہ "میں واقعات ترتیب میں بیان کیے گے ہیں مثال کے طور پر چند واقعات کو پیش کیا جارہا ہے۔

"یہ ایک شہر ہے جس کو سب اورنگ آباد کہتے ہی
یہاں پہ صدیوں سے میرے بزرگ رہتے ہیں
بہت زمانہ ہوا اس کا نام کھڑکی تھا
جو فتح خان کے ہاتھوں فتح نگر بھی ہوا
پھر اس کے بعد مغل دست برد میں آیا

اور اس پہ پڑ گیا اورنگ زیب کا سایا
یہ آج بھی ہے اسی بادشاہ سے منسوب
وہ بات کل تھی جو ناخوب آج ہو گی خوب" [۸]

***

"یہ ایک طویل کہانی ہے چھوڑیے اس کو
مآل اس کا غلامی ہے چھوڑیے اس کو
منافقت ہے، سیاست ہے، بادشاہت ہے
ہزار سال سے اپنی یہی روایت ہے
ہر ایک راز مشیت کے راز کے مانند
رموز مملکت خویش، خسرواں دانند
فرنگیوں کی سیاست سے کون ہے آگاہ
زوال عہد مغل ہے عروج آصف جاہ [۹]

***

میں اپنے شہر پہ ایک نظم لکھ چکا تھا کبھی
میری کتاب میں شامل ہے پڑھ چکے ہیں سبھی
گر اس نہ گزرے تو اک بار اور پڑ لیجیے
یہ اپنے عہد کا سچ ہے بغور پڑھ لیجیے" [۱۰]

واقعات کی ترتیب کے حوالے سے اگر بات کریں تو "آئینہ در آئینہ" میں واقعات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط نظر آتے ہیں۔ اس منظوم آپ بیتی کا نقطہ آغاز اورنگ آباد شہر ہے جس میں شاعر کے اباؤ اجداد نے اپنی زندگی گزاری ہوتی ہے۔ دوسرا واقعہ پہلے واقعات کے ساتھ جڑا ہوا نظر آتا ہے کہ جب اس شہر کو انگریز پوری طرح سے اپنے کنٹرول میں کر لیتے ہیں۔ تو حاکم محکوم بن کر زندگی گزارنے لگتے ہیں اور اس شہر میں منافقت، سیاست، حسد جیسی بد خصلتیں جنم لیتی ہیں۔ اس طویل منظوم آپ بیتی کا تیسرا واقعہ بھی پہلے دونوں واقعات ہی کی ایک کڑی نظر آتا ہے۔ حمایت علی شاعر نے اپنے عہد کے انتشاری دور کی بہترین عکاسی اپنی نظم کے ذریعے کی ہے۔ اور اپنے عہد کا جو سچ تھا اس کو اپنی اس آپ بیتی میں لکھا ہے اس کے بعد والے تمام

واقعات کی بھی اگر بات کریں تو ہر واقعہ پہلے واقعے کے ساتھ مربوط نظر آتا ہے اور یوں ایک طویل نظم ”آئینہ درآئینہ “تکمیل کو پہنچتی ہے۔

گزشتہ چند صفحات میں حالی اور شبلی کے کچھ قائم کردہ اصول درج کیے گے ہیں جو بعض ناقدین کے نزدیک تشنگی کا شکار ہیں چوں کہ ان میں جذبات نگاری اور زبان و بیان کو کسی حد تک نظر انداز کیا گیا ہے۔ حالاں کہ اگر حقیقت پر مبنی بات کریں تو یہ ساری چیزیں جو حالی اور شبلی نے نظر انداز کی ہیں مثنوی کے لیے ضروری ہیں۔ حالی اور شبلی کے وضع کردہ اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے گیان چند جین نے مثنوی کی چند خصوصیات یہ بیان کی ہیں۔

”۱: حسن تعبیر

۲: زبان و بیان

۳: کردار نگاری

۴: منظر نگاری

۵: جذبات نگاری

۶: ہم عصر تہذیب کی مرقع کشی“[۱۱]

اردو مثنوی کا آغاز دکن کی سرزمین سے ہوتا ہے۔ کدم راؤ پدم راؤ دکنی دور کی سب سے پرانی مثنوی ہے جس کو فخر الدین نظام نے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ دکنی دور کی قدیم مثنویاں جو صوفیانہ رنگ میں لکھی گئی ہیں ان میں اشرف بیابانی کی مثنوی نوسرہار، فیروز الدین کی سید ہاشم اور شمس العشاق میرا ں جی کی مثنویاں قابل ذکر ہیں۔ قطب مشتری وجہی کی مشہور زمانہ مثنوی ہے اس مثنوی کو بہت زیادہ شہرت ملی ہے۔ غواصی کی سیف الملوک وبدیع الجمال مقیمی کی طوطی نامہ، ملک خوشنود کی ہشت بہشت، ابن نشاطی کی پھول بن، نصرتی کی گلشن عشق اور رستمی کی خاور نامہ دکن کی بہترین اور مشہور مثنویاں ہیں ان مثنویوں میں چند ایک میں قصے کے پیرائے میں جذبات نگاری سے کام لیا گیا ہے اور چند ایک ایسی ہیں جن میں مافوق الفطرت عناصر کی بھرمار ہے۔ ان مثنویوں میں کہیں کہیں اسلامی روایت کا رنگ ملتا ہے تو کہیں کہیں عشقیہ، تاریخی، رزمیہ مثنویاں بھی ملتی ہیں شمالی ہند میں مثنوی نگاری کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ دبستان دہلی میں مثنوی کے حوالے سے جو پہلا نام ہمارے سامنے آتا ہے وہ بدنام شاعر جعفر زٹلی کا ہے۔ گیان چند جین اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"دلی میں مثنوی نگاری کی ابتدا کا شرف بدنام شاعر جعفر زٹلی کے ہے۔"[۱۲]

جعفر زٹلی کی مثنویوں کے حوالے سے گیان چند چین نے ظفر نامہ اور نگ زیب اور طوطی نامہ کا ذکر کیا ہے اس کے بعد فائز کا نام بھی آتا ہے۔ جس میں مختصر مثنوی نگاروں کا حوالہ ملتا ہے۔ جن میں آبرو، ذکی، فضائل، علی میر و سودا وغیرہ شامل ہیں۔ میر کی اکثر مثنویاں سماجی اور معاشرتی موضوعات پر لکھی گئی ہیں لیکن شعلہ عشق کا موضوع الگ ہے۔ سودا نے مزاحیہ اور ہجویہ مثنویاں لکھیں۔ میر و سودا کے عہد کے بعد کچھ نئے لوگوں کا نام آتا ہے۔ جنھوں نے اس صنف پر قلم اٹھایا ہے ان میں میر اثر، جعفر علی خان، حسرت، انشا، رنگین مومن اور داغ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

قدیم اردو مثنوی کی بات کریں تو دبستان لکھنؤ میں بھی اردو مثنوی نگاروں نے خوب جوہر دکھائے ہیں اس دور کے ابتدائی مثنوی نگاروں میں مصحفی کا نام قابل ذکر ہے۔ مصحفی نے مثنوی کے میدان میں بہت کام کیا۔ مصحفی نے تقریباً بیس کے لگ بھگ مثنویاں قلم بند کی ہیں۔ لیکن کرالمحبت سب سے نمایاں مثنوی ہے۔ اس دور کی ایک اور بہترین مثنوی "نیرنگ عشق" بھی ہے۔ مثنوی کی لکھنوی تاریخ میں عیش، اختر، ناسخ، میر جعفر فصیح اور اشک وغیرہ کے نام سر فہرست ہیں۔ ان مثنوی نگاروں نے صرف طبع آزمائی کے لیے مثنویاں لکھیں۔

لکھنوء میں مثنوی کا معیار دور وسط میں عروج کو پہنچا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب میر حسن کی مثنوی سحر البیان دبستان دلی میں اپنا مقام حاصل کر چکی تھی۔ اس حوالے سے پروفیسر عبدالقادر سروری کہتے ہیں:

> "متوسط دور میں مثنوی کا معیار لکھنؤمیں دراصل میر حسن کی "مثنوی سحر البیان،، کے لکھے جانے کے بعد بلند ہوا۔ حسن اتفاق سے یہ مثنوی لکھنؤ کے ادبی ارتقا کے ابتدائی زمانہ میں لکھی گئی اور اس لیے بعد کے مثنوی نگاروں کے سامنے ایک بلند معیار قائم ہو گیا۔ اس معیار تک پہنچنے کی اکثر نے سعی کی لیکن وہاں تک نہ پہنچ سکے۔"[۱۳]

میر حسن سے پہلے شمالی ہند میں غزل کی مقبولیت کا دور تھا لیکن مثنوی اور غزل ایک ہی دور کی پیداوار تھی اور دونوں مقبول ترین اصناف تھیں۔ میر حسن نے ایک قصے کو بے نظر اور بدر منیر کے کرداروں کے ذریعے مثنوی کے قالب میں اور اردو شاعری کے میدان کو سعت عطا کی اس کے بعد تخلیق کاروں میں ایسا شوق پیدا ہوا کہ وہ زیادہ تر مثنویاں ہی لکھنے لگے۔ لکھنوء اور دلی اردو مثنوی کے حوالے سے بہترین مراکز سمجھے

جانے لگے۔ مثنوی سحر البیان کو ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ گلزار تسنیم جیسی ایک اور نایاب مثنوی منظر عام پر آگئی۔ مگر اصل میں مثنوی لکھنے کا رواج ,, سحر البیان ،، کے بعد شروع ہوا۔ گلزار نسیم دبستان لکھنؤ کی شاہکار مثنوی مانی جاتی ہے۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں شعر وشاعری کی محفلیں عروج پر تھی ان میں صنائع وبدائع اور باقی شعری نزاکتوں کی بھرمار تھیں اور تشبیہ واستعارات کی وجہ سے گلزار نسیم میں اختصار پایا جاتا ہے۔ اختصار اس مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اس ساری بحث کے بعد ایک محقق جس نتیجے پر پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ اردو غزل کے بعد جس صنف نے شہرت حاصل کی ہے وہ مثنوی ہی ہے غزل اپنے اختصار کی وجہ سے مقبول ہے جبکہ مثنوی اپنے داستانی عناصر کی وجہ سے قاری کو اپنے طلسم کے اندر جکڑ لیتی ہے اور قاری مثنوی کو پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کچھ مثنویاں بہت مختصر ہیں اگر ان کے چند اشعار کو الگ کر کے بیان کریں تو غزل کے اشعار ہونے کا شک گزرتا ہے۔ مثنوی میں تمدنی زندگی کے بہت سے نشان ملتے ہیں جو نہ صرف ادب کے لیے بلکہ تہذیبی تاریخ کے نقطہ نظر سے بھی بہت اہم ہیں۔ انسان نے ہمیشہ کچھ نیا تلاش کرنے میں عمر گزاری ہے۔ انسان کی تمام کوششوں میں سب سے زیادہ اہم کوشش اس کی فن کاری ہے جس کی جڑیں انسان کی اپنی ذات کے اندر بہت دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ فن فن فنکار کی بدولت ہی آشنائی حاصل کرتا ہے ہر دور کا فن فن کار کی بدولت ہی زندہ ہے فنون لطیفہ کی پوری تاریخ کو چھان لیں تو ہمیں جو فن زیادہ موثر ملے گا وہ الفاظ کا فن ہے۔ کیوں کہ الفاظ کے فن کے ذریعے کسی بھی چیزیں میں جان ڈالی جاسکتی ہے۔ مثلاً اگر لکھاری کسی شخصیت کا خاکہ اپنے الفاظ میں لکھتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شخصیت زندہ و جاوید ہمارے سامنے کھڑی ہم سے باتیں کر رہی ہے۔ ہر ایک صنفِ ادب نے ہی اپنے اپنے دور میں خوب نام کمایا ہے مگر نثری اصناف کے مقابلے میں شعری اصناف زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ بڑی سے بڑی بات کو دو مصرعوں میں یوں بیان کر دیا جاتا ہے۔ کہ اس کے پیچھے پورا واقعہ نظر آنے لگتا ہے شاعری دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ شاعری ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کو اپنا موضوع بناتی ہے۔ اردو شاعری نے مختلف اصناف کے ذریعے بہت نام پیدا کیا ہے۔ تاہم تحقیقی موضوع کی مناسبت سے ہم یہاں مثنوی ہی کی بات کریں گے۔ "آئینہ در آئینہ "حمایت علی شاعر کی ایک طویل منظوم آپ بیتی ہے جس کی ہئیت مثنوی ہے۔ اس منظوم آپ بیتی میں شاعر نے واقعات کو منظوم شکل میں بیان کیا ہے۔ مثنوی اصل میں ایک طویل نظم ہے جس کے ہر بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اس کے تمام اشعار ایک ہی بحر میں لکھے جاتے ہیں۔ مثنوی میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

"جتنی بھی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں ان میں کوئی بھی صنف مسلسل مضامین کو بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعر عرب کی شاعری پر ترجیح دی جاسکتی ہے"[۱۴]

عبد السلام ندوی مثنوی کے حوالے سے رائے دیتے ہیں:

"یہ ایک مسلسل نظم ہے جس کے اشعار ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتے ہیں جس طرح زنجیر کی ایک کڑی دوسری کڑی سے وابستہ ہوتی ہے۔"[۱۵]

اصناف شاعری میں مثنوی ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ کبھی یہ غزل سے ملتی ہے تو کبھی یہ قصیدے کے بہت قریب نظر آتی ہے۔ چاہیے رزم ہو یا بزم مثنوی ہر جگہ نظر آئے گی۔ مثنوی میں بہترین داستانوں اور اہم مسائل کو نظم کیا گیا ہے مثنوی میں بڑی سے بڑی داستان منظوم شکل میں بیان کی گئی ہے اس کی مثال فردوسی کا شاہنامہ ہے جو تقریباً آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

اس کے علاوہ اردو کی ایک اور بہترین داستان الف لیلی بھی چون ہزار اشعارر پر مشتمل ایک طویل منظوم داستان ہے۔ ان مثالوں سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ مثنوی میں وسعت کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ کلیم الدین احمد اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"غزل اور قصیدے کے مقابلے مثنوی میں زیادہ وسعت اور تنوع کی گنجائش ہوتی ہے۔ مثنوی میں زرمیہ شاعری ہو سکتی ہے اور نئے نئے افسانوں کی ایجاد بھی ہو سکتی ہے۔ اس دنیا کے اندر ہونے والی تبدیلیوں کی تصویر کشی بھی کی جا سکتی ہے۔"[۱۶]

مثنوی کے لچکداری رویے اور وسعت کی بات کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی کہتے ہیں:

"انواع شاعری میں تمام انواع کی بانسبت مثنوعی زیادہ مفید، زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کی جس قدر انواع ہیں سب اس میں نہایت ہی خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں جذبات انسانی، مناظر فطرت واقعہ نگاری اور تخیل ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا۔"[۱۷]

مثنوی کی سب سے بڑی خوبی حقائق نگاری ہے۔ مثنوی نگاروں نے اپنے قصوں میں حقائق کو بڑے احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔ مثنوی کا اسلوب باقی شعری اصناف سے اس لیے بہتر ہے کہ شعرا نے شعری نزاکتوں اور ادبی طاقتوں کو مثنوی کے اسلوب میں بیان کر کے اس کے حسن میں مزید اضافہ کیا ہے۔ مثنوی کے ہر شعر کا قافیہ چونکہ دوسرے شعر سے مختلف ہوتا ہے ۔اس لیے اس کے اندر بات کو تفصیل سے بیان کرنے کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ شاعر کے پاس جب کوئی واقعہ آتا ہے تو یہ اس پر منحصر ہے کہ اس واقع کو کس طرح ترتیب دیتا ہے ۔ شاعر جتنا بڑا فن کار ہوگا اس کی مثنوی اتنی ہی زیادہ کامیاب ہوگی ۔کیوں کہ وہ واقعات کو بیان کرنے کی مہارت رکھتا ہوگا۔ اور جب واقعات کے میں ترتیب کا ایک خاص خیال رکھا جاتا ہے تو یہ بات مثنوی کی سب سے بڑی خوبی میں شمار ہوتی ہے۔ اردو شاعری کی تمام اصناف میں طویل بات کرنت کت حوالے سے سب سے زیادہ بہتر صنف مثنوی ہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بہت گنجائش ہوتی ہے۔ باقی اصناف میں ایسی بات نہیں ہے۔ غزل، قصیدہ میں قافیہ کی پابندی ہوتی ہے شروع سے آخر تک ان میں ایک ہی قافیہ استعمال ہوتا ہے۔ مثنوی ظاہری اور معنوی اعتبار سے شاعری کی ایک اعلیٰ قسم ہے۔ مثنوی میں عشق و محبت، جنگ وجدل کی طویل داستانوں کو منظوم صورت میں بیان کیا جاتا ہے اردو مثنوی کے میدان میں دو بہت ہی معروف مثنوی نگاروں میں میر حسن اور دیاشنکر نسیم کے نام آتے ہیں۔ یہاں بات کو واضح کرنے کیلئے ان کی مثنویوں سے ایک ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

”زمرد کی مانند سبزے کا رنگ

روش پر جواہر لگا جیسے سنگ

روش کی صفائی پہ بے اختیار

گل اشرف نے کیا نثار

چمن سے بھرا باغ، گل سے چمن

کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن

چمن آتش گل سے دہکا ہوا

ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا"[۱۸]

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مثنوی کا ہر شعر مختلف قافیہ رکھتا ہے اور مثال کے طور پر میر حسن کی مثنوی کا ایک اقتباس بھی پیش کیا گیا ہے مگر بات میں تشنگی باقی ہے اس تشنگی کو ختم کرنے کے لیے گلزار نسیم دیا شنکر کی مثنوی سے ایک اقتباس درج کر کے بات کو آگے بڑھایا جائے گا۔

" آیا کوئی لے کے نسخہ نور

لایا کوئی جا کے سرمہ طور

تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور

بینا نہ ہوا وہ دیدہ کور

ہوتا ہے وہی خدا جو چاہیے

مختار ہے جس طرح نیا ہے[۱۹]

ان دونوں اقتباسات پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ واقعی مثنوی کے ہر شعر کا قافیہ دوسرے سے جدا ہے جیسا کہ پہلی مثال میں قافیہ کچھ اس طرح استعمال ہوا ہے۔

"رنگ، سنگ

اختیار، نثار

چمن، سمن

دہکا، مہکا"

ان دونوں مثنویوں کی ہیئتی ترکیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے حمایت علی شاعر کی منظوم آپ بیتی پر بات کی جائے تو واضح طور پر نظر آتا ہے کہ "آئینہ در آئینہ،، میں بھی اسی ہیئتی ترکیب کی اتباع کی ہے" آئینہ در آئینہ،، سے چند ایک اقتباسات یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

"جناب صدر کہ اسلام کے تھے شیدائی
سواپنے دیں کی صدا ، دور دور پہنچائی
سنایا مجلس اقوام میں بھی قراں کو
بہت ہی خوش کیا دنیا کے ہر مسلمان کو
پھر ایک مجلس شوری وطن میں دی ترتیب
نفاذ دین کی نکالی گئی نئی ترتیب"[۲۰]

***

"میں سوچتا ہوں تاریخ کے تمام اوراق
نظر میں آئینہ ہوتے ہیں عکس کے مصداق
وہ فرد ہو کہ جماعت ، امام ہو کہ عوام
سبھی کی ایک حقیقت، سبھی کا ایک ہی کام
ہر ایک شخص جدا، اندروں مگر یکساں
وہ سانس لیے بدن ، بے نیاز حروف وزبان"[۲۱]

دونوں اقتباسات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ہر شعر کا قافیہ دوسرے سے جدا ہے۔ ان میں قافیہ کی ترتیب کچھ یوں ہے

"شیدائی، پہنچائی
قرآن، مسلمان
ترتیب، ترکیب
اوراق، مصداق
عوام، کام
یکساں، زباں"

یوں تو اردو ادب دو انواع یعنی نظم اور نثر پر مشتمل ہے مگر اہلِ ذوق ادب کی اصل خوبصورتی نظم ہی کو سمجھتے ہیں۔ شاعر بڑی سے بڑی بات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ دو مصرعوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ اردو نظموں کی بہت سی اقسام ہیں جن میں مثنوی بھی ایک ہے ہر ایک ادیب و شاعر نے اپنی ذہنی بساط کے مطابق

ہر دور میں قلم آزمایا ہے۔ کیونکہ آزاد خیالی ہر ایک شاعر و ادیب کی میراث ہے۔ ادیب و شاعر اس آزاد خیالی کا سہارا لیتے ہوئے اپنے خیالات کو کاغذ کے ماتھے پر بازبان قلم سے بکھیرتا ہے اور یوں اس کے خیالات کا اظہار تحریری انداز میں مل جاتا ہے جو صدیوں تک محفوظ رہتا ہے۔ انسان کی جبلت میں ہے کہ وہ کچھ کرنے کی جستجو میں محو سفر رہتا ہے۔ دراصل انسان پیدائشی ہی مضطرب ہوتا ہے اور اپنی اس بے چینی کو ختم کرنے کے لیے وہ پہلے کسی نقطے کا تعین کرتا ہے اور پھر اس منزل کو پاکر تسکین پالیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی شاعر بھی انسان ہوتا ہے اور وہ ذہنی الجھائو کا شکار ہوتا ہے۔ لہذا شاعر جو کچھ دیکھتا ہے اس کو دل کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور تحریر کرتا ہے بالکل ایسے ہی حمایت علی شاعر نے بھی حالات کا جائزہ لیا اور جو کچھ دیکھا اس کو من و عن "آئینہ در آئینہ" میں پیش کیا ہے۔ شاید وہ بھی مضطرب تھا اور ذہنی سکون چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنی پوری زندگی کا منظوم قصہ "آئینہ در آئینہ" کی صورت میں لکھ کر ذہنی خلش سے آزادی حاصل کی حمایت علی شاعر نے اس منظوم آپ بیتی میں اپنے فن اور ہنر کو خوب آزمایا ہے۔ "آئینہ در آئینہ" حمایت علی شاعر کی ایک بہترین اور کامیاب منظوم آپ بیتی ہے ۔جو اپنی طوالت کے ساتھ ساتھ فنی خصوصیات سے بھی مالامال ہے۔ "آئینہ درآئینہ" حمایت علی شاعر کی منظوم آپ بیتی مثنوی کی ہیئت یہ لکھی گئی ہے۔ ویسے تو اصناف سخن میں بہت سی اصناف قابل تعریف ہیں۔ مگر ان اصناف میں ایک بہترین صنف مثنوی بھی ہے۔ خواجہ حمید الدین شاہد لکھتے ہیں:

> "اصطلاح شعری میں مثنوی اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں۔ جس کے ہر بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور سب اشعار ایک ہی بحر میں ہوں اس میں غزل کی طرح قافیہ ردیف کی کوئی قید نہیں ہے مناظر فطرت، فلسفہ، تصوف کے طویل مباحث، حسن و عشق رزم و بزم کی داستانیں اس صنف سخن کی بدولت بخوبی نظم ہو سکتی ہیں۔ اور واقعہ نگاری کے لیے اس نوع سے بہتر مشرق کی شاعری میں کو اسلوب نہیں ہے۔" [۲۲]

اردو شاعری میں مثنوی فارسی ہی کی بدولت آتی ہے اپنی گہرائی اور اسلوب کی وجہ سے مثنوی دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کی حاصل ہے۔ فارسی ادب میں تو مثنوی اپنی مثال آپ ہے لیکن اردو میں بھی مثنوی کے ابتدائی نقوش حوصلہ افزا ہیں۔ مثنوی کو ویسے تو پورے ہندوستان میں اپنایا گیا لیکن اگر کسی نے پورے جذبے کے ساتھ مثنوی کو گلے لگایا تو وہ اہلِ دکن تھے۔ دکن والوں کی وجہ سے مثنوی کے میدان میں خاصی وسعت آئی۔ مثنوی موضوع کی آزادی سے بڑی زرخیز ہے۔ اس کائنات کے اندر جو بھی چیز ہے

اس کو مثنوی کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ مثنوی کے زیادہ تر موضوعات ہمیں رزمیہ و بزمیہ ہی ملتے ہیں۔ چند ایک رزمیہ، بزمیہ، متصوفانہ مثنویوں کے نمونے پیش خدمت ہیں۔

قطب مشتری۔۔۔۔۔ ملاوجہی

"تو اول تو آخر تو قادر ہے

تو مالک تو باطن تو ظاہر ہے

محمد نبی نالو تیرا ہے

عرش کے اوپر چھالو تیرا ہے

سو آسماں کہیں در سویوں جگمگے

کہ بھولاں کے منڈویا تارے لگے

ملے قطب ہور مشتری ایک ٹھار

ہوا آج جگ میں انند بے شمار

لیلیٰ مجنوں۔۔۔۔ احمد

اس اللہ کے نالو بسوں سب جگت

جو دانی دیانت اس کی صفت

سرہاتا سب اللہ کوں جسم قرار

جو جگ دہنی اور پرورد گار

تیری آگ تھے جیو میرا جلے

تیری آہ تھے موم ہن تن جلے

رکھا "تصویر جاناں" نام اس کا

من لگن۔۔۔۔۔ محمود بحری

اے روپ تیرا رتی رتی ہے

پربت پربت پتی پتی ہے

جز کل میں چھپے نہ عکس اس کا

یوں بول نہ صاف بل گھس کا

من کایوں محل ہے خوش خدا کا
من نور ہے پاک مصطفیٰ کا

مثنوی کے موضوعات کے حوالے سے اوپر چند ایک مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ جو کچھ رزمیہ اور کچھ بزمیہ ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مثنوی ایسی صنف شاعری ہے جس میں تقریباً ہر چیز کو موضوع گفتگو بنایا جا سکتا ہے اس لیے دی گئی مثالوں میں کسی نے تصوف کو اپنا موضوع بنایا تو کسی نے خدا کی یکتائی کو خوبصورت انداز میں بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ کوئی حسن کی تعریف کے پُل باندھ رہا ہے تو کسی نے محبوب کی کھل کر تعریف کی ہے اور کوئی نبی پاک ﷺ کو اپنے دل کا سکون قرار دے رہا ہے۔ حسن و عشق مثنوی کے بنیادی موضوعات میں آخر پر سراج اورنگ آبادی اپنے محبوب اور اپنے درمیان فرق کو ختم کر دیتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ مجھے صرف میرے محبوب کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ محبوب کی محبت میں اپنی ذات کی نفی کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے اپنی ذات کا فنا ہو جانا ہی اصل عشق کی پہچان ہے۔ مثنوی کے موضوعات میں وسعت پائی جاتی ہے اس لیے اس صنف میں ہر طرح کا موضوع سما سکتا ہے۔ ادب اپنی تہذیب سے بہت زیادہ اثرات قبول کرتا ہے۔ ادب جس دور میں تخلیق ہو رہا ہوتا ہے وہ اس تہذیب کا ظاہری پیکر بھی ہوتا ہے۔ اس لیے جب کسی جگہ ادب پر بحث ہو گی وہاں تہذیب پر بھی بات ہو گی۔ تہذیب میں رسم و رواج، کھانے پینے کی اشیاء، زبان، لباس، موسم، جغرافیائی حدیں، مذہب سب کچھ آتا ہے۔ ایک تہذیب ان تمام چیزوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن بعض لوگ رنگ و نسل پر تہذیب کی بنیاد رکھتے ہیں ان کے خیال میں کسی جگہ پر ایک جیسے لوگوں کا ایک ساتھ صدیوں سے رہنا ہے جو ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کلچر کے حوالے سے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ "ایک سیاسی انتظامیہ کے تحت زندگی گزارنے والوں کا کلچر ایک ہوتا ہے"[۲۳]

حمایت علی شاعر کی منظوم آپ بیتی "آئینہ در آئینہ" میں بھی ہندوستان کے مقامی کلچر کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس منظوم آپ بیتی میں شاعر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی اس نظم میں ہندوستان کی تہذیب کو بیان کیا ہے۔ اس منظوم آپ بیتی کے آغاز میں شاعر نے اپنے اباؤاجداد کے شہر اورنگ آباد کا ذکر کیا ہے جو تاریخی و ادبی اعتبار سے اہم شہر تھا۔ اس

کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب کے قدیم نقوش کو بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا جن میں تاج محل، راج محل، مقبرہ، مغل دور کا عروج وزوال، فرنگی دور کا اختتام، وغیرہ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس شہر کی علمی و ادبی حثیت کو بیان کرتے ہوئے وہ طریقت کے بول بالے کا بھی تذکرہ کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ اردو نے کیسے ترقی پائی اس کا حوالہ بھی ہمیں اس منظوم آپ بیتی میں ملتا ہے خاص طور پر اردو کی ترقی کے حوالے سے ایک رسالہ ''اردو'' جاری ہوتا تھا کہ جس نے اردو کی ترقی وترویج میں اہم کردار ادا کیا کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اس منظوم آپ بیتی میں ہندوستان کی خالص تہذیب کو بیان کیا ہے۔ شاہوں اور گداؤں کے رہن سہن پر بھی بڑی تفصیل سے بات کی گئ ہے۔ شاعر نے اس ملک کو جنت سے کم نہیں کہا ہے۔ وہ ہندوستان کی محبت میں لکھتے ہیں:

''یہی جنت ہے، یہی تحریک مجلس
میرے پھولوں کا، خاروں کا وطن
سحر دم جن کو کفنایا گیا ہے
یہ ان خورشید پاروں کا وطن''[۲۴]

''آئینہ در آئینہ'' اس حوالے سے اردو کی بہترین منظوم آپ بیتی ہے کہ یہاں واقعات میں ربط کا بڑی گہرائی سے خیال رکھا گیا ہے۔ واقعات اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں کہ قاری پڑھتے ہوئے یہ محسوس نہیں کرتا کہ کہیں کوئی خلا موجود ہے۔ اس آپ بیتی کی ایک اور خوبی اس کا حسن ترتیب ہے کہ واقعات کی ترتیب درست ڈگر پر ہوتی ہے۔ مثنوی میں واقعات کا آغاز کیسے کیا جاتا ہے اور آخر تک خاص ترتیب کا خیال رکھا گیا یا نہیں۔ کن واقعات پر زیادہ توجہ دی گئ اور کن واقعات کا سرسری جائزہ بیان لیا گیا ہے۔ اس حوالے سے علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''اگر ان تمام مراحل میں سے شاعر کامیابی سے گزرا ہو تو حسن ترتیب میں
بہر حال کامیاب سمجھا جائے گا''[۲۶]

''آئینہ در آئینہ'' میں حسن ترتیب کا بھی خاص خیال رکھا گیا۔ واقعات آپس میں مربوط اور جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہیں ایسا نہیں ہے کہ شاعر نے تاریخ کو بیان کرتے ہوئے بیچ راہ میں چھوڑ کر محبوب کی بات شروع کر دی ہو یا موسم کی انگڑائی کو بیان کیا ہو بلکہ پہلے پورے واقعے کو بڑی تفصیل سے بیان کرنے کے

بعد اس سے ملتا جلتا دوسرا واقعہ بیان کیا ہے۔ اس طرح یہ منظوم آپ بیتی جو مثنوی کی ہئیت پر لکھی گئ ہے کامیاب آپ بیتی کہلاتی ہے۔ مثنوی کی بہت سی خوبیوں کی طرح ایک بڑی خوبی مبالغہ آرائی سے گریز کرنا ہے۔ اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی بات ایسی نہ بیان کی جائے جس کا حقیقت سے تعلق نہ ہو۔ ایسے واقعات کو ہی مثنوی میں شامل کیا جاتا ہے جو مشاہدے سے گزرے ہوں۔ اس حوالے سے مولانا شبلی نعمانی اپنے احساسات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

> ’’شاعر جب کسی بات کو اپنی شاعری میں لکھتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ بیان میں کوئی ایسی بات نہ آئے جس سے واقعہ مشکوک ہو جائے۔ یہ نقص مختلف اسباب سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی جو واقعہ بیان کیا جائے حقیقت میں ہوتا ہے اور نہیں بھی۔ لیکن واقعہ وقت و حالات کے لحاظ سے ناممکن ہے کہ واقعہ اس صورت سے ظاہر کیا جائے کہ دل میں اتر جائے‘‘[۲۷]

مثنوی میں زبان و بیان اور نفس مضمون قرین فطرت ہونا چاہیے یہ شرائط دوسری اصناف سخن کے حوالے سے بھی بہت اہم تصور کی جاتی ہیں اس شرط سے حقیقت پسندی سے شاعر جڑا رہتا ہے حالیؔ اور نظیر کی شاعری کو دیکھیں تو انھوں نے ہندوستانی تہذیب کو بہت بہتر انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نقط نظر کو سامنے رکھتے ہوئے حالیؔ نے اپنی رائے کو بڑی سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں:

> ’’شعر میں ایسی باتیں کرنی چاہیں جیسی کہ دنیا میں ہمیشہ ہوا کرتی ہیں یا ہوں گی ‘‘[۲۸]

حالیؔ اور نظیرؔ نے خالص ہندوستانی تہذیب کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے عوام کے دکھ درد کو بیان کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ حالیؔ اور نظیرؔ نے گل و بلبل، عاشق و معشوق کے فرسودہ موضوعات سے انحراف کرتے ہوئے کسانوں، غریبوں، بیوؤں، محتاجوں، عورتوں المختصر کہ ہر طبقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے مظلوم انسان کو سماج کے اندر ہونے والے جبر کو پورے وثوق کے ساتھ اپنی شاعری میں شامل کیا۔ نظیرؔ اکبر آبادی کو اس حوالے سے عوامی شاعر کا خطاب ملا۔

### ب۔ آئینہ در آئینہ کا اسلوبی مطالعہ:

ریاست حیدر آباد دکن کا شمار ہندوستان کی ایسی ریاستوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو کی ترقی میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ یہ ایک خود مختار ریاست تھی جس کا اپنا سکہ رائج الوقت تھا۔ یہ ریاست ملک عنبر کی ریاست

تصور کی جاتی تھی۔" آئینہ در آئینہ "کا نقطہ آغاز اسی ریاست سے ہوتا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ منظوم آپ بیتی پورے ہندوستان کی تہذیب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یوں تو عام تحریر اور شاعری میں زمین اور آسماں کا فرق ہوتا ہے۔ عام تحریر میں مصنف علامتی انداز میں بات نہیں کر سکتا جبکہ شاعری میں شاعر اشاروں، کنایوں اور تلمیحات میں بڑی سے بڑی بات کو بیان کر سکتا ہے۔ شاعر علامتی انداز کے ذریعے سے کہیں سچ کو پس پردہ کر دیتا ہے۔ زندگی انسان اور خالق کے درمیان سمجھوتے کا دوسرا نام ہے۔ جیسے جیسے انسان کی عقل درست ڈگر پر چلنا شروع کرتی ہے تو انسان اپنا مقصد تخلیق تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ میرا اس کائنات میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ تب جا کر انسان اپنی ذات کا تعین کرتا ہے۔ پھر انسان ان تمام سوالات کے جوابات خود تلاش کر کے خود کو مطمئن کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ انسان کا اضطراب ختم نہیں ہوتا ہے بلکہ مزید گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ حمایت علی شاعر ایک پورے عہد کا نام ہے۔ ہم ان کی پوری زندگی کا مطالعہ کر کے ان تصانیف کو پڑھ کے ان کے متعلق اچھی طرح جان سکتے ہیں حمایت علی شاعر کی منظوم آپ بیتی "آئینہ در آئینہ" کا تفصیل سے مطالعہ کرنے کے بعد ایک قاری جو حمایت علی شاعر کے صرف نام سے واقف تھا ان کی پوری زندگی کے متعلق بہت کچھ جان جاتا ہے۔" آئینہ در آئینہ "ایک طویل منظوم آپ بیتی ہے جو اکاون اقساط میں تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس آپ بیتی میں حمایت علی شاعر نے اپنی زندگی کے تمام زیر و بم کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔" آئینہ در آئینہ "کا مطالعہ کرتے وقت یوں پتہ چلتا ہے کہ ہم خود حمایت علی شاعر ہیں اور ہندوستان کے گلی کوچوں میں سفر کر رہے ہیں۔ کبھی فکر و فاقہ کا ڈر، کبھی ہجرت کے آسیب، کبھی اپنوں کی جدائی کا خوف سب کچھ قاری خود محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ حمایت علی شاعر نے اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو ایک ادبی ہفت روزہ "نگار" میں بھی پیش کیا ہے جس کا عنوان "شاعر کی کہانی شاعر کی زبانی" ہے۔ حمایت علی شاعر ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا تعلق کسی حد تک فلم کی دنیا سے بھی رہا ہے۔ اس لیے ایک ادیب جو فلم انڈسٹری سے بھی منسلک ہو وہ ضرور جانتا ہوتا ہے کہ لوگوں کی دلچسپی کے عین مطابق تحریروں کو کیسے پروان چڑھایا جاتا ہے۔ اس میں حمایت علی شاعر نے "نگار" میں جو اپنی آپ بیتی بیان کی ہے وہ کسی حد تک ادھوری ہے حمایت علی شاعر نے اس میں صرف فلم انڈسٹری کو ہی موضوع بنایا ہے جبکہ منظوم آپ بیتی میں شاعر نے زندگی کے ہر گوشے کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ حمایت علی شاعر نے ریڈیو پاکستان، کراچی سے بھی اپنی یادداشتیں تیرہ اقساط میں زبانی سنائی تھیں جن کو ریڈیو پاکستان نے ریکارڈ کر لیا تھا۔ لیے حمایت علی شاعر کی پوری زندگی کا مطالعہ کریں تو ہمیں

معلوم ہو گا اس متنوع شخصیت نے ادبی میدان میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ اور خاص طور پر ان کی منظوم آپ بیتی میں انھوں نے اپنی زندگی کو کھول کر بیان کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ شاعری ایک خداداد صلاحیت ہے۔ لیکن شعر کہنے کے لیے بھی کسی حادثے کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ حمایت علی شاعر کی پوری زندگی حوادث سے بھری پڑی ہے۔ اپنی شاعری کے حوالے سے حمایت علی شاعر نے ایک بہت اہم بات کی ہے کہ سعادت حسن منٹو کے ساتھ کرشن چندر بھی انھیں بہت پسند تھے وہ کہتے ہیں کہ ان کی نثر میں بڑی چاشنی تھی۔ شاید کہ ان کو پڑھنے کے بعد میرے اندر کے شاعر کو بھی طاقت ملی کہ وہ بھی کچھ کہ سکے۔ میرے اندر کی تشنگی کو ختم کرنے کے لیے میرے اندر کے شاعر نے شاعری کے "صفا و مروہ" پر کئی بار بڑی تیزی کے ساتھ چکر لگائے تب ہی جا کر خدا کو میری کوششیں پسند آئیں اور میرے اندر سے شاعری کا چشمہ پھوٹا اور میں بھی شعر کہنے لگا۔ اس سے پہلے اگر حمایت علی شاعر کے خاندانی پس منظر کو دیکھا کیا جائے تو ان کے گھرانے میں حمایت علی شاعر سے پہلے کوئی شاعر نہیں تھا۔ ان کے دادا فوج میں ملازم تھے جبکہ والد پولیس میں نوکری کر رہے تھے ۔ جبکہ دوسرے قریبی رشتہ داروں میں زیادہ تر مولوی حضرات تھے۔ شاید یہ خوبی حمایت علی شاعر کی ذات میں ان کی والدہ کی طرف سے آئی ہوئی ہو والدہ جو بچپن ہی میں خالق حقیقی سے جاملی تھیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ کم سنی ہی میں والدہ جیسی نعمت سے اس محرومی نے اس شخص کو شاعر بننے پر مجبور کر دیا ہو حمایت علی شاعر نے اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ ایک طویل منظوم آپ بیتی لکھ کر ان حادثات کا اظہار کیا۔ حمایت علی شاعر اردو ادب میں بہترین فن کار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ چاہے قلم کی دنیا ہو یا چاہے فلم انڈسٹری ہو انھوں نے ہر جگہ اپنا لوہا منوایا ہے۔ حمایت علی شاعر نے قلم کے ذریعے سے لفظوں کے موتی پرو کر ادب سے تعلق رکھنے والوں کو بہت بڑا تحفہ عطا کیا ہے۔ وہ زندگی میں ہر میدان میں پیش پیش نظر آتے ہیں انھوں نے درس و تدریس کا کام بھی بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ صحافت کے میدان میں بھی صف آرا رہے ہیں۔ مگر ان کا اصل میدان شاعری ہے اور شاعری میں بھی حمایت علی شاعر کی ساری شاعری ایک طرف اور منظوم آپ بیتی ''آئینہ در آئینہ ''ایک طرف ہے۔ حمایت علی شاعر نے آئینہ در آئینہ میں خود کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ''آئینہ در آئینہ '' حمایت علی شاعر کی وجہ شہرت ہے جو ایک طویل منظوم آپ بیتی ہے۔ اس آپ بیتی میں حمایت علی شاعر الفاظ کا جال بچھا کر قاری کو اس کے اندر قید کر لیتا ہے۔ قاری اس آپ بیتی کے طلسم میں ایسا قید ہو جاتا ہے کہ اس کو مکمل کیے بغیر چین ہی نہیں آسکتا۔

حمایت علی شاعر اپنے زمانے کے ایک کامیاب شاعر گزرے ہیں۔ جب کسی فن کار کا عروج چل رہا ہوتا ہے تو اس کو مخالفین سے بھی بہت زیادہ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ ایسا ہی حمایت علی شاعر کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ ان کو علم و ادب کے میدان بہت سارے نقادوں کا سامنا رہا ہے مگر یہ خود پہ ہونے والی تنقید کو بڑی گہرائی سے قبول کر کے اپنی کمزوریوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اردو کی پوری تاریخ کو دیکھا جائے تو ہر دور میں بڑے بڑے شعرا نے اپنا بہترین کلام اپنے چاہنے والوں کے لیے چھوڑا ہے۔ شعر و ادب کی آبیاری اپنے دل سے نکلے ہوئے لفظوں سے کی ہے بالکل ایسے ہی حمایت علی شاعر نے بھی اردو ادب کے گلشن کو آباد کرنے کے لیے اپنا بہت سا کلام چھوڑا ہے۔ حمایت علی شاعر نے نہ صرف شاعری کی ہے بلکہ کچھ نئی ایجادات بھی کی ہیں مثلاً ثلاثی یک مصرعی نظم اور پھر خاص طور پر اردو ادب میں طویل خود نوشت جو اردو شاعری میں پہلا تجربہ ہے۔ویسے تو اردو سے تھوڑا بہت تعلق رکھنے والا ہر شخص حمایت علی شاعر کے نام سے واقف ہے۔ حمایت علی شاعر نے اپنی پر شور نظموں کے ذریعے سے ادب کے بڑے شعرا میں اپنا نام پیدا کیا ہے۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ کلام ترنم سے پڑھنا بھی جانتے تھے اس لیے وہ ترنم سے شاعر ی پڑھنے والے چند نمایاں شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ حمایت علی شاعر نے اپنی معیشت کو بہتر بنانے کیلئے ریڈیو میں ملازمت اختیار کی۔ ان کا ریڈیو میں بڑا بہترین وقت گزرا ہے۔ ریڈیو میں کئی فیچر لکھے تقریریں، گیت اور نغمات بھی تحریر کرتے رہے۔ وہ اپنے گھر کے سربراہ تھے اور گھریلو حالات کچھ اچھے نہ تھے مگر وہ اپنے فن کا بڑا بہترین استعمال کرتے تھے۔

"بازار میں آئے ہیں تو بولی بھی اٹھے گی
فن جنس ہی پڑا ہے تو گاہک کی خطا کیا"

حمایت علی شاعر کو دوسروں سے الگ تھلگ مقام حاصل کرنے کی ہمیشہ خواہش رہتی اس لیے انھوں نے ایسے کارنامے سر انجام دیے جو باقی شعرا سے جدا نظر آتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال حمایت علی شاعر کی منظوم آپ بیتی ہے "آئینہ در آئینہ "لکھ کر اس کام کی روایت ڈالی جو بعد میں وزیر آغا اور ادیب سہیل نے بھی اس میدان میں قدم رکھا اور انھوں نے بھی اپنی آپ بیتیاں نظم کی صورت میں لکھی در اصل اس تحقیقی مقالے کی تکمیل کے لیے میرے پاس حمایت علی شاعر کی طویل منظوم آپ بیتی "آئینہ در آئینہ " ہے جس کا ہیئتی اور اسلوبی مطالعہ پیش کرنا ہے۔ پچھلے چند اوراق میں حمایت علی شاعر کی منظوم آپ بیتی کا ہئیتی مطالعہ

پیش کیا گیا ہے۔ اب اس منظوم آپ بیتی کا اسلوبی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔ مگر اسلوبی مطالعہ پیش کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ اسلوب ہوتا کیا ہے۔

"فیروز اللغات کے مطابق اسلوب سے مراد طریقہ، طرز، روش، وغیرہ ہے۔"[۳۰]

اسلوب انگریزی لفظ "سٹائل" کے مترادف ہے جس سے مراد ایک ایسی تحریر ہے جو سب سے الگ تھلگ ہو۔ اسلوب ایک ایسا طریقہ اظہار ہے جو فن کار کی پہچان ہوتا ہے۔ یہ طریقہ اظہار فن کار کی نمائندگی کرتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تحریر ہمارے پاس آتی ہے ہم اس تحریر کو پڑھنے کے بعد جان جاتے ہیں کہ یہ تحریر کس کی ہے۔ یہی اسلوبی خوبی ادیب یا شاعر کی پہچان کراتی ہے غالبؔ، میرؔ، مومنؔ، اقبالؔ حتیٰ کہ اردو کے کسی بھی شاعر کا شعر پڑھیں تو وہ شعر واضح طور پر ہمیں بتا دے گا کہ یہ فلاں شاعر کا شعر ہے۔ یا نثر کی بات کریں تو نثر بھی بتا دیتی ہے کہ یہ تحریر کس کی ہے۔ یہ ساری چیزیں اسلوب ہی کی وجہ سے ہی ممکن ہیں۔ اسلوب ہی ہے جو ایک شاعر کو دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔

کسی بھی فن پارے کے اسلوب کے تعین کے لیے علم معانی، علم بیان، علم بدیع، علم عروض و قواعد وغیرہ کے ساتھ کچھ دیگر علمی و ادبی اصطلاحات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ ان تمام اصطلاحات سے آشنائی ہی ہمیں صحیح اسلوب کی پہچان بتا سکتی ہے۔ شمس الرحمان فاروقی ایک جگہ رقم طراز ہیں:

"ہماری روایتی ادبی تہذیب کا تقاضا تھا کہ شعر کو علم ہی سمجھا جائے اور فن بھی۔"[۳۱]

دور حاضر میں جو ایک بات سمجھ سے بالاتر ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ شعر کہنے کے لیے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ پہلے دور میں شعرا کون سے زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ زیادہ بڑی ڈگریوں والے نہیں تھے مگر ان کی تعلیم مذہبی تھی مسجدوں کے اندر رہتے ہوئے اس وقت کے اساتذہ ان کو عربی اور فارسی کی تعلیم دیتے تھے اور ساتھ ساتھ گرامر بہت اچھی طرح سے سکھا دیتے تھے دوسرا اس دور کا ماحول ادبی تھا اور شعرا اپنے عہد کا اثر قبول کرتے تھے اس لیے ان کا کلام بہتر تھا اس لیے موجودہ دور کا مقابلہ کلاسیکی دور سے ہو ہی نہیں سکتا۔

اردو ادب میں طرز نگارش کی اصطلاح بہت قدیم ہے۔ یہ سلسلہ تذکروں سے شروع ہو کر شعرا کرام کے مجموعہ کلام پر ختم ہوتا ہے۔ شروع شروع میں اس پر کچھ خاص توجہ نہیں دی گئی مگر بعد میں بڑی باقاعدگی سے اسلوب کو زیر بحث لایا گیا۔ فن شاعری اور تنقیدی مضامین میں اس موضوع پر بے شمار مضامین قلم بند کیے گئے۔ ہمارے ناقدین اور زبان پر عبور رکھنے والوں نے کم و بیش سو سے زائد اصطلاحات کو استعمال کیا

ہے۔ جس طرح ہر اصطلاح کے اجزاء ترکیبی ہوتے ہیں بالکل اسلوب کے بھی ایسے ہی اجزائے ترکیبی ہیں۔ جن میں نازک خیالی، فصاحت و بلاغت، محاورات ایجاد و اختصار، لطافت بیان، تشبیہ، استعارہ، علامت، شوخی، صنعت فکر، صنعت اشتقاق، صنعت تجنیس، حسن تعلیل اور رعایت لفظی، ایہام، صنعت تضاد مبالغہ، تبلیغ، تلمیح، اور تصقید وغیرہ ان تمام چیزوں کے استعمال سے تحریر میں شگفتگی آ جاتی ہے۔ شگفتگی ہی اسلوب کی اصل ہے۔ جب تحریر شائستہ ہو گی تو وہ قاری کو اپنے ساتھ لے کے چلے گی۔ جو تحریر قاری کی توجہ حاصل کر لیتی ہے وہ تحریر کامیاب ہوتی ہے۔ کامیاب تحریر کے پیچھے بہترین اسلوب کا ہاتھ ہوتا ہے۔ تنقید کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلوب کسی لکھنے والے کا ایک خاص انداز تحریر ہوتا ہے۔ نثار احمد فاروقی اسلوب کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں۔

> ”اسلوب یا طرز نگارش کا مسئلہ ایسا نہیں جس پر کوئی فیصلہ کن یا دوٹوک بات کہی جا سکے۔ آسان لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اسلوب افکار و خیالات کے اظہار و ابلاغ کا ایسا پیرائیہ ہے جو دلنشین بھی ہو اور منفرد بھی اس کو انگریزی میں سٹائل کہتے ہیں اردو میں اس کے لیے طرز یا اسلوب کا لفظ مستعمل ہے عربی اور جدید فارسی میں اس کو سبک کہتے ہیں۔“[۳۲]

گویا شعر و ادب کو ایک خاص انداز میں بیان کرنا بھی اسلوب کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح نثر اور نظم میں عروض، اوزان اور بحور کا فرق ایک واضح فرق ہوتا ہے بالکل اسی طرح شعر و نثر کے درمیان اسلوب ہی ہے جو فرق واضح کرتا ہے۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ نثر کا اسلوب شعر میں یا شعر کا اسلوب نثر میں اپلائی ہو۔ آل احمد سرور نے نثر اور شعر کے اسلوب کو کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے۔

> ”نثر کی زبان اور نظم کی زبان میں فرق ہے، حالانکہ دونوں ادب ہی کی شاخیں ہیں یعنی دونوں میں حسن بیان کی نوعیت مختلف ہے۔ نظم کی زبان تخلیقی ہوتی ہے جبکہ نثر کی تعمیری، نظم اس چاندی کی طرح ہے جس میں سائے گہرے اور بلیغ معلوم ہوتے ہیں۔ نثر اس دھوپ کی طرح ہے جو ہر چیز کو آئینہ دیتی ہے۔“[۳۳]

لفظ اسلوب جتنا بظاہر سادہ ہے بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ اتنا ہی پیچیدہ ہے۔ پچھلی پوری ایک صدی میں اسلوب کے حوالے سے مشرق و مغرب میں بہت بحث ہوتی رہی ہے۔ کہیں کہیں اسلوب کو شخصیت کا عکس کہا

گیا اور کہیں کہیں بات اس کے الٹ بیان کی گئی ہے۔ اسلوب کے حوالے سے ایک انگریز مصنف مڈلٹن کی مشہور زمانہ کتاب "اسلوب کا مسئلہ" اور دوسری طرف اردو میں سید عابد علی عابد کی کتاب "اسلوب" کا مطالعہ اسلوب کو سمجھنے کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرنے سے اسلوب کے حوالے سے چند اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ اسلوب کسی لکھنے والے کا مکمل اظہار نہ بھی ہو تو لکھنے والے کی شخصیت کو کسی حد تک بے نقاب کر ہی دیتا ہے۔ فن کی دلچسپیاں اور مزاج اسلوب کو تھوڑا بہت ضرور متاثر کرتی ہیں۔

۲۔ جدید مغربی تنقید نے فن کار کو قاری پر قربان کر دیا ہے۔ لکھاری جو کچھ لکھے گا اس کے سامنے اس قاری کا عکس ہو گا۔ اس لیے لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں میں ایک خاص ادبی رشتہ ہوتا ہے۔

۳۔ اسلوب ایک وسیع اصطلاح کا نام ہے۔ ہر ادبی فن پارے کا اسلوب دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ افسانوی اسلوب اور تنقیدی اسلوب میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ دن اور رات میں ہے۔

سید عابد علی عابد نے کامیاب اسلوب کی چند ایک خوبیاں بیان کی ہیں۔

۱۔ سادگی

۲۔ قطعیت

۳۔ اختلافی حواس

۴۔ اختصار

ان چار کے علاوہ بھی کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ لیکن ان کا تعلق نثر سے نہیں ہوتا بلکہ شعر کے اسلوب سے ہوتا ہے۔ اسلوب اور سبک دو مترادف الفاظ ہیں۔ سبک کا معنی ہے پگھلا کر ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ سبک نظم یا نثر میں انداز بیان، پیرائیہ، لہجہ رنگ سخن کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جس لفظ کو انگریزی میں (Style) کہتے ہیں وہ اہل ایران کے ہاں سبک ہے۔ یہ بات کئی بار پہلے بیان ہو چکی ہے پھر بھی اس بات کو پھر سے بیان کرنا بے مقصد نہیں ہے کہ کسی شاعر کی انفردیت کا اگر اندازہ کرنا مقصود ہو تو اس کے اسلوب کو دیکھا جاتا ہے۔ موضوع کسی بھی ادیب کی اپنی مرضی کا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ موضوع کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ ہر موضوع پر ہر ادیب یا فن کار اپنے طریقے سے زور آزمائے گا۔ ہر فن کار کا لکھنے کا Style دوسرے سے مختلف ہو گا۔ جب کسی فن کار کا ادبی فن پارہ نقاد یا قاری کے ہاتھ لگتا ہے تو ان کے پاس ایسا کوئی پیمانہ نہیں ہے جس سے وہ صحیح ناپ تول کریں کہ کس کا ادبی فن پارہ زیادہ بہتر ہے۔ وہ صرف اس ادبی فن پارے کی زبان دیکھتے ہیں کہ

کس حد تک سمجھ آتی ہے اور اس ادبی فن پارے کے اندر کتنی لطیف کڑیاں شامل ہیں۔ یہ دو خصوصیات اگر کسی فن پارے کے اندر ہیں تو سمجھ لیجیے کہ وہ اسلوب بہتر قرار دیا جائے گا۔ اسلوب کے حوالے سے ارسطو کا خیال ہے:

"اسلوب سے زبان میں معجزے کا امتزاج پیدا ہو جاتا ہے اور اسلوب میں بات کہنے کا ڈھنگ بھی شامل ہے"[۳۴]

انسان جب اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو وہ تب سے ہی چیزوں پر غور و فکر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو خود تک نہیں رکھتا بلکہ ان کو دوسروں تک پہچانے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ یہ خواہشات اس کو اظہار خیال پر اکساتی ہیں۔ اس لیے وہ مجبور ہو کر اندر کے اضطراب کو ختم کرنے کے لیے اظہار کر دیتا ہے۔ وہ اظہار کسی خاص انداز میں کیا جاتا ہے جس کو ہم اسلوب کہتے ہیں۔ ادب زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ ادیب جو کچھ لکھتا ہے اس میں اس کی زندگی کے مختلف گوشوں سے پردہ ہٹتا جاتا ہے۔ جب ایک ادیب کوئی ادبی فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو وہ فن پارہ صرف تحریری حد تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ اس ادبی فن پارے میں مصنف کی شخصیت کی خصوصیات کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ جب بھی ہم کسی ادبی تصنیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم صرف اس کتاب تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ ہم مصنف کی شخصیت کے بارے میں بھی آگاہی حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک اچھے مصنف کی تصنیف کا مطالعہ مکالماتی انداز میں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا قاری مصنف سے گفتگو کر رہا ہے۔ اس گفتگو کے دوران ہم اس حد تک اندر چلے جاتے ہیں کہ مصنف کے ساتھ ہو کر ہم دنیا کی الجھنوں کو سلجھانے کے بارے میں کوئی طریقہ اپناتے ہیں۔ ہم اس حد تک سمجھ جاتے ہیں کہ مصنف پر دنیا اور دنیا کی چیزوں نے کیسے اور کیوں اثر کیا ہے۔ اس لیے دانا کہتے ہیں کہ ادب کے مطالعے میں مصنف کی شخصیت کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اسلوب بیان یا اسٹائل کے مسئلے کو سمجھنے کے بعد زیادہ بہتر انداز میں سمجھ آئے گی۔ لوکس کا خیال ہے:

"اسلوب ایک ذریعہ ہے جس کی بنیاد پر ایک آدمی دوسرے سے تعلق پیدا کرتا ہے۔ ادبی اسلوب وہ ذریعہ ہے جس سے ایک آدمی دوسرے آدمی کو متحرک کرتا ہے۔"[۳۵]

اسلوب کو مکمل طور پر جاننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس بات کو ادب اور لسانیات کے جاننے والوں نے تسلیم کیا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں نے اسلوب کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف

نقادوں، دانشوروں، مفکروں، ماہرین اسلوبیات اور لسانی طرز فکر رکھنے والوں نے اسلوب کی تعریف مختلف انداز میں کی ہے۔ جان اسپنسر کے خیال میں: "اسلوب ایک انتہائی پیچیدہ مظہر ہے۔ جسے کئی مختلف زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔"[۳۶]

اسلوبیات اور اسلوب میں آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ جس طرح لسانیات کا بنیادی موضوع ہی زبان ہے بالکل ایسے ہی اسلوبیات کا موضوع فکر اسلوب ہے۔ اسلوب ایک میدان کا نام ہے جہاں زبان اور ادب ایک دوسرے کے بہت قریب آجاتے ہیں۔ اسلوب کے حوالے سے عابد علی عابد کا قول ہے:

"Proper words in proper place"[۳۷]

اسلوب کی ایک تعریف جان مڈلٹن نے یوں بیان کی ہے۔

"Style means that personal idisyncrasy of expression by which we recognize a writer"[۳۸]

اسلوب کسی بھی ادبی فن پارے کی خوبیوں کا دوسرا نام ہے۔ اسلوب تحریر کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے۔ جس کے بغیر فن پارے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اسلوب فن پارے کی جمالیات ہوتی ہے جو اس کے حسن کو اجاگر کرتی ہے۔ اسلوبی اوصاف مصنف کے اپنے ہی اوصاف ہوتے ہیں جو زبان کے اوصاف سے انحراف یا انتخاب سے جنم لیتے ہیں۔ اسلوب کا تعلق زبان کے اچھے انداز یا برے انداز سے ہوتا ہے کہ قاری جب کوئی تحریر پڑھتا ہے تو فوراً یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ تحریر اچھی ہے یا بری۔ اسلوب کی اقسام کی اگر بات کریں سب سے اہم دو ہی ہیں۔

**بیانیہ اسلوب:**

بیانیہ اسلوب کو انگریزی زبان میں (Informative) اسلوب بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا اسلوب ہے جو ساختی سطح پر لغوی اور نحوی انتخاب و انحراف پر تشکیل پاتا ہے۔ مرزا خلیل بیگ نے تو ایک جگہ بیانیہ اسلوب کو اطلاقی اسلوب بھی کہا ہے جبکہ ہدایتی اسلوب کو بیانیہ سے جدا کر کے بیان کرتے ہیں۔ ہدایتی اسلوب کے حوالے سے مرزا خلیل بیگ کہتے ہیں کہ یہ اسلوب ہدایت یا اخلاقی طرز کے جملوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہدایتی اسلوب بھی بیانیہ اسلوب کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ جس میں اخلاقیات کے سارے تصورات کو بیان کیا جاتا ہے۔

## اظہاری اسلوب:

(Expression style) کو اظہاری اسلوب کا نام دیا گیا ہے۔ یہ اسلوب اظہار کی وہ شکل ہے جس میں زبان کے استعاراتی انداز بیان کا سہارا لیا جاتا ہے۔ غالب کے خطوط کو چھوڑ کر افسانوی نثر، کالم نگاری اظہاری اسلوب کے دائرے میں آتے ہیں۔ اسلوب کو مفصل انداز میں بیان کرنے کے بعد حمایت علی شاعر کی منظوم آپ بیتی آئینہ در آئینہ کا اسلوبی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

حمایت علی ایک رومانوی آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی منظوم آپ بیتی میں اپنی کامیاب محبت کا بڑی عمدگی کے ساتھ حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے اپنی محبت کو حاصل کر لیا مگر خاندان والوں سے بغاوت کر کے یہ سب حاصل ہوا۔ حمایت علی شاعر کی منظوم آپ بیتی میں نہ صرف حمایت علی شاعر کی زندگی کے مسائل ہیں بلکہ یہ آپ بیتی ہم سب کی مشترکہ آپ بیتی ہے۔ اس میں معاملات کو کچھ اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ سب کچھ اپنے ساتھ ہو رہا ہے ''آئینہ در آئینہ'' حمایت علی شاعر کی منظوم آپ بیتی ہے اور اردو کی پہلی باقاعدہ منظوم خود نوشت ہے۔ ''آئینہ در آئینہ'' میں شاعر نے اپنی زندگی کے تمام واقعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ درجہ بدرجہ لکھا ہے۔ اس سے پہلے اردو ادب میں کچھ مثنویاں ملتی ہیں جن میں آپ بیتی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے شفیع عقیل کی ایک تحریر کا حوالہ ضروری ہے۔ جو انھوں نے منظوم آپ بیتی کے حوالے سے روزنامہ "جنگ" میں بطور تبصرہ لکھی تھی۔ عقیل شفیع لکھتے ہیں:

> ''آئینہ در آئینہ'' اردو میں منظوم پہلی آپ بیتی ہے۔ باقاعدہ کا لفظ یہاں اس لیے استعمال کیا کہ بعض قدیم شعرا نے اپنی مثنویوں میں اپنی زندگیوں کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں ''الزبیر'' میں اردو کے نامور محقق مشفق خواجہ کا منظوم آپ بیتی کے بارے میں مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں واجد علی شاہ کی منظوم آپ بیتی ''حزن اختر'' کا تذکرہ ہے جو ۱۲۵۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ مشفق خواجہ کی تحریر سے کچھ اور نام بھی سامنے آئے ہیں۔ جن میں:
>
> محمد علی شوق — چہار درویش
> شاہ حسین حقیقت — بہشت گلزار
> اعزاز الدین — گنج قدرت
> سائل ارکائی — مخلوط قصۂ اگر گل

یہ تحریریں پچھلے دو سو سالوں میں مثنوی کی ہیئت پر لکھی گئی تھی۔ ان میں
مثنوی نگاروں نے اپنی داستان منظوم انداز میں قلم بند کیں۔ اس کے علاوہ
"فریاد داغ" مومن خان مومن کی مثنوی بھی شامل بحث ہے۔"[۳۹]

حمایت علی شاعر کی سوانح ماہ نامہ "افکار" میں قسط وار چھپتی رہی۔ جب "آئینہ در آئینہ" عروج پر تھی تو اس وقت کچھ دیگر لوگ بھی اپنی منظوم آپ بیتیاں لکھنے میں مصروف تھے۔ لیکن اس دور میں ایک کامیاب اور مکمل منظوم آپ بیتی "آئینہ در آئینہ" ہی ہمارے سامنے آتی ہے۔

"یہ شہر جسے سب اورنگ آباد کہتے ہیں
یہاں پہ صدیوں سے میرے بزرگ رہتے ہیں
بہت زمانہ ہوا اس کا نام "کھڑکی" تھا
جو فتح خان کے ہاتھوں "فتح نگر" بھی ہوا" [۴۰]

***

"میں جس گھرانے کا ہوں فرزند
طریقی بھی تھا مگر شریعتی تھا بہت
فقیہ و قاضی و صوفی میرے آب وجد تھے
بڑے نمازی، تہجد گزار ، سید تھے"[۴۱]

***

"پٹن کے قاضی کی بیٹی تھی ، والدہ میری
بہت ہی بخت کی بیٹی تھی، والدہ میری
نہ ماں بھی سر پہ، نہ بہن بھائی اکیلی تھی
نہ وہ کسی کی نہ اس کی کوئی سہیلی تھی"[۴۲]

***

"میں سوچتا ہوں تو وہ دور یاد آتا ہے
بھلانا چاہوں تو کچھ اور یاد آتا ہے
وہ چھوٹا سا لڑکا وہ ایک قبرستان
وہ ایک پیڑ کی چھاؤں، اداس اور سنسان" [۴۳]

***

خدا کا شکر کہ اس گھر میں بھی چرغ جلے
جہاں اندھیری تھا دن میں آسمان تلے
یہ دادی ماں کی فراست تھی یا مرا مقوم
ملی وہ اماں مجھے جو خود بھی اماں سے تھی محروم" ۴۴

"آئینہ در آئینہ "حمایت علی شاعر کی شاہکار خود نوشت ہے۔ اس خود نوشت کا مطالعہ کرتے وقت قاری پورے ہندوستان کی گلی کوچوں سے خود گزرتا ہے۔ حمایت علی شاعر نے واقعات کو منظوم طرز میں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اس خود نوشت کے آغاز میں شاعر نے اورنگ آباد کا ذکر کیا ہے۔ اس شہر میں شاعر کے بزرگوں نے اپنی زندگی بسر کی۔ شاعر نے ایلورہ کا بھی تذکرہ کیا ہے جو اورنگ آباد سے نو میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی سلسلہ ہے۔ جس کو کھود کر غار بنائے گے اور ان غاروں میں ہندوستانی دیومالا مورتیوں کی شکل میں تراش دی گئیں۔ اس کے علاوہ شاعر نے بڑے سادہ الفاظ میں اجنتا کا ذکر کیا ہے۔ اجنتا اورنگ آباد سے ۲۰ میل کے فاصلے پر وہ پہاڑیاں ہیں جن کے غاروں میں رنگین تصویریں بنائی گئی ہیں۔ یہ تصویریں آج تک محفوظ ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غار دو ہزار سال پہلے تراشے گئے تھے۔ اس آپ بیتی کے اس حصے میں ہندوستان کے قلعوں، مندروں، مسجدوں، شہروں، بازاروں، باغوں کا حوالہ ملتا ہے۔ اس حصے میں " نہر عنبر "کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ یہ ایک ایسی نہر ہے جو دکن کے حبشی حکمران کے ساتھ منسوب ہے۔ اس نہر سے گرم اور ٹھنڈے پانی کے منبے نکلتے ہیں۔ یہاں مقبرہ گنج کی عمارت ہے جس کی صورت مقبرہ تاج محل جیسی ہے۔ اور یہ عمارت رابعہ درانی کے نام سے مشہور ہے۔ جس کے زمانہ قدیم میں اکیس دروازے تھے مگر اب وہ چھ دروازے بچے ہیں۔ اس حصے میں بہت بادشاہوں کا حوالہ ملتا ہے۔ جن میں آصف جاہ، میر قمر، لچھی نارائن شفیق وغیرہ کے نام سر فہرست ہیں۔ ان بادشاہوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی ریاست کا نظام بڑی عمدگی سے چلایا۔ اس دور میں گوریلا جنگ کا آغاز ہوا۔ یہ جنگ مغلوں اور مرہٹوں کے درمیان لڑی گئی تھی اس جنگ میں مسلمانوں کو بڑی حد تک نقصان اٹھانا پڑا۔ اس دور میں پشتو کے مشہور شاعر خوشحال خان خٹک بھی تھے انھوں نے پٹھانوں کو مغلوں سے آزاد کرانے کے لیے پٹھانوں کو یکجا کیا۔ یہاں میر تقی میر کو بھی حمایت علی شاعر نے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اور ان کے تذکرہ نکات الشعراء کو اردو کا پہلا تذکرہ قرار دیا ہے۔ حمایت علی شاعر نے اپنی اس منظوم آپ بیتی میں زندگی کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا ہے جس کو نہ بیان کیا ہو۔

وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا اس وقت عثمانیہ انٹر میڈیٹ کالج کے پرنسپل محترم مولوی عبدالحق تھے جن کو لوگ بابائے اردو کے نام سے جانتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو اور عثمانیہ کالج نے اردو کی ترقی اور ترویج میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان اداروں کے ساتھ اختر حسین رائے پوری، صدق جائسی، درد کاکوری، آغا صادق، سکندر علی، محقق شیخ چاند جیسے بڑے نام ان اداروں سے منسلک تھے۔ حمایت علی شاعر نے "آئینہ در آئینہ" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ میرے آباؤ اجداد طریقی تھے جو محمد تغلق کے عہد میں اورنگ آباد کے قریب ایک گاؤں رنجن میں رہ رہے تھے۔ میرے بزرگوں میں کچھ لوگ شریعتی بھی تھے۔ ہمارے خاندان والوں کو بے شمار شاہی انعامات سے نوازا گیا۔ ہمارے خاندان والوں کو بے شمار جائیدادالاٹ کی گئی تھی۔ اس منظوم آپ بیتی کے اندر جابجا شاعر نے تشبیہات کا استعمال کر کے اس کے اسلوب میں چار چاند لگائے ہیں۔ "دشتِ کنعاں"، "یوسف کنعاں" جیسی تشبیہات کا استعمال کیا گیا ہے۔ حمایت علی نے شعری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے عموماً "ع" کو "الف" کا ہم آواز رکھا ہے۔ حمایت علی شاعر نے اس آپ بیتی میں ایک گاؤں پٹن کا تذکرہ کیا ہے۔ پٹن دریائے گوداوری کے کنارے ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دراصل میری والدہ اس شہر کے مشہور قاضی اسماعیل الدین کی بیٹی تھی۔ میری والدہ کو شروع سے ہی مشکلات کا سامنا رہا ہے۔ بچپن میں ہی والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ اس لیے میری والدہ اکثر مایوس رہتی۔ حمایت علی شاعر نے اورنگ آباد کے گاؤں کو بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ اس حوالے سے مزید کہتے ہیں کہ گنگاپور، پیپری رنجن وغیرہ ایسے گاؤں ہیں جہاں میرے آباؤ اجداد کا بسیرا رہا ہے۔ میرا خاندان بڑا ہشاش بشاش خاندان تھا کہ میری والدہ کا بھی میرے چھوٹے بھائی کی پیدائش کے وقت انتقال ہو گیا تھا۔ میری والدہ کی قبر اسی قبرستان میں ہے جہاں سراج اورنگ آبادی کا مزار ہے۔ یہ جگہ قلعہ ارک کے آس پاس واقع ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ میری والدہ کے انتقال کے بعد میرے والد نے دوسری شادی کی تو ایک مدت کے بعد گھر میں دوبارہ رونق لگی۔ میری نئی والدہ بھی اپنی والدہ سے محروم ہو چکی تھی اس لیے میرے اور میری والدہ کے دکھ سانجے تھے۔ اس لیے میرے منتخب کلام کا مجموعہ "حرف حرف روشنی" انھی کے نام سے منسوب ہے۔ عثمانیہ انٹر میڈیٹ کالج سے ایک رسالہ "نورس" نکلتا تھا۔ میرا پہلا افسانہ بعنوان "فلسفہ اور حقیقت" اسی رسالے میں چھپا تھا۔ میرا یہ افسانہ حمایت علی شاعر نمبر ۱۹۹۶ء میں بھی شامل ہے۔ حمایت علی شاعر نے اپنی آپ بیتی میں فارسی زبان کے نامور شاعر سرمد کا ذکر بھی کیا ہے۔ سرمد صوفی شاعر شاہجہاں کے بڑے صاحبزادے تھے۔ سرمد کو اورنگ زیب نے کسی جرم میں ملوث کروا کر قتل کروا دیا تھا۔ مگر تاریخ نے سرمد کو شہید قرار دیا تھا۔

"میں اپنی عمر کے اس دور میں تھا جب ہر خواب
منتظر ہوتا ہے تعبیر کے لیے بے تاب
یہ میرا شہر کہ جس پر تھا کھنڈر کا گمان
میری نگاہ میں اب بھی تھا رشک باغِ جناں"[45]

***

"میں اپنے شہر سے عنبڑ چلا گیا اک رات
مگر ارادے نئے لے گیا تھا اپنے ساتھ
تھا ان دنوں میرے ابا کا مستغرق وہ شہر
خیال تھا میرے حق میں ہے بے ضرر وہ شہر"[46]

***

"لگا نہ دل تو میں اک روز جالنہ جا پہنچا
وہاں پہ اک میری ننھال کا گھرانہ تھا
وہیں تھے عبدالغفور میرے بزرگ
بہت ہی نیک ، بہت باشعور میرے بزرگ"

***

"وہ شہر شاہِ دکن کا تھا پائے تخت جہاں
وہ شہر جمع تھے دنیا کے اہل بخت جہاں
وہی کہ جس کا تھا شہر ہ تمام عالم میں
جو بے مثال تھا پورپ میں اور پچھم میں"[48]

***

"ادھر تو مسئلہ روز گار تھا اور میں
ادھر وہ میرا گل نو بہار تھا اور میں
وہ ایک خواب کی تعبیر کا تمنائی
وہ ایک خیال کی تحریر کا تمنائی"[49]

***

”یہاں کچھ ایسے بھی اہل قلم تھے جن کی نظر

وہ پڑھ رہی تھی، لکھا تھا جو " لوح مزار" پر

انہیں خبر تھی، یہاں جو بھی ہونے والا ہے

نظام کا جو اثاثہ ہے کھونے والا ہے“[۵۰]

حمایت علی شاعر نے اپنی یہ آپ بیتی مثنوی کی ہیئت میں لکھی ہے۔ یہ نظم تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس آپ بیتی کو اکاون اقساط میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتدا اس کی اورنگ آباد سے ہوتی ہے۔ جبکہ اختتام انھوں نے ایک ایسے جملے پر کیا ہے جس سے امید کی کرن کچھ باقی معلوم ہوتی ہے۔ وہ تاریخی جملہ ”یار زندہ محبت باقی“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس منظوم آپ بیتی کے اندر حمایت علی شاعر نے اپنی ذاتی زندگی کے واقعات کو منظوم صورت میں لکھ کر اس میں شامل کیا ہے۔ یہ واقعات شاعر کی زندگی میں مختلف ادوار میں شامل ہیں۔ اس لیے یہ آپ بیتی تاریخی اعتبار سے اہم مانی جاتی ہے۔ شاعر نے اپنی اس آپ بیتی میں اپنے والد اور والدہ مرحومہ کے حوالے سے جو کچھ سنا تھا اس کو بھی اس آپ بیتی میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کی اس آپ بیتی میں کچھ شخصیات کا حوالہ بھی ملتا ہے جو شاعر کی زندگی پر براہ راست اثر انداز ہوئے ہیں۔ ان میں شیخ چاند ، سکندر علی واجد، عیش فردوسی، یعقوب عثمانی، آغا صادق سروش، اختر الرحمان، فیض احمد فیض، ن۔ م راشد، میراجی، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، پروفیسر کلیم الدین احمد، سجاد ظہیر، سگمنڈ فرائڈ، کارل مارکس وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی تحریر و تقریر نے حمایت علی شاہ کی زندگی میں انقلاب برپا کیا۔ حمایت علی شاعر اورنگ آباد سے شہر عنبر کا سفر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ میں جب اس شہر میں پہنچا جس کو لوگ عنبر کہتے ہیں۔ وہاں میرے والد صاحب نوکری کیا کرتے تھے۔ میرے لیے یہ شہر بے ضرر شہر تھا۔ وہاں پہنچ کر مجھے کچھ دن راحت ملی مگر یہ راحت زیادہ دیر کی نہ تھی کیونکہ ہر جگہ شیطان چہرے والے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ جب ایک افسانہ نگار کے گھر گیا تو وہاں بھی ایک انتشاری آدمی موجود تھا۔ وہ ایک چھوٹی ذات کا ہندو تھا جو اپنے مذہب کے حوالے سے خوب جانتا تھا۔ اس کا اور میرا کافی ٹکراؤ رہا۔ وہ ایک اچھا لکھاری بھی تھا۔ وہ قلم کی زبان سے لفظوں کے موتی بکھیرتا تھا۔ میں جب وہاں ان کے گھر ٹھہرا تھا وہ ایک نوجوان افسر تھا۔ اور بہت اچھا ادب تخلیق کرتا تھا۔ وہ میرا اہم خیال اور بہادر آدمی تھا۔ اس کا ہمارے خاندان والوں کے ساتھ بڑا گہرا تعلق تھا۔

وہ سجاد ظہیر کے خدمت گاروں کا بھی چاہنے والا تھا۔ فیض احمد فیض کے ساتھ اس کی عقیدت بے پناہ تھی۔ اس زمانے میں ریاست کے ایک خاص حصے میں جہاں تلگو زبان بولی جاتی تھی وہاں گوریلا جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ کسان اپنا حق مانگنے کے لیے اپنی جان تک دینے کو تیار تھے۔ مگر اسی زمانے میں ہندوستان میں مسلمان اور ہندو انگریزوں کے خلاف کھڑے تھے۔ ہندو مسلمان آپس میں مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ میں مصروف تھے۔ لیکن ہندو مسلمانوں کی بھی مخالفت کرتے تھے۔ انگریز بہت ذہین تھا اور اس نے جاتے جاتے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان نفرت کا بیج بویا جو بعد میں ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ بعد میں یہ نفرت کا درخت ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے میں کارگر ثابت ہوا۔ حمایت علی شاعر کہتے ہیں میں نے کچھ عرصہ عنبر میں گزارا مگر کچھ سکون نہ ملا تو میں عنبر سے چالیس میل دور جالنہ جا پہنچا۔ جالنہ میں میرے بزرگ عبد الغفور جو بعد میں میرے سسر بنے، ان کے ہاں جا پہنچا ان کو علم و ادب سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ ایک سکول ٹیچر تھے۔ ان کی ایک خوبصورت جوان بیٹی تھی۔ جس کا نام معراج تھا۔ میں نے اس کو دیکھا تو اسی وقت اس کو دل دے بیٹھا تھا۔ اس کو بھی مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ مگر اظہار نہ وہ کر پاتی تھی اور نہ میں مگر زیر لب تبسم دونوں کو بہت کچھ کہہ دیتا تھا۔ میری اور اس کی کہانی کا آغاز ہو چکا تھا جو بعد میں شادی کی صورت میں اختتام پذیر ہوا۔ یہ شہر دکن کی ریاست میں آتا تھا جس کا بادشاہ قلی قطب شاہ تھا۔ میں جب پہلی بار اس شہر میں گیا تو ہر چیز نئی نئی تھی۔ میں جب حیدرآباد کے ایک ریلوے سٹیشن کاچی گوڑہ میں اترا تو میں نے وہاں موٹر رکشا، تانگے وغیرہ دیکھے جو میرے لیے نئے تھے۔ وہاں اعلیٰ اور ادنیٰ درجے کے لوگ پائے جاتے تھے۔ میں وہاں مسجد میں رات گزارنے کے لیے گیا مگر امام صاحب نے مجھے مسجد سے باہر نکال دیا اور میں نے رات بڑی مشکل سے گزاری۔ میں جالنے چھوڑ کر روزگار کے لیے حیدرآباد دکن کو بہتر جانا اس لیے میں ادھر آ گیا۔ ایک طرف میری محبوبہ کا گھر تھا اور دوسری طرف روزگار۔ میرے لیے دونوں ہی بہت اہم تھے مگر روزگار زیادہ اہم تھا۔ مگر جس شخص نے مجھے شاعر بنایا میں اس کو بھی تو نہیں بھول سکتا تھا۔ میں اپنے محبوب سے تخیلاتی دنیا میں کلام کرتا رہتا تھا۔ اس سے ہم کلامی کے دوران میں نے بہت اشعار کہے جو میری اس آپ بیتی کا حصہ ہیں۔ مثال کے طور پر ایک قطعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

”تیرے چہرے کے یہ سادہ سے اچھوتے سے نقوش
میری تخیل کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں
تیری زلفیں، تیری آنکھیں، تیرے عارض تیرے ہونٹ
کیسی ان جانی سی ہے ، معصوم خطا کرتے ہیں“

ان دنوں تواتر سے میرے سننے میں آرہا تھا کہ محترمہ کے بہت سے رشتے آرہے ہیں۔ میں بہت بے چین ہو گیا کہ کیا کیا جائے خیر میں نے اپنے ہم زلف محترم مستجیب الدین کو سارا معاملہ کہ ڈالا تو انہوں نے میری بڑی مدد کی اور میری بات ان کے والدین تک پہنچائی جس کی وجہ سے مجھے رشتہ مل گیا اور ہم نے شادی کرلی۔ معراج میری ماں کے خاندان کی ایک حسین لڑکی تھی جس سے میری شادی ہوئی۔ یہ وقت میرے لیے بہت خوشی کا وقت تھا کہ مجھے میری محبت مل گئی تھی۔ اس وقت مجھے اپنے رب پر بہت پیار آیا۔ مجھے یوں لگا کہ میں کسی جنت میں ہوں اور پھول میرے آگے پیچھے رقص کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں کچھ شعرا نے میرے آنے والے کل کی تقدیر لوحِ یادگار پر لکھ دی تھی۔ دکن ایک ایسی سرزمین ہے جہاں اس وقت کانگریسی، اشتراکی، رضوی، خوجی بادشاہ وغیرہ سب رہتے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ بھارت ہمارا دشمن ہے۔ سارے ادیب رضوی کے دربار میں اکھٹے ہو گے تھے۔ وہ چاہے خواجہ معین الدین ہوں کہ تحسین سروری وہ چاہے ابراہیم جلیس ہوں کہ نظر حیدر آبادی یہ سارے لوگ قاسم رضوی کے زیر سایہ تھے اور سب کے سب جنگ کے لیے تیار تھے۔ میں اس زمانے میں اخبار سے کنارہ کشی کر چکا تھا۔ مجھے ظفر بھائی "دکن ریڈیو" میں لے آئے تھے۔ آگے وراثت مرزا صاحب جو اناؤنسر تھے وہ بھی موجود تھے اور ان کا ساتھ ماجد صاحب دے رہے تھے جو ڈرامانگار تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ میرا وقت بڑا اچھا گزرا ہے۔

"وہ رات قبر سی تاریک، دن قیامت خیز
زمیں پہ عالم ہو، آسمان وحشت خیز
نگاہ خوف زندہ، دل کی دھڑکنیں خاموش
تمام شہر نظر آئے مرگ در خاموش"[۵۱]

***

"زوال بادشاہی ہے، عروج عہد عوام
غروب مہر، طلوع مہ و نجوم کا نام
وہ جن کی سوچ میں رچ بس گئی تھی بوئے کفن"[۵۲]

***

یہاں وہ نظم بھی آجائے تو برا کیا ہے
جو میری رام کہانی ہے، میری بپتا ہے

جو اعتراض بھی ہے اور ایک عزم بھی ہے
جو ایک رزم پہ اکسائے ایسی نظم بھی ہے"[۵۳]

***

"عجب لوگ ہیں ہم بھی ، نصیب کے بیٹے
فلک کو سر پہ اٹھائے زمین کے بیٹے
خود اپنے نشے میں سر شار، خوش گمان کشاداں
وطن کی خاک کو منہ پہ ملے ہوئے ناداں"

یہ اس زمانے کی بات ہے جب دکن پر بھارتی فوج نے لشکر کشائی کر دی تھی۔ ایک بار حق اور باطل آمنے سامنے آ چکے تھے۔ مگر جیت پھر سے حق کی ہوئی۔ جب کسی بھی جگہ جنگ ہوتی ہے تو وہاں کے حالات بڑے ناگفتہ بہ ہوتے ہیں۔ بالکل ایسا ہی تھا دکن میں قیامت کا سا منظر تھا لوگ بری طرح سے قتل ہو رہے تھے۔ ہر کسی کو اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ تمام شہر قبرستان کے منظر پیش کر رہے تھے۔ کسی کو کوئی خبر نہیں تھی کہ کون کہاں ہے بس ایک ہی جملہ سننے کو مل رہا تھا کہ سارے ہجرت کر کے پاکستان جا چکے ہیں۔ پورے دکن میں ہو کا عالم تھا۔ میں دکن کے ریڈیو سٹیشن میں اکیلا ہی رہ گیا تھا۔ میں بھی یہ عالم دیکھ کر بہت خوفزدہ تھا۔ زیادہ لوگ مہاجر ہو چکے تھے۔ جو بچے تھے وہ ہار مان چکے تھے کہ اب ہندوستان کے اوپر ہندو راج ہو گا لوگ سخت مایوس تھے۔ ایک بزرگ نے ہمارے فردا کی تقدیر بتادی تھی کہ اب مسلمان کم ذات ہندوؤں کو جھک کر سلام کیا کریں گے جو ایک تکلیف دے امر ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس کے معیارات بدل جاتے ہیں بالکل ایسے ہی جب ہندوستان پر ہندو راج چل رہا تھا تو مسلمانوں کے مزاج میں سختی آچکی تھی۔ کیونکہ ہندوستان کی پوری تہذیب یکسر بدل چکی تھی۔ جب ہمارے بادشاہوں پر زوال آیا تو یوں لگا جیسے سورج غروب ہو گیا اور اب صرف رات ہی رات کا عالم ہے۔ اس وقت میرے تمام عزیز اللہ کی مہربانی سے سلامت تھے۔ مگر میں ان سب کو لاہور چھوڑ آیا تھا۔ میں چاہ کر بھی ان کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ کیوں کہ میری جان کو بھی سخت خطرہ لاحق تھا۔ مگر ایک وقت آگیا کہ مجھے میرے دوستوں نے سہرا پہنا کر میری محبوبہ کے گھر لے گئے تھے۔ ان دوستوں میں عزیز قیسی، انوار، عزیز اور ممتاز شامل تھے۔ یہ سارے لوگ کنوارے تھے اس لیے شادی کی بہت سی رسومات باقی رہ گئی تھیں۔ مگر شادی بڑے ٹھاٹھ سے ہو گئی تھی۔ جب مجھے وہ سہرا پہنایا گیا تو اس سہرے کی لڑیوں کے پیچھے میں کسی خیال میں گم تھا۔ اور اس وقت کا انتظار کر رہا

تھا کہ کب میری معراج میرے پاس ہو گی۔ کہ اچانک میرے والد صاحب میرے سامنے آ گئے تھے جو کافی مہینوں سے مجھ سے جدا تھے۔ ہم ایک دوسرے سے سے لپٹ کر خوب رونے لگے۔ یہ آنسو ہمارے خوشی کے آنسو تھے۔ وہیں میں نے ایک نظم اپنے ذہن میں ترتیب دے دی تھی جو میرے پہلے مجموعہ کلام " آگ میں پھول " میں شامل ہے کہ آج سے چند برس پہلے میں اکیلا تھا۔ میرا کوئی غمخوار نہیں تھا۔ میں چلتے چلتے تھک جاتا، مجھے بھوک لگتی تو میں اس بھوک کو پانی سے مٹا دیتا تھا۔۔ میری ملاقات جب معراج سے ہوئی تو میں اندر ہی اند رکھل اٹھا تھا کہ مجھے میرے خوابوں کی رانی مل گئی ہے۔ معراج سے ملاقات کے بعد زمانے کا غم غم نہیں لگتا تھا۔ یہ وہی معراج تھی جس نے میرے الفاظ کو قوت دی۔ یہ وہی معراج ہے جس نے مجھے حمایت علی سے حمایت علی شاعر بنایا۔ میں جو سوچتا تھا وہی لکھ دیتا تھا۔ اور اپنا لکھا ہوا شاعروں کو پیش کر دیتا تھا۔ ایک دفعہ سٹی کالج کے مشاعرے میں کلام پر بڑی بے ادبی کی گئی۔ اگر اس مشاعرے میں زور صاحب صدر نہ ہوتے تو میں نہ جانے کیا کیا کر جاتا۔ ہم بد نصیب لوگ ہیں جو زمین کے بیٹے ہیں اور آسمان کو سر پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ میں اور میری بیوی دونوں سیاست کی بھینٹ چڑھے اور ہم دونوں کو نوکریوں سے نکال دیا گیا۔ میری سحر کو پھر رات میں بدل دیا گیا۔ لیکن نشیب و فراز زندگی کا حصہ ہیں اس لیے میں نے اپنا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ اللہ نے ہماری گود ہری کر دی مگر فکر معاش نے میری معراج کو رُلا دیا۔ ہمارے چمن میں اللہ تعالیٰ نے ایک خوبصورت پھول کھلا دیا تھا۔ ہم دونوں کبھی اداس نہیں ہوئے۔ ہماری خودی ہمیشہ قائم و دائم رہی

”ہم اپنی ذات میں ہیں آپ اک جہاں کی طرح<br>
زمین پر بھی اگر ہیں تو آسمان کی طرح“

حمایت علی شاعر کے ہاں جب بیٹی کی پیدائش ہوئی تو وہ بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ قانون قدرت ہے کہ جب کوئی ادیب بہت زیادہ خوش ہوتا ہے یا اس کو کوئی غم ملتا ہے تو اس کا قلم بھی خاموش نہیں رہ سکتا وہ اس ادیب یا شاعر کو کچھ لکھوانے پر مجبور کرتا ہے۔ اس لیے حمایت علی شاعر نے اپنی بیٹی کی پیدائش پہ ایک نظم تحریر کی۔ نظم پیش خدمت ہے:

”یہ میری بیٹی، یہ زندگی کے حسین خوابوں کی ایک منزل میری محبت بھری رفاقت کا، میرے عہدِ وفا کا حاصل، یہ ننھی سی شمع جس کی لو میں میرا لہو سانس لے رہا ہے۔ میری نگاہ و خرد کو رازِ بقا کا عرفان دے رہا ہے۔“

***

میں سوچتا ہوں کہ فرد کی زندگی بھی کتنی جماعتی ہے
اک آدمی کے جسد میں اک کائنات خاموش سو رہی ہے
کلی کی ننھی سی گود میں محوِ خواب ہیں گلستاں ہزاروں
زمین کے ایک ایک ذرے میں سانس لے رہے ہیں۔ جہاں ہزاروں
نہایت ہی ابرِ باراں مال خورشید کی کہکشاں ہے
قدم قدم پہ ہے موت لیکن حیات کا کارواں، رواں

***

"ابھی میں سوچ رہا تھا کہ کیا کیا جائے
کہ ایک دن میرے اک دوست گھر آئے
کہا کہ ایک رسالہ نکالتے ہیں چلو
ہو سکے تو میرے ساتھ بمبئی میں رہو "۵۵؎

***

"میں امتحان سے فارغ ہی ہوا تھا کہ سنا
بند ہونے کو ہے پاک و ہند کا راستہ
وہ غالباً تھا مئی اور سن تھا اکیاون
کہ میرے دل میں در آیا خیال ترک وطن"۵۶؎

***

"قریب آتی چلی گئی جدائی کی ساعت
کہ میں نے دیکھا عجب اک کرشمہ قدرت
پرند اڑتے گے میرے آس پاس بہت
وہ چیختے تھے کہ ہوں جیسے بد خواس"۵۷؎

***

"عجب سفر تھا جب آ رہا تھا پاکستان
کہ میرے پیچھے تھا کفر اور سامنے ایمان
میں مونا باؤ سے جس رات پہنچا کھو کھرا پار
لگا کہ دل مرا اس پار ہے دماغ اس پار"۵۸؎

***

"میں ہند تھا تو خبریں یہاں کی سنتا تھا
یہاں کے سل پر پھر اپنا سر بھی دھنتا تھا
سنا یہ تھا کہ ترقی پسند اہل قلم
جو ابتداء سے حکومت کے سہہ رہے تھے ستم" ۵۹؎

حکومت کے متعصبانہ رویہ نے ہمیں نوکریوں سے فارغ کر کے ایک نئے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے کہ دوبارہ سے اپنی مالی حالت کو بہتر کیا جائے۔ کچھ دنوں بعد میرے ایک دوست کی میرے گھر آمد ہوتی ہے جو مجھے کہتا ہے میاں تم کمر کس لو اور میرے ساتھ بمبئی چلو ہم وہاں ایک ادبی رسالہ نکالیں گے۔ کیونکہ ترقی پسند ادیبوں کا ایک رسالہ "محاذ" تھا جس کو حکومت نے بند کر دیا تھا۔ اس رسالے میں تحریریں حکومت اور حاکم وقت کے خلاف لکھی جا رہی تھیں۔ دوست کا یہ مشورہ مجھے بہت زیادہ پسند آیا اس لیے میں نے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ میں جب وہاں پہنچا تو میرے چچازاد بہن بھائی جن میں عنایت، مجاہد، شعور، ساجد، رضوان، فرزانہ اور ریحانہ نے مجھے بہت محبت دی۔ یہ لوگ میری بیوی اور بیٹی کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ہم نے جب "محاذ" نکالنے کے لیے حکومت سے اجازت طلب کی تو حکوت صاف انکار کر گئی۔ پھر ہم نے ایک اور رسالہ "لیل و نہار" نکالنے کی کوشش کی۔ مگر اس میں بھی ناکام رہے۔ حکومت ادیبوں سے سخت نالاں تھی۔ وہاں قریب ایک بستی میں بھیمڑی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں تمام ادیب شامل ہوئے۔ وہاں ایک ایاز نامی ادیب نے ایک جوشیلا شعر پڑھا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اب اپنے دیس میں اپنا ہی راج ہو گا۔ جو کھیتوں میں بیج بوئے گا وہی فصل کاٹے گا۔ اب حکومت کو ادیبوں کی چال کا پتا چلا تو سب کو باغی قرار دے کر سب کی گرفتاریاں چاہیں۔ مجھے بس ہر وقت گرفتاری کا خدشہ لاحق تھا کہ نہ جانے کب حکومت کے غنڈے مجھے بھی دبوچ لیں گے۔ جب میں بمبئی پہنچا تو مجھے ہر وقت یہی خیال رہتا کہ کہیں کوئی مجھے نوکری پہ رکھ لے تو کتنا اچھا ہو جائے۔ آخر کار ایک دن مجھے جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر کی باشعور اور انقلابی بیٹی اوشا مل گئی۔ اوشا اور میرا تعلق دکن میں ریڈیو اسٹیشن پہ ہوا تھا۔ اوشا (IPTA) انڈین نیشنل پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن میں ڈرامے سٹیج کیا کرتی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر کام کا آغاز کر ڈالا تھا۔ ۱۹۵۱ء کا زمانہ تھا جب مجھے یہ خبر سننے کو ملی کہ پاکستان میں قانون شہریت نافذ ہونے لگی ہے لہذا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والی آمد و رفت بند ہو جائے گی۔ سو میں نے اپنی شریک حیات کو اپنا ہم راز بنا کر پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کر ڈالا۔ لیکن میرے ذہن میں بے شمار خیالات اٹھ رہے تھے مگر میں نے سوچا:

"نئی زمین ہوتو کیا، آسمان تو ہو گا وہی
خدا تو ہو گا وہی، مہربان تو ہو گا وہی"

میں ہندوستان کو چھوڑنا نہیں چاہ رہا تھا مگر حالات کچھ اتنے خراب تھے کہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے ارادہ باندھا تو میرے ساتھ اور بھی میرے ہم خیال ہجرت کرنے کو تیار ہو گے جن میں شفیع، خواجہ نصیر اور عروج شامل ہیں۔ یہ لوگ انڈیا کو دار الحرب سمجھتے تھے۔ لیکن یہ وہ وقت تھا کہ میں اپنے وطن کی محبت میں دیوانہ وار پھرتا تھا۔ مگر ظالموں نے ہمیں وہاں سکون سے نہ رہنے دیا۔ لہذا ہم نے پاک سرزمین کو ہی سب سے بہتر جانا اور چل دیئے۔ جب ہمارا قافلہ پاکستان کے لیے روانہ وہ رہا تھا تو اس وقت پرندے بہت اداس تھے۔ وہ ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے بدشگونی کا خطرہ لاحق ہو رہا تھا۔ جب حمایت علی شاعر اور ان کے خاندان والوں نے ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو یہ واقعہ دل نکال کر باہر رکھ دینے والا ہے۔ حمایت علی شاعر نے جدائی کے لمحے کو بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہجرت کے لمحے کو بیان کرتے وقت رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"بہت غصیلی نگاہوں سے دیکھتا سورج
کبھی اداس نظر آتی چاند کی سج دھج
کبھی مجھے کوئی دروازہ غور سے تکتا
کبھی مجھے نظر آتا تھا ہر طرف سکتا
ہر چیز میرا راستہ روکتی رہتی
بہت ہی پیار سے یہ گام ٹوکتی رہتی"

حمایت علی شاعر جب پاکستان پہنچے تو کہتے ہیں کہ میں کفر کو پیچھے چھوڑ کر ایمان والوں کی سرزمین کا ہو گیا تھا۔ حمایت علی شاعر نے اپنی آپ بیتی میں سرحدوں کی بڑی دلکش منظر کشی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جب راجستھان کے آخری ریلوے سٹیشن سے الوداع ہو کر پاکستان کے پہلے گاؤں کھوکھراپار پہنچا تو میرا ذہن سرحد پار تھا مگر جسم پاک سرزمین کی ہواؤں میں مست تھا۔ یہاں کا ماحول بالکل ہندوستان کے مقابلے میں بدلا بدلا سا تھا۔ یہاں کالے اور گورے کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ یہاں ہندو اور مسلمان سب برابر تھے۔ سب کو اپنے اپنے حقوق مل رہے تھے۔ میں صبح صادق میرپور خاص میں پہنچا میں نے دیکھا کہ ہندو اور مسلم قریب قریب تھے۔ مگر بڑے پرسکون ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں اللہ نے کے حضور پاکستان کی سلامتی کی بہت سی

دعائیں کی۔ ہم جب کراچی پہنچے تو میں نے دیکھا کہ کراچی اور بمبئی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ وہ بھی گنجان آبادی والا شہر ہے اور کراچی بھی لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔ گاڑیوں کا رش بمبئی میں بھی ہوتا ہے اور کراچی میں بھی۔ کراچی جس کی خوبی یہ ہے کہ اس کو مہاجرین کی پناہ گاہ کہا جاتا ہے۔ ہم نے بھی اس شہر میں مہاجر بن کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ ہم جب ہندوستان میں تھے تو ہمیں خبریں موصول ہوتیں تھیں کہ پاکستان میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں کو حق بات لکھنے پر جیل میں ڈالا جاتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد ہی لوگوں کو شعور دینا تھا۔ اس خیال کو ڈاکٹر اختر رائے پوری اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

> ”صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی بات کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اثر قبول کریں۔ اس کے لیے خدمت خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاہیے۔“[۶۰]

ترقی پسند مصنفین نے اس انداز کو بڑے جاندار انداز میں آگے بڑھایا ہے۔ حمایت علی شاعر کہتے ہیں کہ ہم نے صرف سن رکھا تھا کہ ترقی پسند مصنفین کے ساتھ ہر طرح کا ظلم کیا جاتا ہے۔ ان کو نوکریوں سے نکال دیا گیا تھا۔ ان کی معاشی حالت خراب کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی تھی۔ مگر ان لوگوں نے اپنا کام ہمہ وقت جاری رکھا۔ منشی پریم چند کے خیال میں:

> ”جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت اور حرکت پیدا نہ ہو، ہمارا جذبہ حسن نہ جاگے تو وہ ادب ہمارے لیے بیکار ہے۔“[۶۱]

اس خیال کو ڈاکٹر وحید قریشی کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> ”۱۹۴۷ء سے قبل اس تحریک کا مرکز و محور برطانوی حکومت کے خلاف جد وجہد اور آزادی کی خواہش تھی۔ پاکستان کی تاسیس تحریک سے منسلک ادیبوں کے لیے بڑی آزمائش اور پریشانی کا باعث تھی۔“[۶۲]

ہندوستان میں رہتے ہوئے میں نے جو سنا تھا بالکل درست سنا تھا۔ یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں بھی جمہوریت برائے نام ہی ہے۔ ہر کوئی دوسرے کا گلا کاٹنے کے چکر میں تھا۔ ایک دن میں سڑک کنارے خراماں خراماں چہل قدمی کر رہا تھا۔ مجھے عقب سے ایک آواز آئی کہ رکیے، ایک خاتون کار میں سوار تھی اس نے مجھے کار

میں بیٹھالیااور اپنے دولت خانے پر لے گئی۔ وہ مجھے جانتی تھی مگر میں اس کو جانتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے مجھے فرمائش کی کہ وہ غزل دوبارہ سنادیں "آنکھیں" تو میں نے سنانا شروع کردی۔

### آنکھیں

"شب سیہ میں چراغ تیری آنکھیں
رہ حیات میں رخت سفر تیری آنکھیں
تو ساتھ ہو کہ نہ ہو، زندگی کی راہوں میں
رہیں ہمیشہ ہمسفر تیری آنکھیں
خدا کرے کہ میں بس جاؤں تیری آنکھوں میں
کیے رہیں میری آنکھوں میں گھر تیری آنکھیں
طلوع ہو تیری پلکوں کے سائے میں ہر صبح
جھکی رہیں میری ہر شام پر تیری آنکھیں
میری نگا ہ میں رہ کر بھی جانے کیوں اب تک
میری نگاہ سے ہیں بے خبر تیری آنکھیں
میں خود غرض بھی ہوں کتنا کہ بس یہی چاہوں
رہیں ہمیشہ مری منتظر تیری آنکھیں

***

پھر ایک اسی جرم میں آگیا تھا میں
جہاں سے ہند میں اک دن چلا تھا میں
وہی تھی شہر کی سڑکیں، وہی تلاش معاش
قدم قدم نہ کردہ جرم کی پاداش "[۶۳]

اکتوبر ۱۹۵۰ء میں آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے نکالے جانے کے بعد بے روزگاری کے شب و روز میں نے بڑی مشکل سے گزارے تھے۔ میں روزگار کی تلاش میں پورا پورا دن سڑکوں کی خاک چھانتا تھا مجھے میرے ناکردہ گناہ کی سزا مل رہی تھی۔ ایک وقت تھا کہ دریڈیو حیدر آباد کو سننے والے میری آواز کے منتظر ہوتے تھے۔ انجمن ترقی اردو کو میں اپنا گھر سمجھتا تھا۔ میں انجمن ترقی اردو میں بھی شوق سے کام کرتا تھا۔ میں کالج کے رسالے کے ایڈیٹر انشا صاحب سے بھی ملتا رہتا تھا۔ المختصر وہ میرا دور زندگی کا بہترین دور تھا کہ ظالموں نے میرا سکون برباد کر دیا اور مجھے نوکری سے نکال کر ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ اس لیے میں ہندوستان چھوڑ کر پاکستان آیا مگر یہاں بھی حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔ میں نے جب ہجرت کی تھی تو میرے ساتھ میرے چند دوست

آئے تو۔ میری معراج مجھ سے جدا تھی وہ وہاں ہندوستان میں ہی رہ رہی تھی۔ ایک دن والد صاحب کا خط ملتا ہے کہ معراج پاکستان آرہی ہے۔ جونہی خط مجھے ملا تو میں خوشی کے مارے میری حالت دیدنی تھی۔ یہاں میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر ایک خوش گمان دماغ ضرور تھا کہ کچھ بہتر ہو جائے گا۔ خیر رات گزر ہی گئ صبح قائد ملت کی برسی تھی۔ سارے لوگ مصروف تھے۔ میں اس سوچ میں گم تھا کہ معراج کو کیسے لاؤں گا۔ تب میرے یار شفیع نے کہا کہ یار وکٹوریا لے جاؤ اور اپنی غریبی کے منہ پہ تھپڑ مارو۔ خیر میں لے گیا اور اپنی پیاری معراج کو اس پہ گھر لے آیا۔ راستے میں بہت ساری باتیں ہوتیں رہی۔ میں نے معراج کو اپنا سارا شہر دکھایا۔ ہم اس پل کے پاس پہنچے جہاں سے ناکام عاشق چھلانگ لگا کر خود کو سمندر کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ہم نے راستے میں کئ منظر دیکھے۔ جب ہم اپنی جھونپڑی میں آن پہنچے تو مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کہ اس کو یہاں کیسے رکھوں گا۔

"یہ شہر کراچی دیار پاک کا دل
تمام ہجرتیوں کی یہ آخری منزل
ہزار طرح کے انسان یہاں رہتے ہیں
وہی جو خود کو غریب الدیار کہتے ہیں"[۶۴]

***

"ذرا تو سوچیے کیسا نظام قدرت ہے
تضاد ہی سے ہر اک شے یہاں عبارت ہے
یہ رات دن، یہ بہار و خزاں، یہ شمس و قمر
رکاوٹیں بھی ہیں لیکن سبھی ہیں محوِ سفر"[۶۵]

***

"کراچی شہر ہے چھوٹا سا پاکستان
یہاں پہ رہتے ہیں ہر رنگ ونسل کے انسان
انہیں میں شاعر و فنکار بھی، ادیب بھی ہیں
جو اہل علم ہیں، میری طرح غریب بھی ہیں"[۶۶]

***

"انہیں دنوں ہوا، اک اور رزق کا دریا
کہ سندھ میں ہوا اک " نشرگاہ " کا آغاز
وہ شہر تھا میرا محبوب شہر حیدر آباد
جو میرے واسطے صدیوں سے تھا یہاں آباد"[۶۷]

* * *

"ہمارے لوگ بہت ذہن سادہ رکھتے ہیں
جو آئے آئے در دل کشادہ رکھتے ہیں
ملا نہ جب حسب توقع اپنے اللہ سے
تو باندھ بیٹھے ہر امید مارشل لا سے"[۶۸]

* * *

"وطن میں آتی تھی پہلے بھی ایسی ساعت
زباں کی آڑ میں بیدار کی گئی نفرت
وہ ایک صوبہ جو کل مشرقی پاکستان تھا
وہاں بھی پیدا کیا گیا زباں کا بحران"[۶۹]

* * *

ایک شاعر یا ادیب کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ جب وہ لکھتا ہے تو اپنے قاری کو سامنے رکھ کر لکھتا ہے۔ حمایت علی شاعر نے بالکل ایسا ہی کیا ہے۔ اپنے سیدھے سادے اسلوب کی وجہ سے وہ اردو ادب کے اندر بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ حمایت علی شاعر کا اسلوب ہی ان کو ان کی اصل پہچان دلواتا ہے۔ " آئینہ در آئینہ " میں حمایت علی شاعر نے پورے ہندوستان اور پاکستان کے دل کراچی کی بڑی بہترین منظر کشی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کراچی ایک ایسا شہر ہے جس کے بطن میں مہاجر آباد ہیں۔ اس نے ہر طرح کے مہاجر کو خوش آمدید کہا ہے۔ کراچی میں ہم جہاں رہتے تھے وہ بہت غریب لوگوں کے رہنے کی جگہ تھی۔ اور زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے بڑی مشکلات دیکھی ہیں۔ یہاں کے لوگ ان کو دھرتی کا بوجھ سمجھتے تھے۔ حالانکہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں میں زیادہ تر استاد، صحافی، شاعر اور ادیب لوگ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی محفل میں میرے بھی دن گزرے تھے۔ کراچی ویسے تو شاعروں اور ادیبوں سے بھرا ہوا تھا مگر اس میں گندگی کے ڈھیر بھی جابجا نظر آتے تھے۔ اس گندگی کی بدبو نے یہاں کے رہنے والوں کا جینا دوبھر کیا ہوا تھا۔ اس طرح کی مشکلات کی وجہ سے مجھے ہندوستان بہت یاد آتا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں صرف ایک ہی فرق ہے کہ ہندوستان میں عزت، مال و جان محفوظ نہیں ہے جبکہ پاکستان میں یہ سب چیزیں محفوظ ہیں۔ یہ ملک ویسے تو بہت اچھا تھا مگر بے روزگاری یہاں پہ سر چڑھ کر بول رہی تھی۔ بے

روزگاری نے مجھے بہت پریشان کیے رکھا۔ میرا کرب جب بڑھتا تھا تو میں اپنے اس کرب کو اپنی شاعری میں بیان کر دیتا تھا۔ حمایت علی شاعر اپنے کرب کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

چل خسرو اپنے گھر

"تھک چلے پاؤں ، بس اے دل نادان، چل بھی
چل کہ اب رات کا نشہ بھی ہے مائل بہ خمار
قمقمے اونگھ رہے ہیں کہ بہت جاگ چکے ہیں
کچھ ستارے ہیں تو ان کی بھی آنکھیں بوجھل
وہ بھی تیرے لیے نیند اپنی بہت تیاگ چکے
چاند پہرے کے سپاہی کی طرح ایستادہ
سوچ میں ہے کہ جو تو جائے تو وہ بھی چل دے
راہگزر ایک طوائف کی طرح درماندہ
ایسے لیٹی ہے کہ کون آئے گا اب رات گئے "

ایک دفعہ کراچی میں طلبہ اور پولیس کے درمیان احتجاج کے دوران لڑائی ہو گئی اس لڑائی میں بہت سے طلبہ زخمی ہوئے تھے اور سینکڑوں شہید بھی۔ یہ اس دور کی بات ہو رہی ہے جب غلام محمد گورنر، خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم اور مشتاق احمد گورمانی وزیر داخلہ تھے۔ اس ظلم کو دیکھ کر میرا قلم کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ اس لیے میں نے دو نظمیں لکھ لیں۔ میری ایک نظم ۸ جنوری ۱۹۵۳ء میں "افکار" میں چھپی۔ جبکہ میری دوسری نظم بہت شاہکار نظم تھی جس کا عنوان ہی "دیوانی" تھا۔ ایک خبر اخبار میں چھپی تھی کہ ایک عورت زخموں اور لاشوں کے درمیان دیوانہ وار پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہی تھی شاید کے اس کا کوئی اپنا اس سے جدا ہو گیا تھا۔ میری نظم دیوانی کا پہلا شعر یہ ہے:

"خوشیاں مناؤ، رقص کرو، قہقہے لگاؤ
لوگو خموش کیوں ہو، میرے ساتھ تم بھی گاؤ"

حمایت علی شاعر نے واقعات کو تشبیہات و استعارات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہی اس منظوم آپ بیتی کی کامیابی کی وجہ ہے۔ حمایت علی شاعر پہ ایک دن خدا بڑا مہربان ہوتا ہے اور ان کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوتی ہے۔ ایک نئے ملک میں خدا نے ایک نیا تحفہ دیا ہے کہ میرے بعد میرا نام زندہ رکھے گا۔ میں نے اپنے بیٹے کا

نام روشن خیال رکھ دیا۔ انہی دنوں سکول میں ایک اردو سندھی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ جو پاکستان میں پہلی ۲۳ اور ۲۴ دسمبر ۱۹۵۳ء کو منعقد ہوئی تھی۔ اس میں اردو اور سندھی ادیبوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس کانفرنس کا آغاز اے کے بروہی نے کیا جبکہ صدارت عبد المجید سالک نے کی۔ یہاں ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں میری ملاقات ملک کے بڑے بڑے شعرا سے ہوئی تھی۔ جن میں خمار انصاری اور ایاز سر فہرست ہیں۔ مشاعرے میں سب لوگوں نے کلام پڑھا۔ میں نے بھی کلام پڑھا۔ میری نظم "اجنبی مہمان" بہت پسند کی گئی۔ مجھے اس کی پسندیدگی پر بہت خوشی ہوئی۔ اس نظم میں طنز کیا گیا تھا سیاستدانوں پر۔ یہ نظم میری پہچان بن کر رہ گئی۔ یہ نظم امریکی وزیر خارجہ مسٹر ڈلس کی آمد پر لکھی گئی تھی۔ اس نظم کا آخری طنزیہ شعر یوں ہے:

"کچھ تو دو اس بہار کا انعام
کچھ تو اس گلبدن کو پیار کرو"

حمایت علی شاعر نے "آئینہ در آئینہ "کا زیادہ موضوع کراچی شہر کو ہی بنایا ہے۔ وہ کراچی شہر کو چھوٹا پاکستان کہتے ہیں۔ اس شہر میں ہر رنگ و نسل کا آدمی موجود ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی کثرت تھی اس شہر میں۔ یہاں ادیب دو دھڑوں میں تقسیم تھے ایک دھڑا ترقی پسند ادیبوں کا تھا۔ اس میں سے کچھ لوگ سرکاری ملازم تھے اس لیے ترقی پسندی سے تھوڑا گریز کرتے تھے۔ حمایت علی شاعر نے اردو ادب کی تحریکوں کا تذکرہ بھی بڑی عمدگی کے ساتھ کیا ہے۔ حمایت نے واقعات کو کچھ علامتی انداز میں بیان کیا تو کچھ ابہام سے کام لیا۔ حمایت علی شاعر نے نظیر آکبر آبادی، نواب خان شیفتہ کلیم الدین احمد، جالبی، احمد ندیم قاسمی، ممتاز حسین " یاس یگانہ چنگیزی" سے بہت اثر قبول کیا۔ یہ سارے لوگ ایک ہی تھالی کے بینگن تھے۔ مگر یہ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گے تھے ترقی پسند مصنفین کو سچ لکھنے کے گناہ میں ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی سازش کیس میں جیل ڈال دیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ سجاد ظہیر بھی تھے۔ سجاد ظہیر جیل کے مناظر کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"راولپنڈی سازش کیس کے دنوں میں فیض احمد فیض کے ساتھ میں بھی سنٹرل جیل میں تھا۔ دسمبر ۱۹۵۲ء تک ہمارے مقدمے کی سماعت ہو چکی تھی۔ ہمیں روز روز اسپیشل ٹربیونل کے اجلاس میں جا کر خوار ہونے سے نجات مل گئی تھی"[۶۷]

ایک طرف حکومت کا ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ بدتر سلوک اور دوسری طرف بے روزگاری کا یہ عالم کہ لوگوں کو روٹی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ خدا کی کرنی ایسا ہوا کہ سندھ میں ۱۹۵۵ء میں ریڈیو پاکستان

حیدر آباد کا آغاز ہو گیا۔ ہندوستان میں بھی میرا شہر حیدر آباد ہی تھا اس لیے یہ نام مجھے بہت عزیز تھا۔ کراچی کے حالات بہت سنگین ہو چکے تھے۔ اس لیے میں نے کراچی کو خیر باد کہا اور حیدر آباد چلا گیا۔ حیدر آباد آنے کے بعد مجھے عجیب سکون ملا۔ مجھے یوں لگا کہ میں جنت کے کسی کنارے میں بیٹھا اپنے آپ میں مگن ہوں۔ وہ سکون مجھے اتنا عرصہ کراچی میں میسر نہ ہوا۔ جو سکون مجھے حیدر آباد نے چند دنوں میں عطا کر دیا تھا۔ حیدر آباد میں مجھے میرے بہت اچھے اچھے دوست ملے۔ جن میں حفیظ ہوشیار پوری، حمید نسیم، سجاد حیدر، عمر مہاجر، الیاس عشقی، عبدالعزیز خالد، اختر انصاری اور بہت سے دوست ملے جن سے مل کر زندگی کھل اٹھی تھی۔ حالات وہاں بھی کچھ اچھے نہ رہے۔ سیاست دانوں نے پاکستان کو اس وقت بھی تباہ کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ one unit کا فارمولا اسی دور میں اپنایا گیا۔ اس دور میں شمیم احمد اور ایاز کے ساتھ مل کر ہم نے ایک رسالہ شعور نکالا۔ یہ دونوں ترقی پسند آدمی تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ دونوں ترقی پسند ادیبوں کے سخت مخالف ہو گے اور انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کے خلاف گستاخانہ مضامین قلم بند کیے۔ یہ دور خاصہ کشمکش کا دور تھا۔ حکومتی سطح پر بھی بڑے بڑے پیمانے پر تبدیلیاں نظر آ رہی تھی۔ ۱۹۵۳ء کو ملک غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو وزارت عظمٰی سے برطرف کر کے محمد علی بوگرہ کو پاکستان کا وزیر اعظم بنایا تھا۔ حالات روز بروز خراب ہو رہے تھے کہ ۱۹۵۸ء میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے ملک میں مارشل لا لگا دیا۔ ملک کے دستور کو بنانا اور توڑنا سیاسی انتشار کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ حمایت علی شاعر نے اس نظم میں عمدہ اسلوب اپنایا ہے۔ بہت سیدھے سادھے لفظوں سے بڑے بڑے سنگین واقعات کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان نے پاکستان کا صدر مقام کراچی سے تبدیل کرنے کا علان کر دیا اور پاکستان کا صدر مقام اسلام آباد رکھنے کا اعلان کیا۔ جب بھی کسی ملک میں مارشل لاء لگتا ہے تو حکمرانوں کا رشتہ عوام سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اپنے ظالم رویے کی وجہ سے ناحق بات کو حق بات کہنے کے حق دار ہوتے ہیں۔ ہمارے لوگ سادہ لوگ ہیں ان بے چاروں پہ ہمیشہ ظلم ہوئے ہیں۔ یہ حکمرانوں کے ظلم سے بچ نکلتے تو وڈیروں کا حال ان کا منتظر ہوتا ہے۔ جب ملک میں مارشل لاء لگا تو حکمرانوں کے خیالات یکسر بدل گئے تھے۔ اس وقت جب مارشل لاء لگا تو سندھ میں جنرل ٹکا خان ڈپٹی ایڈ منسٹر ٹیر تھے۔ انھوں نے ایک فون کال پہ آرڈر جاری کیا کہ دفتروں اور تعلیمی اداروں میں سندھی زبان پر پابندی عائد کر دی جائے۔ مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ میں نے اس خوشی کا اظہار شیخ ایاز " شخص و شاعر " میں کیا ہے۔ صرف اردو کو جب سرکاری زبان کا درجہ ملا تو اس وقت بنگلہ دیش کے رہنے والوں نے احتجاج کیا کہ بنگالی زبان کو بھی اردو کے ساتھ شامل کیا جائے۔ خیر ملک کی

دوسری زبانوں کے ساتھ بنگالی کو بھی اردو کے بعد قومی زبان بنادیا گیا۔ حمایت علی شاعر نے "رائٹرز گلڈ" کے واقعے کو بھی بڑے سیدھے سادے الفاظ میں بیان کیا کہ پاکستان رائٹرز کنونشن جو تین روزہ تھا۱۹۵۹ء میں کراچی میں کرایا گیا۔ جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے تقریباًاڑھائی سو اہل قلم نے شرکت کی۔ یہ ادیب اس کنونشن کے بنیادی اراکین قرار پائے۔ جن میں جمیل الدین، گلڈ کے اعزازی افسر رابطہ جبکہ شہاب صاحب گلڈ کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ حمایت شاعر کے مجموعہ کلام ''آگ میں پھول'' کو بھی صدارتی ایوارڈ ملا۔

''وہ خطہ ہم جسے کہتے تھے بازوئے مشرق
طلوع مہر کا پیغام بر ، روئے مشرق
وہ خط ہاں وہی نذرل کی ارض لا فانی
جہاں جسیم تھے اور عندلیب شادانی ''[۱۷]

***

''عجب دور تھا وہ جب بھی یاد آتا ہے
تو اک ستارہ کہیں دور ٹوٹ جاتا ہے
کرن کرن نظر آتی ہے شیر کی مانند
فضا میں ہوئی ہے شمس وقمر کی ڈھال بلند''[۲۷]

***

''دیار پاک میں ایسے بھی سال آئے ہیں
مشاعروں نے بہت رت جگے منائے ہیں
وہ مدرسے ہوں، پیروں کے آستانے ہوں
امام باڑے ہوں،پیروں کے آستانے ہوں''[۳۷]

***

''میں سندھ میں تھا ابھی ریڈیو سے وابستہ
قلم بکف تھا مگر زندگی تھی پابستہ
میں جو بھی لکھتا بہت احتیاط سے لکھتا
دماغ و دل کے لطیف ارتباط سے لکھتا''[۴۷]

***

”وہ مسئلے جو ادھورے تھے رنگ لے آئے
میرے وطن میں نئی ایک امنگ لے آئے
وہ جنگ جو کشمیر میں چھڑی تھی کبھی
وہ بند ہوکے پس پردہ اب بھی جاری تھی“[۵۷]

***

حمایت علی شاعر نے اپنے دھیمے اسلوب سے اس منظوم خود نوشت میں بنگلہ دیش کی ادبی صورت حال کو بیان کیا ہے کہ یہ خطہ علم و ادب کے حوالے سے بڑا ذرخیز خطہ ہے۔ اس خطے میں قاضی نذر الاسلام جسیم الدین، ڈاکٹر عندلیب شادانی، احسن احمد اشک شاہین غازی پوری، مقبول نقش، اختر لکھنوی، جوش ملیح آبادی، قمر جلالوی، حبیب دہلوی، کشور ناہید، جمیل الدین عالی جیسے بڑے نام شامل ہیں۔ یہ سارے لوگ آپس میں ایک جسم کی مانند تھے ان تمام لوگوں نے اردو ادب کی ترقی و ترویج میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ بنگلہ دیش بھی ہمیشہ سے تباہی کے دھانے پہ رہا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں دوسری جنگ عظیم کے قریب بنگلہ دیش میں ایک خوفناک قحط پڑا تھا جس نے بہت قیمتی جانوں کو نگل لیا تھا۔ میں نے تب بھی ایک نظم قحط زدگان کے نام لکھی تھی۔ اس نظم کا عنوان "بنگال سے کوریا تک" ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ بنگلہ دیش میں جو لوگ بچے تھے ان میں کسی کے سر پہ دوپٹہ نہیں تھا۔ کسی کے پاؤں جوتے سے خالی تھے۔ لباس برائے نام تھا۔ آدھے آدھے جسم برہنہ تھے۔ مگر خدا نے ان لوگوں کو علم و ادب سے نوازا ہوا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے واقعات کو حمایت علی شاعر نے بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے بگل کو بطور علامت استعمال کیا ہے جس کی ایک آواز پہ لوگ ساکت و سامت ہو جایا کرتے تھے۔ مگر ایک مرد مجاہد ناصر نامی نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ یہ ایک انقلابی آدمی تھا۔ میں نے اس پہ قلم اٹھایا اور ایک غزل اس کے نام لکھ دی۔

اس غزل کے اندر ایک روسی انقلابی خاتون فیوچک کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جس کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس خاتون کا صرف اور صرف یہ قصور تھا کہ اس نے انا الحق کا نعرہ لگایا تھا۔ حمایت علی شاعر نے امریکہ، روس کی چپقلش کو بھی اپنی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے کہ جب امریکی جاسوسی طیارہ پشاور سے اڑا اور روس کی فضائی حدود میں دخل ہوا تو روس نے اس کو قابو کر لیا۔ روس کی طرف سے پاکستان کو ختم کرنے کی دھمکی ملی تھی۔ ہمارے ملک کے حالات بھی خراب چل رہے تھے۔ تب ۱۹۶۲ء کا آئین ترتیب دیا گیا تھا۔ جس میں محترمہ فاطمہ جناح پہلی خاتون ہیں جن کو مذہبی جماعتوں نے اپنا امیدوار نامزد کیا تھا۔ اس دور میں حکومت فوجی چلا رہے تھے اس

لیے عوام ان سے تنگ تھی بلکہ شعرا اور ادیب بھی تنگ تھے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ اس دور میں حکومت کی طرف سے سبط حسن کو ان کی مشہور کتاب " قاضی کے مزار " پر آدم جی ایوارڈ ملا تو انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اس دور کے اہم شعرا میں جالب، اجمل خٹک، جو پشتو کے شاعر تھے اور گل خان نصیر جو بلوچی کا نامور شاعر تھا۔ میں نے ان کے حوالے سے ایک غزل لکھ ڈالی تھی جو ان سے ناراضی کا اظہار تھا۔

”ہر قدم پہ نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ
کس لیے کیجیے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
جبکہ مٹی کے کھلونے سے بہل جاتے ہیں لوگ
کتنے سادہ دل ہیں اب بھی سن کے آواز جرس
پیش و پس سے بے خبر، گھر سے نکل جاتے ہیں لوگ
شمع کی مانند اہل انجمن سے بے نیاز
اکثر اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے ہیں لوگ
ان کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کھا کر تو سنتے ہیں، سنبھل جاتے ہی لوگ“

حمایت علی شاعر نے اپنی اس منظوم آپ بیتی میں پاکستان کے باغ و بہار کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں ایک وقت ایسا آیا ہے کہ ہر طرف مشاعروں کی گونج تھی۔ کوئٹہ، پشاور، کراچی، لاہور میں سخن وری کی برابر گونج تھی۔ لیکن داتا کی نگری میں کچھ زیادہ ہی محفلیں سجا کرتی تھی۔ یہ وہ شہر ہے جہاں اہل قلم لوگوں کے ڈیرے رہے ہیں۔ اس شہر میں اقبال جیسے مرد قلندر خوابیدہ ہیں۔ پطرس، تاثیر، حفیظ سالک، فیض، احمد ندیم، وقار و دانش عابد عبد اللہ جیسے لوگ تھے جن سے میں مل کر بہت بدلا۔ حمایت علی شاعر نے حروف عطف کا ستعمال کر کے بات میں امنگ پیدا کیا ہے۔ یہی اس کے اسلوب کی خوبی ہے کہ وہ بات کو بڑی عمدگی سے کہَ جاتے ہیں۔ حمایت علی شاعر نے اپنے وطن کے ساتھ ساتھ اس کے لوگوں کی بڑی تعریف کی ہے کہ یہ لوگ میرے وطن کی طرح بہت پیارے ہیں۔ یہ لوگ خلوص و محبت کی مجسم تصویر ہیں۔ حمایت کہتے ہیں کہ ویسے تو پاکستان بہت خوبصورت ہے مگر کہیں کہیں فوجیوں اور وڈیروں نے اس پہ قبضہ کیا ہوا ہے۔ عوام بہت سیدھے سادے ہیں۔ حمایت علی شاعر اپنے عہد کے بہت بڑے قلم کار

تھے۔ انہوں نے اردو ادب کے لیے نئ نئ اصناف کو متعارف کرانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ میری کتاب " آگ میں پھول" میں نظموں اور غزلوں کے علاوہ کچھ رباعیات بھی شامل تھی۔ اس کے علاوہ ثلاثیاں بھی تقریباً ۱۹۶۰ء سے لکھتا ہوا آرہا تھا۔ بعد میں تلاثی کا نام بدل کر تثلیث رکھا تھا۔ اس سے پہلے اردو میں تثلیث لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ اس لیے اردو میں ثلاثی کے موجد حمایت علی شاعر ٹھہرتے ہیں۔ حمایت علی شاعر نے ڈرامہ نگاری میں بھی تیر آزمائے ہیں۔ انھوں نے برزخ اور بازی گر منظوم ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان ڈراموں کا تذکرہ بھی آئینہ در آئینہ میں ملتا ہے۔ حمایت علی شاعر نے ریڈیو کے لیے بھی ڈرامے لکھے ہیں۔ حمایت علی شاعر نے ٹی وی کے مقبول ترین پروگرام "کسوٹی" کو بھی ترتیب دیا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں حمایت علی شاعر کو فلم " آنچل" کے لیے بہترین نغمات لکھنے پر اعلی ایوارڈ ملا تھا۔ جب انسان عروج پر پہنچتا ہے تو مخالفت بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ میری کامیابی دیکھ کر کچھ لوگوں سے رہا نہ گیا۔ انھوں نے مجھے نقصان پہنچانے کے بھرپور کوشش کی مگر میرا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ حمایت علی شاعر نے تقسیم ہند کے مسائل کو بھی بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ تقسیم کے وقت پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمکش بہت زوروں پہ تھی اس لیے ہندوستان کبھی پاکستان کا پانی بند کر دیتا تھا تو کبھی مشترکہ دولت دینے سے انکار کر دیتا تھا اور کبھی زمینی بندر بانٹ میں مسائل کھڑے کر دیتا تھا۔ ان تمام مسائل کو حمایت علی شاعر نے " آئینہ در آئینہ " میں بڑی تفصیل سے منظوم صورت میں بیان کیا ہے۔ حمایت کہتے ہیں کہ ۱۹۴۸ء میں کشمیر کی جنگ ہوئی تھی جس کے بعد یہ ریاست وجود میں آگئی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں بھارت نے امریکی باتوں میں آکر ہماری سرحد توڑ دی تھی جس کا خمیازہ ان کو بہت عرصہ تک بھگتنا پڑا تھا۔ یہ جنگ بہت سخت جنگ تھی جو سترہ دن جاری رہی تھی۔ اس جنگ میں بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کو " آئینہ در آئینہ " میں منظوم صورت میں بیان کیا ہے۔ جہاں باقی قلم کار ملی نغمات لکھ رہے تھے وہاں میں نے بھی اپنا حصہ ڈالا اور تین نغمے قلم بند کیے۔

۱۔ جاگ اٹھا ہے سارا وطن ساتھیوں، مجاہدو

۲۔ اے دشمن دین تو نے کس قوم کو للکارا ہے

۳۔ میرے بہادر بھیا، تجھ پہ ناز کرے تیری بہنا

یہ تو نغمات تھے جو جنگ کے دنوں میں لکھے گئے تھے۔ ان نغمات نے نوجوان فوجیوں کو جوش وولولہ بخشا جو بڑے مشہور ہوئے۔ ان دنوں میری ایک نظم " لہو " بھی بہت مشہور ہوئی تھی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں

بے شمار مالی و جانی نقصان کے بعد آخر کار جنگ کا خاتمہ ہوا۔ صدر پاکستان فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان اور وزیر اعظم ہندلال شاستری کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ تاشقند میں ہوا۔ اس معاہدے کی ذوالفقار علی بھٹو نے مخالفت کی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو اور ایوب خان کے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ پاکستان کے بنتے اور بگڑتے ہوئے حالات کو حمایت علی شاعر نے بڑے احسن طریقے سے قلم بند کیا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں ذوالفقار علی بھٹو نے شیخ مجیب الرحمان سے ووٹ زیادہ لیے تھے مگر مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان نے سو فیصد کامیابی حاصل کی تھی۔ اس لیے چھ نکات کو موضوع بنا کر بھٹو صاحب نے ا" ادھر تم ادھر ہم" کا نعرہ لگالیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمان کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ حمایت علی شاعر کہتے ہیں کہ اسی دوران ہم کچھ شعرا مشرقی پاکستان میں ایک مشاعرے میں گئے تو ہمیں بہت مسائل کا سامنا رہا۔ ہم بڑی مشکل سے جان بچا کر پاک سر زمین میں داخل ہوئے تھے۔ اس ساری صورت حال کو حمایت علی شاعر نے اپنی منظوم آپ بیتی " آئینہ در آئینہ " میں شامل کیا ہے۔

"وہ وقت اور تھا پینسٹھ سے مختلف تھا بہت
کسی پہ ہو نہ ہو، مجھ پہ تو منکشف تھا بہت
میں ایک نظم سناؤں ذرا عجیب سی ہے
ترانہ ہے مگر اس کی فضا عجیب سی ہے"[۷۶]

***

"ادھر کچھ اپنے مسائل ادھر وطن کا غم
کسی کو شمع کسی کو تھا انجمن کا غم
وہ نعرہ جس پہ تھا پوشیدہ لاشعور کا عکس
نمایاں ہو گیا یک لخت اس میں دور کا عکس"[۷۷]

***

"جو فلم میں نے بنائی تھی کامیاب ہوئی
میرے حق میں نئی زندگی کا باب ہوئی
ہر ایک نغمہ تھا اس کا عوام میں مقبول
کئی ایوارڈ بھی اس فلم نے کئے تھے وصول"[۷۸]

***

"ہمارے پاس رہا کیا تھا نصف پاکستان
مگر ہماری تھی پہچان صرف پاکستان
جناب بھٹو کے ناظم تھے مارشل لاء کے
مگر بفضل خدا "قائد عوام" بھی تھے"[۷۹]

***

"یہ نظم بھی اس دور کی پرانی نظم
ہماری آپ کی کرتی ہے ترجمانی نظم
گراں نہ ہو تو اسے دوبارہ پڑھ لیجیے
کچھ اختلاف بھی ہو تو خدارا پڑ لیجیے"[۸۰]

حمایت علی شاعر نے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کو اپنی منظوم آپ بیتی میں بڑے صاف ستھرے انداز میں بیان کیا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ بغیر کسی وجہ کے بڑھا کر دونوں ملکوں نے اپنا اپنا بہت زیادہ نقصان کیا تھا۔ اس جنگ کے واقعات کا بیان حمایت علی شاعر کے مجموعہ کلام "مٹی کا قرض" میں شامل ہے۔ اس نظم میں جنگ پر جاتے ہوئے فوجیوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

"سپاہی جنگ پر چلے جاتے ہیں کتنی آن سے
بدن پہ وردیاں سجائے اک عجیب شان سے
تڑپ کے دیکھتی ہے صبح جھک کے آسمان سے
جوان جا رہے ہیں آج آپ اپنی جان سے
نبرد آزما ہے کون پردہ محاذ میں
نہ جانے کتنے راز ہیں نہاں اس ایک راز میں
ہوائیں چپ، فضائیں چپ، زمین آسمان چپ
خلا میں تک رہا ہے، آنکھ اٹھائے ہر مکان چپ
ہجوم در ہجوم لوگ اور زبان چپ
ہر ایک سمت حشر کا سماں مگر ہیں کان چپ
کسے خبر سنور رہے ہیں یا بکھر رہے ہیں ہم
بڑے عجیب امتحان سے گزر رہے ہیں ہم
یہ جنگ کس کی ہے خود اس وطن سے پوچھیے

وطن سے دور دستوں کی انجمن سے پوچھیے
جبیں جبیں پہ مضطرب شکن شکن سے پوچھیے
خدا بنا ہوا ہے جو اس ارض سے پوچھیے
ہوائیں چیختی پھریں انار کی انار کی
یہ زرگری کی جنگ ہے یہ جنگ اقتدار کی "

یہ نظم میں نے تب لکھی تھی جب ہر ایک ذہن انتشاری تھا۔ ایک طرف پاک فوج تھی جبکہ دوسری طرف مشرقی پاکستان کے چھاپہ مار تھے۔ یہ گروپ مکتی باہنی اور شکتی باہنی کے نام سے مشہور تھے۔ یہ گوریلا فوج کے تربیت یافتہ لوگ تھے جو پاک فوج پر شب خون مارتے تھے۔ حمایت علی شاعر نے ۱۹۷۱ء تک بنگلہ دیش کے سیاسی حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس دور میں جنرل یحیٰ خان کی حکومت کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ اس کا حوالہ بھی " آئینہ در آئینہ " میں موجود ہے۔ اگلی دو اقساط بھی بنگلہ دیش کے سیاسی حالات کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ بنگلہ دیش کے حوالے سے ساری باتیں پہلے ہو چکی ہیں۔ واپس ان باتوں کو دہرانے سے یہ قسط طوالت کا شکار ہو جائے گی۔ لہذا چند اہم واقعات کو شامل کر کے بات کو سمیٹنے کی کوشش کی جائے گی۔ ۱۹۷۱ء میں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں چوتھی بار مارشل لاء نافذ ہوا اور ذوالفقار علی بھٹو مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر بنے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو قائد ایوان کہا جانے لگا۔ کیونکہ بھٹو کا نعرہ تھا کہ "جمہوریت ہماری سیاست، اشتراکیت، ہماری معیشت، مذہب ہمارا اسلام اور طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں" حمایت علی شاعر نے ملک ٹوٹنے کی داستان بھی اس نظم میں بیان کی ہے کہ جب ملک ٹوٹا تو لوگ کس کرب سے گزر رہے تھے۔ یہ کوئی ان سے پوچھے جو تین ہجرتوں کا عذاب سہہ رہے تھے۔ یعنی ہندوستان سے کراچی، کراچی سے حیدر آباد اور پھر حیدر آباد سے بنگلہ دیش چلے جانے والوں کا دکھ۔ حمایت علی شاعر نے ان لوگوں کا دکھ بیان کیا ہے جو اپنوں سے مکمل طور پر بکھر چکے تھے۔ وہ اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ کوئی اس نعرہ کا رونا رو رہا تھا جو "لاشعور" میں پوشیدہ تھا۔ کوئی ملت اسلامیہ کے ملک یعنی پاکستان کو دو لخت ہوتے دیکھ کر بول اٹھا۔ ایک طرف ملک کا نظم و نسق جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب چلانے لگے جبکہ دوسری طرف بنگلہ دیش میں نیا سیٹ اپ ترتیب دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں جب انتخابات ہوئے تو ۹ سیاسی جماعتوں نے " پاکستان قومی اتحاد " کے نام سے حصہ لیا۔ پیپلز پارٹی کی جیت کو دھاندلی قرار دیا اور الیکشن دوبارہ کرانے کی اپیل کی۔ مظاہرے شروع ہو گے گولیاں چلنے لگی لوگ مرنے لگے بہت زیادہ حالات خراب ہو گے تھے۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو پاکستان آرمی کے چیف جناب جنرل محمد ضیاء الحق نے آئین کی کسی شق کے مطابق حکومت کو

ختم کر دیا۔ تین ماہ کے اندر اندر دوبارہ الیکشن کرانے کا فیصلہ کیا گیا اور اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ نواب محمد احمد خان کے قتل کیس میں بھٹو کو قید کر لیا گیا۔ بہت عرصہ کیس چلتا آخر کار ۱۹۷۸ء میں بھٹو کو سزائے موت سنائی گئی۔ ادھر مجیب الرحمان کو ڈھاکہ میں بھٹو کی ہلاکت سے پہلے اپنے بیوی بچوں سمیت ۱۹۷۵ء کو گولی سے اڑا دیا تھا۔ حسینہ واجد ملک ان کی بیٹی تھی مگر وہ ان کے ساتھ نہیں تھی اور بچ گئی تھی۔ مجیب الرحمان کے قتل کے بعد ۲۰ سال فوج کے کچھ جرنیل اور ایک جرنیل کی بیوی بنگلہ دیش پر حکمرانی کرتے رہے۔ بہت عرصہ بعد حسینہ واجد الیکشن جیت کر بنگلہ دیش کی وزیر اعظم بنی۔

"ایک رات بہت یونہی طویل رات آئی
کہ جیسے موت کوئی بعد از حیات آئی
پھر ایک بار کہیں صور کی صدا گونجی
بگل بغیر بگل سی کوئی نوا گونجی"[81]

***

"ہماری قوم میں باہم نفاق بھی ہے بہت
کہ لڑنے مرنے میں ہر شخص طاق بھی ہے بہت
دلوں میں آگ بھری ہے بس اک ہوا کی ہے دیر
حال سامنے ہو گا کہ ابتدا کی ہے دیر"[82]

***

"کہیں بھی جائیں وطن اپنا ساتھ رہتا ہے
ہر ایک یاد ہر ایک سپنا ساتھ رہتا ہے
وہاں ملے مجھے اکثر رفیق ایسے بھی ہیں
جو میرے دل میں ہمیشہ رہے ویسے بھی ہیں"[83]

***

"میں لوٹتے ہوئے لندن میں ہفتہ بھر ٹھہرا
کہ میرے دل میں تھا اس شہر کا اثر گہرا
بزرگ اس کو ولایت کا نام دیتے تھے
تمام شہروں میں اعلیٰ مقام دیتے تھے"[84]

***

"میں انڈیا تو کئی بار جا چکا تھا مگر

نصیب نہ ہو سکا تھا دکن کی سمت سفر

مگر جو اب کہ گیا عرصہ دراز کے بعد

تو مختلف نظر آیا تھا حیدر آباد"[۸۵]

حمایت علی شاعر نے پاکستان کے بنتے اور بگڑتے حالات کو تلمیحات کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"طلسم ساقی" کہو یا فسونِ گو سالہ سبھی ہوئے

"من و سلویٰ" پھر سے ہم پیالہ

ضیاء الحق تین ماہ میں الیکشن کروانے کے بہانے سے آئے اور گیارہ سال حکمرانی کر کے چلے گے۔ یہاں حمایت نے سام سامری امریکہ کو کہا ہے۔ پاکستان میں دو طرح کے لوگ موجود تھے۔ ایک کو امت موسیٰ کہا گیا اور دوسرے کو سامری جادو گر کے ماننے والے کہا گیا۔ مارشل لاء میں اکثر تحریر و تقریر پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ مگر لکھنے والوں نے ہر دور میں لکھا ہے۔ کراچی میں ریڈیو پاکستان سے لے کر مختلف گھروں تک ادیبوں اور شاعروں کے مختلف حلقے بنے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ لوگوں کا ظاہر ان کے باطن جیسا تھا جب کہ کچھ لوگ روپ بدل کر ملتے تھے۔

"یہ شہر رفیقاں ہے دل ذرا سنبھل کے

ملتے ہیں یہاں لوگ بہت روپ بدل کے"

حمایت علی شاعر کی خوبی یہی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات کو دو مصرعوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ وہ لوگوں سے کھائے ہوئے دھوکے سے بہت خوف زدہ ہو چکے تھے اس خیال کو وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

"شاعر ایسی چوٹ کھائی ہے بہ فیض دوستاں

دوستی کے نام ہی سے اب لرز جاتا ہے دل"

حمایت علی شاعر کو اپنے دوستوں سے بہت شکایتیں ہیں ہونی بھی چاہیے کیونکہ شاعر کے ساتھ دوستوں نے کچھ اچھا نہیں کیا تھا۔ قمر جلیل حمایت کے خلاف نوائے وقت میں کالم لکھتے رہے۔ بعد میں قمر جلیل نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا اور معذرت کی مگر شمیم احمد جو ترقی پسند تھے بعد میں مخالفت کرنے لگے۔ انھوں

نے حمایت علی شاعر کی عزت اچھالنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔ انھوں نے بعض الفاظ حمایت کے لیے ایسے کہے کہ مشفق خواجہ کو مجبوراً نوٹ لکھنا پڑا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے دیوان کی طرح شمیم احمد کے مراسلے کچھ الفاظ ایسے ہیں جن کو مجبوراً حذف کرنا پڑا۔ حمایت علی شاعر نے ملک میں مذہبی انتشار کو بھی بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یوں تو ہم پاکستانی ہمیشہ سے ہی فرقہ پرستی کے قائل رہے ہیں مگر ۱۹۸۰ء سے ہماری قوم کا مزاج کچھ زیادہ ہی سخت معلوم ہونے لگا۔ پہلے جنگ علاقوں کی بنیاد پر ہوئی تھی مگر اب مسجد اور امام بارگاہوں کی فضا کو بھی بارود سے معطر کیا جارہا ہے۔ ملک کے حالات کافی سنگین ہو چکے تھے۔ ان دنوں میری ملاقات میرے بچپن کے دوست اطہر رضوی سے ہوئی۔ رضوی میرا بچپن کا دوست اور ہم جماعت تھا۔ وہ کنیڈا میں مقیم تھا اور بہت اچھے شعر کہا کرتا تھا۔ وہ طرحی مصرعے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اطہر رضوی نے ۱۹۸۱ء میں امریکہ میں پہلی بار مشاعرہ کروایا تھا۔ یہ مشاعرہ صرف پاکستانی اور ہندوستانی شعرا پر مشتمل تھا۔ شاعر کہتے ہیں کہ میں جب امریکہ میں گیا تو وہاں جا کر مجھے میرا ملک بہت زیادہ یاد آتا رہا۔ وہاں مجھے بہت اچھے دوستوں کا ساتھ رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک دکن ریڈیو اور آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے اور ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۲ء تک ریڈیو پاکستان کراچی میں اپنی صدائیں بلند کرتا رہا۔ ایک دفعہ کنیڈا میں مجھے دل کا دورہ آگیا۔ میری حالت خراب تھی لوگوں نے انجو گرافی کا مشورہ دیا تو میں زیادہ پریشان ہو گیا کہ اتنے زیادہ پیسے کہاں سے لاؤں گا۔ خیر کنیڈا میں ایک ہندوستانی ماہر قلب ڈاکٹر عبد العلی نے میرا علاج ہرمن ہسپتال میں کیا۔ کنیڈا میں میرے دوستوں نے میرے علاج پر بہت زیادہ پیسہ خرچ کیا۔ یہ لوگ میرے لیے کسی مسیحا سے کم نہیں ہیں۔ حمایت علی شاعر کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اکثر مقامات پر قافیے کو غزل کے اصولوں کا پابند نہیں رکھا۔ کہیں صرف آہنگ کو ملحوظ رکھا اور کہیں رعایتوں سے بھی استفادہ کیا۔ حمایت علی شاعر ایک دفعہ لندن جاتے ہیں تو اس شہر کا بہت گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ یہ شہر تمام شہروں سے اعلیٰ مقام رکھتا ہے کیونکہ اس شہر میں اپنے وقت کے ممتاز قلم کاروں نے دورے کیے جن میں سرسید احمد خان، علامہ اقبال، ٹیگورہ کارل ماکس کے نام سرفہرست ہیں۔ لندن میں شاعر نے مختلف دوستوں سے ملاقات کا ایک طویل سلسلہ جاری رکھا۔ دوستوں سے اردو کے متعلق مختلف ناموں کے وجہ جاننے کی کوشش کی جاتی رہی۔ اس آپ بیتی کا مطالعہ کرنے کے بعد میرے خیال میں اردو کا ایسا کوئی گوشہ باقی نہیں بچتا جس کو " آئینہ در آئینہ " میں شامل نہ کیا گیا ہو۔ ایسا کوئی قلم کار نہیں جو ادب میں اعلیٰ مقام رکھتا ہو تو اس کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ آئینہ در آئینہ میں پورے اردو ادب کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ ایک کامیاب منظوم آپ بیتی ہے جو حمایت علی شاعر کے قلم سے لکھی گئی ہے ویسے میں انڈیا کئی بار جا چکا تھا۔ اتفاق

ایسا تھا کہ انڈیا جانے کے باوجود میں عرصہ پینتس (۳۵) سال تک دکن نہ جا سکا۔ اب جب کہ میرا جانا دکن ہوا تو مجھے سب کچھ نیا نیا لگ رہا تھا کیونکہ ۳۵ سال کا عرصہ کوئی تھوڑا عرصہ نہیں ہوتا۔ مجھے وہاں ایک مشاعرے میں مدعو کیا گیا۔ یہ مشاعرہ اردو ٹرسٹ کا پہلا سالانہ انڈو پاک مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرے میں تقریباً پورے ہندوستان کے شاعر تشریف لائے ہوئے تھے۔ میں وہاں اپنے دوست عابد علی کا مہمان تھا۔ عابد علی روزنامہ سیاست کے مالک تھے۔ وہاں میری نظر میں ہر چیز تھی مگر میرے بزرگ نہیں تھے جن کے سائے میں نے اپنی زندگی گزاری تھی۔ میں جب یہاں رہتا تھا تو جو بچے تھے اب بڑے ہو چکے تھے۔ ان سب کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ مجھے ہر چیز نظر آ رہی تھی مگر میرا شاندار ماضی اور اس کی نشانیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ہمارے دور میں گولکنڈہ بہت مشہور تھا اب وہ صورت حال نہیں ہے۔ اس وقت شہر کے بیچ سے موسیٰ ندی بہتی تھی اب اس ندی کی طغیانی میں بھی وہ بات نہیں رہی تھی۔ حیدر آباد کا ایک مشہور بازار جو چور بازار کے نام سے مشہور تھا اس کا بھی ذکر ہے۔ اس کے علاوہ سالار جنگ میوزیم، کتب خانہ آصفیہ، جامعہ عثمانیہ ہر چیز کو حمایت علی شاعر نے منظوم انداز میں بیان کر کے قاری کی دلچسپی بڑھادی ہے۔ حمایت علی شاعر نے بتایا ہے کہ دکن ایک ایسی سر زمین ہے جہاں تمام فرقوں اور مذاہب کے لوگ رہتے تھے مگر ان کی محبت مثالی تھی۔ دکن کا معاشرہ مذہبی رواداری کا بہترین نمونہ ہے۔ دکن اورنگ آباد کے ایک محلے مغل پورہ میں میری شادی ۱۹۴۹ء میں ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۴۹ء کی ۱۴ فروری کی تاریخ تھی جس کو لوگ پوری دنیا میں محبت کرنے والوں کے نام سے جانتے ہیں۔ میں جب وہاں گیا تو مجھے میرے عزیز دوست قیسی، مغنی، تبسم، انوار، شاذ، تمکنت، خسرو سعادت، شفیق فاطمہ، رضیہ اکبر سمیت اور بہت سے اور پرانے شاعر ملے۔ یہ لوگ محقق اور نقاد بھی تھے جن کی وجہ سے حیدر آباد، آباد تھا۔ ان لوگوں نے مشاعرہ کیا اور ایسا مشاعرہ ہوا کہ زندگی بھر یاد رہے گا۔ اس مشاعرے میں شعرا نے ایسا کلام پڑھا کہ رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔

"زبان پہ بار خدا یہ کس کا نام آیا
یہ کس زمیں پہ کھڑا ہوں، یہ کیا مقام آیا
یہ شہر جس کو سب اورنگ آباد کہتے ہیں
یہاں پہ صدیوں سے میرے بزرگ رہتے تھے"[۸۶]

* * *

”وہی ایک ساعت نایاب، زیست کا حاصل
کہ میں نے دیکھے تھے اک رات دومہِ کامل
فلک کے چاند کا شاید زمین پہ عکس تھا وہ
کہ چاندنی کا تھا پیکر، عجیب شخص تھا وہ“[۸۷]

***

”دیار پاک میں تھا ان دنو ضیا کا راج
خدا کے نام پہ تھا ایک " نا خدا" کا راج
وہ نا خدا جسے طوفان کی خبر ہی نہ تھی
سوائے اپنے کسی اور پر نظر ہی نہ تھی“[۸۸]

***

”مشاعروں کے سبب میں کہاں کہاں نہ گیا
جہاں نہیں تھے میرے ہم زبان، وہاں نہ گیا
میں کینیا بھی گیا اور بو ٹسوانا بھی
وہاں کے بارے میں لکھا تھا اک فسانہ بھی“[۸۹]

***

”اس مہینے مجھے اوسلو بھی جانا تھا
کہ ہم زبانوں کا اب وہ بھی اک ٹھکانہ تھا
وہ لوگ سہتے رہے جو حکومتی بیداد
وہ ناروے و سوئیڈن میں ہو گے آباد“[۹۰]

***

”ضیا کے ساتھ ہوا ہے جو سبھی کو ہے معلوم
کوئی تھا دنگ، کوئی خوش، کوئی مضموم
ازل سے ہے یہ مکافات کا عمل جاری
عمل سے ہوتا[۹۱] ہے ردِ عمل بہت بھاری“

حمایت علی شاعر نے اپنی تحریر کو مزید اچھا بنانے کے لیے دیگر شعرا کے کلام کے مصرعوں کو بھی شامل کیا ہے جیسا کہ اس آپ بیتی کی قسط نمبر چھیالیس میں غالب کا مصرع شامل کیا ہے:

؎ "زبانِ یارِ پہ خدا یہ کس کا نام آیا ہے"

اس قسط میں حمایت علی شاعر نے پھر سے اورنگ آباد کا ذکر کیا ہے کہ یہ شہر وہ شہر ہے جس میں میرے آباؤ اجداد نے زندگیاں گزاری ہیں۔ اس لیے یہ شہر میرے خواب و خیال کا درپن ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس میں میری جوانی گزری ہے۔ اس شہر سے میری بہت ساری یادیں وابستہ ہیں۔ اس شہر میں میرے والدین مدفن ہیں۔ یہ وہ شہر ہے جہاں میرے بہن بھائی رہتے ہیں۔ اس لیے اس شہر میں آتے ہی مجھ پہ طلسم طاری ہو گیا۔ جب پینتیس سال کے بعد میں اس شہر میں گیا تو میرے دوستوں اور رشتہ داروں نے مجھے بہت زیادہ محبت دی۔ ان دوستوں میں سکھ، ہندو، مسلمان سب شامل تھے۔ اورنگ آباد کی مٹی کی خوشبو بھی میرا جسم جذب کر رہا تھا۔ اورنگ آباد میں ایک اخبار روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز نے میرے نام کا حمایت علی شاعر نمبر ۶ جون ۱۹۸۵ء کو نکالا جس میں میری زندگی کے تقریباً تمام حادثات کا ذکر ملتا ہے۔ اورنگ آباد ٹائمز کے مدیر ڈاکٹر معین شاکر تھے۔ اس خاص نمبر میں میرے بزرگ دوستوں نے بہت اچھے اچھے مضامین قلم بند کر میری حوصلہ افزائی کی۔ ان میں اختر الزمان، عزیز خسرو، ارتکاز، حسنین، ریحانہ افتخار، شکیل وہاشم، یوسف رائیس، جاوید وغیرہ اپنے عہد کے اچھے لکھاری تھے۔ دکن میں ان لوگوں نے اردو ادب کی بہت خدمت کی ہے۔ اس لیے میں دکن میں اورنگ آباد کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ حمایت علی شاعر نے سیدھے سادے الفاظ میں اپنی محبوبہ کے دیدار کے منظر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک رات دو چاند میری دہلیز پہ اتر آئے تھے یعنی ایک چاند جو آسمان پر تھا اور دوسرا چاند اپنا محبوب جس کو وہ اصل چاند سے تشبیہ دے رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اندھیرے میں بیٹھا اس چاند کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ میرا یہ عالم تھا کہ جیسے میں ہواؤں میں سفر کر رہا ہوں۔ میں ہمیشہ معراج کو پانے کی دعائیں کرتا رہتا تھا تو آخر کار مجھ پر خدا نے رحم کر ہی لیا۔

"تو پھر خدا ہی کو کچھ رحم آ گیا مجھ پر
اور اس کا سایہ رحمت سا چھا گیا مجھ پر
اسے بنا دیا میرے لیے میرے رَب نے
مجھ کو چن لیا اس کے لیے وہاں سب نے"

حیدر آباد کا معاشرہ تہذیب کا خاص آئینہ دار تھا۔ وہاں کسی کو پسند کرنا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے میں بہت خوف زدہ تھا کہ اگر کسی کو میرے اور معراج کے بارے میں پتہ چل گیا تو لوگ مجھے آوارہ نہ کہنا شروع کر دیں۔ میں مجنوں کی طرح معراج کے عشق میں محو تھا۔ اس وقت میری شاعری بھی عروج پہ تھی جو میں نے خاص اپنی محبوبہ کے لیے کی تھی۔ میرے والدین اس زمانے میں ہمیشہ میرے لیے دعائیں کیا کرتے تھے۔ میں جوانی گزار چکا تھا مگر میری ماں مجھے اب بھی کم سن بچوں کی طرح پیار کرتی تھی۔ میں جب بھی ہندوستان جاتا بمبئی، کلکتہ، دہلی، لکھنو، حیدر آباد تمام شہروں میں جا کر اپنے ادیب دوستوں سے مل کر آتا تھا کچھ تو اللہ کو پیارے ہو چکے تھے جبکہ کچھ ابھی باقی تھے جو اپنی زندگی کا خاصہ حصہ گزار چکے تھے مگر سب بہت پیار کرنے والے تھے۔ حمایت علی شاعر نے جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ " آئینہ در آئینہ " میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں اس وقت ایک ایسے ناخدا کا راج تھا جس کی کشتی اکثر طوفانوں کے گھراؤ میں رہتی تھی مگر کشتی کے مالک جناب ضیا الحق کو اس چیز کی کوئی خبر نہیں تھی۔ جناب ملک میں صرف تین ماہ کے لیے تشریف لائے تھے مگر یہ تین سال گیارہ ماہ کا عرصہ گزار کے ختم۔ میں جب سوچتا ہوں تو تاریخ کے تمام اوراق میرے سامنے عکس بن کر چھا جاتے ہیں۔ جب ملک ضیا الحق کے ہاتھوں میں تھا تو اس دوران مجھے عرب ممالک میں جانے کا موقع ملا۔ میں نے عرب میں رہنے والوں کو بہت قریب سے دیکھا۔ جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی عمارتوں میں عریاں جسم دیکھ کر بہت عجیب لگ رہا تھا۔ یہ سارے منظر میری گہنگار آنکھوں نے خود دیکھے تھے۔ وہ اس ساری صورت حال کو کچھ یوں بیان
کرتے ہیں:

"خدا کے گھر سے بھی اونچا تھا بادشاہ کا محل
اور اس کے پاس تھے کعبے سے بھی بڑے ہوٹل"

ہر طرف سیاست کر کے لوگوں کا خون چوسا جا رہا تھا۔ اپنی سیاست کو مضبوط بنانے کے لیے سیاست میں بھی اسلام کو داخل کیا گیا تھا۔ پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ مجلس اقوام (UNO) میں قرآن کی تلاوت کی گئی تھی۔ اس دور میں لوگوں نے بنکوں میں اکاؤنٹ کھلوا کر فقہ جعفریہ کے حلف نامہ داخل کر کے زکوٰۃ سے خود کو بچا لیا تھا۔ ہر طرف قرآن اور اسلام کا کھلواڑ کیا جا رہا تھا۔ مال و دولت کے لالچ میں لوگ دائرہ اسلام سے خارج ہو رہے تھے۔ حمایت علی شاعر کو نبی کریم ﷺ سے بہت زیادہ عقیدت تھی اس لیے اس نظم کے اندر ایک

نعتیہ نظم بعنوان محاسبہ بھی پیش کی ہے۔ اس نعت کے میں حمایت علی شاعر نے من کجاتو کجا کی تمام حقیقتوں کو بیان کیاہے۔ اس نعت کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے۔

"نہ میں نے سوچا کہ قرآن کا مدعا کیا ہے

عروج آدم خاکی کی انتہا کیا ہے"

ہر امتی کا دین اسلام پر پوری طرح عمل نہ کرنا لمحہ فکریہ ہے اس لیے ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"کہا گیا ہے قرآن میں جسے بندہ مومن

وہ میں تو کیا میرا کوئی ہم وطن بھی نہیں"

ایک شاعر کی خوبی یہی ہے کہ وہ ہر جگہ کا سفر کرلیتا ہے۔ اس لیے مجھے بھی جگہ جگہ کا سفر نصیب ہوا۔ جہاں بھی میرے ہم زبان تھے میں ان جگہوں پر جاتا رہا۔ اگست ۱۹۸۷ء میں، میں اور میرے دوست راغب مراد آبادی جنوبی افریقہ اور دوسرے ممالک میں تین چار مہینے مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ ہمارا جانا افریقہ کے ایسے ایسے ممالک میں ہوا جہاں برسوں انگریزوں نے حکمرانی کی تھی۔ ہم نے ان ممالک کے تمام تاریخی مقامات کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ جوہانسبرگ اور دوسرے مقامات پر ہم نے سونے کی کانوں میں اتر کر دیکھا ہے۔ ہم نے دنیا کے سب سے بڑے سفاری پارک کا دورہ بھی ہم نے کیا۔ ہم نے بہت سے مقامات دیکھے۔ ایلورہ جیسے غار جن میں قدیم تاریخ کی نشانیاں ہیں کو بھی دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ دیگر مقامات بھی ہیں جن کو دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ ہم نے افریقہ کی تہذیب کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں بڑی آبادی آج بھی جنگلوں میں رہنا پسند کرتی ہے۔ ہماری ملاقات علم و ادب کے حوالے سے مشہور لوگوں سے ہوئی ہے جن میں پروفیسر حبیب الحق ندوی، پروفیسر سلیمان ندوی، ڈاکٹر مہاتے، عبدالمطلب وغیرہ شامل ہیں۔ کیپ ٹاؤن میں بھی ہمارا جانا ہوا یہ وہ مقام ہے جہاں سے آگے انٹار کٹیکا شروع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی افریقہ کے صدر مقام پری ٹوریا میں بھی جانا ہوا۔ ہر ایک شہر میں میرے دوست احباب مجھے مل ہی جاتے تھے۔ ان لوگوں میں صفی، قیس، گلزار، گل، شباب، راغب وغیرہ تھے۔ یہ سارے لوگ افریقہ میں مقیم ہیں لیکن اردو کے شاعر اور ادیب ہیں۔ وہاں ایک سیاہ فام لڑکی میری شاگرد بن گئی جس کی ماں انڈین تھی جبکہ باپ افریقن تھا۔ اسے شلوار قیص بہت پسند تھی۔ وہ افریقن اور اردو دونوں زبانیں جانتی تھی۔ مگر میرے ساتھ کچھ زیادہ ہی اس کی دلچسپی ہوگئی تھی۔ ڈربن یونیورسٹی ویسٹ وھائل میں میرا ایک لیکچر تھا۔ یہ لیکچر ۱۹۸۷ء کو غالب کی یادیں سمپوزیم تھا میں لیکچر کا عنوان تھا۔

## اردو غزل غالب سے فیض تک:

حمایت علی شاعر نے "آئینہ در آئینہ" میں اپنے سفر کو بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ۱۹۸۷ء کو ڈربن یونیورسٹی میں لیکچر کے بعد مجھے اسی مہینے اوسلو جانا پڑا۔ اوسلو ناروے کا صدر مقام ہے۔ یہ مقام بھی میرے لیے کسی نئے تجربے سے کم نہ تھا۔ اوسلو کی آرٹ گیلری اور منچ میوزیم دونوں تعریف کے قابل ہیں۔ اس پارک میں انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کے واقعات کو تصویری شکل میں آویزاں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مرد و عورت کے جذبات و احساسات کو بھی سنگ تراشوں نے بڑی مہارت سے تراش کر رکھا ہے۔ وہاں میری ملاقات ادب کے گوہر نایاب سے ہوئی ہے جن سے مل کر زندگی پھر مسکرا اٹھی تھی ان لوگوں میں ایک صحافی مجاہد علی، انگریزی شاعر ساحر لدھیانوی، احمد فقیہ، جمشید مسرور، افانہ نگار، ہرچن چاؤلہ، علی صدیقی۔ ہم سب لوگ اوسلو میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ میں جب بھی اوسلو جاتا ہوں ہر بار مجاہد علی کا مہمان ہوتا ہوں۔ مجاہد علی میری خدمت میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے تھے۔ حمایت علی شاعر نے وہاں مشاعرے میں شیعہ سنی انتہا پسندی کو خوب نشانہ بنایا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لوگوں کو فرقہ واریت کھا گئی ہے۔ اس انتشار کا فائدہ ہمارے دشمن خوب اٹھا رہے ہیں۔ مگر ہم ہیں کہ فرقہ واریت میں پوری طرح مگن ہیں۔ حمایت علی شاعر کو ہمیشہ اپنے مذہب کی فکر نے پریشان رکھا ہے۔ وہ اتحاد اور قومی یگانگت کے پیرو کار تھے۔ مگر ملکی صورت حال ان کی سوچ کے بالکل برعکس تھی۔ حمایت علی شاعر نے اپنے نوجوان کو مخاطب کر کے ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے۔

"وطن کی فکر کر ناداں۔۔۔"

یہ نظم علامہ اقبال کے ایک شعر کے مصرعے سے شروع ہے۔ مگر بعد میں حمایت علی شاعر نے اس نظم میں اپنے نوجوانوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج بھائی بھائی کا دشمن ہے۔ کسی کی عزت آبرو محفوظ نہیں ہے۔ یہ لمحہ ہمیں سوچنے پہ مجبور کر رہا ہے۔ یہ نظم لکھتے وقت شاعر کی آنکھیں پرنم تھیں اور لب پہ دعا تھی:

دعا

"میرے وطن، میری ہر اک دعا ہے تیرے لیے
میرے خدا سے میری التجا ہے تیری لیے
تجھے وہ غم نہ ملے جو میرے نصیب میں ہے

تیرا وجود میرے خون سے عبارت ہے
میرے قلم کی طرح تو میری امانت ہے
بسا ہوا تو ہر اک شاعر و ادیب میں ہے

یہ ناخدا جو خدا بن کے بفضل خدا
یہ چاہتے ہیں کہ ہو جاؤں میں بھی تجھ سے جدا
مگر وہ عہد وفا جو میری صلیب میں ہے

خدا کرے تُو سلامت رہے قیامت تک
دلوں میں تیری محبت رہے قیامت تک
تیرے لیے یہ دعا ہر دل غریب میں ہے"

حمایت علی شاعر نے اپنے دھیمے لہجے سے اس منظوم آپ بیتی آئینہ در آئینہ کی آخری قسط کو بھی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ حمایت علی شاعر نے ضیا الحق کے حادثے کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۹۸۸ء کو صدر پاکستان کے جہاز کو بم سے اڑا دیا گیا ہے۔ اس دھماکے میں ضیا الحق کی ایک بوٹی بھی نہیں ملی تھی۔ اس حادثے میں ضیا سمیت عملے کے چودہ لوگ لقمہ اجل بنے تھے۔ ضیا الحق کی وفات کے بعد ۱۹۸۸ء میں غلام اسحاق نے بے نظیر بھٹو کو ملک کا وزیر اعظم منتخب کیا۔ پاکستان کے سیاسی حالات ہمیشہ سے مشکلات کے بھنور میں رہے ہیں۔ ۱۹۹۰ء کو غلام اسحاق نے بے نظیر کو وزارت اعظمیٰ کے عہدے سے برطرف کر دیا تھا اور ان کی جگہ غلام مصطفی خان جتوئی نئے وزیر اعظم قرار پائے۔ نومبر ۱۹۹۰ء کو وزیر اعظم کے لیے دوبارہ سکہ اچھالہ گیا تو فیصلہ نواز شریف کے حق میں آیا۔ ۱۹۹۰ء میں نواز شریف وزیر اعظم پاکستان بنے یوں اس آپ بیتی میں پورے پاکستان کی تاریخ شامل ہے۔ جس کو حمایت علی شاعر نے اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے۔ اگر سارے واقع کو بتدریج بیان کیا جائے تو بات طوالت اختیار کر جائے گی۔ لہذا اہم باتوں کو بیان کیا گیا ہے تا کہ تحریر کا حسن مانند نہ پڑے۔ اس منظوم آپ بیتی کا سفر ہندوستان کے شہر اورنگ آباد سے شروع ہوتا ہے۔ اس سفر کی تکمیل تک مختلف ممالک کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آخر کار حمایت شاعر نے ایک طویل سفر کو "یار زندہ صحبت باقی" کَہ کر ختم کیا ہے۔

"آئینہ در آئینہ،، کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد قاری شاعر کی ذاتی پسند و ناپسند سے خوب واقف ہو جاتا ہے۔ "آئینہ در آئینہ "باقی دونوں آپ بیتیوں سے زیادہ ضخیم آپ بیتی ہے۔ اس آپ بیتی میں شاعر نے پورے کمال کے ساتھ واقعات کو اس انداز میں پیش کیا کہ واقعات ایک دوسرے کے ساتھ بوط ہیں۔ اس آپ بیتی کی تیاری میں شاعر نے بڑے سیدھے سادے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ چھوٹی بحر میں اشعار ترتیب دے کر بڑا پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ شاعری کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ایک چیز جو سامنے آتی

ہے وہ یہ کہ شروع ہی سے شاعر نے علمِ بیان و بدیع کا سہارا لے کر اپنے اپنے کلام میں چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ ہر ادیب نے قواعد کے اصولوں کو بھی استعمال کیا ہے تاکہ ان کا کلام بہتر نظر آئے۔اسی اصول کو حمایت علی شاعر نے بھی اپنی آپ بیتی میں استعمال کیا ہے۔"آئینہ در آئینہ،، میں داخلیت اور خارجیت دونوں طرح کے عناصر ملتے ہیں۔ کہیں کہیں شاعر نے مناظر فطرت کو بڑی باریک بینی سے بیان کیا تو کہیں کہیں ہجرت، قحط، غربت، غریب الوطنی جیسے واقعات کو بیان کیا۔یہ آپ بیتی واقعات کے حوالے سے بڑی دل چسپ ہے مگر اس کی ضخامت بہت زیادہ ہے جو اس کی خامی سمجھی جاتی ہے۔یہ آپ بیتی تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔اتنی بڑی آپ بیتی پڑھنے کے لیے قاری کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا مگر اس کے باوجود بھی"آئینہ در آئینہ میں شاعر نے تلمیحات، مرکبات، دوسری زبانوں کے الفاظ اور دیگر شعرا کے اشعار کو داخل کر کے اس آپ بیتی کے حسن کو چار چاند لگانے کی کوشش کی ہے۔شاعر بات سے بات نکالنے کا فن خوب جانتے ہیں۔وہ ایک واقعے کو بیان کرنے سے پہلے لکھتے ہیں:

"آرہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں ہیں تھوڑے بھائی زیادہ،،

حمایت علی شاعر نے"آئینہ در آئینہ،، کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف شعرا کے اشعار بھی درج کیے۔وہ ایک جگہ فیض احمد فیض کا ایک شعر لکھتے ہیں اور بات آگے بڑھاتے ہیں

"یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں،،

اس آپ بیتی کے میں اور بھی شعرا کے اشعار اور مصرعوں کا داخل کیا گیا تاکہ واقعات ایک دوسرے مربوط رہیں۔یہاں اقبال کا ایک شعر بیان کرتے ہیں۔

" روز حساب جب میرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرم سار ہو مجھ کو بھی شرم سار کر،،

یہاں ایک مصرع غالب کا بھی نظر آتا ہے۔

"میری تعمیر میں مضمر ہے صورت خرابی کی،،

فارسی کے الفاظ اور تراکیب کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔

" اگر پدر نا تواند، پسر تمام تمام کند،،

”آئینہ در آئینہ “میں شاعر نے نبی کریم ﷺ سے اظہار عقیدت کرتے ہوئے نعت کے چند اشعار بھی لکھے۔

حضور آپ کی امت کا ایک فرد ہوں میں
مگر اپنی نگاہوں میں آج گرد ہوں میں

”آئینہ در آئینہ “میں شاعر نے ماضی میں جھانک کر تاریخ کے گوشوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔اس آپ بیتی میں بہتر تخیل برتا گیا ہے۔ کہیں کہیں طنز و مزاح کا استعمال بھی ضرورت کے مطابق کیا گیا۔ اس آپ بیتی میں شاعر نے تحلیل نفسی اور احتسابِ ذات کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ آپ بیتی تہذیبی و ثقافتی روداد کی صورت میں اپنی حقیقت کا اثبات کرتی ہے اور قاری کے فکر و خیال کو مہمیز کرتی ہے۔ ”آئینہ در آئینہ“ خوبصورت اسلوب کی خاص آئینہ دار ہے۔ اس نظم میں شاعر کے تخیل کی جولانیاں، الفاظ کی ترنگ اور اعلیٰ لہجہ پڑھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اس آپ بیتی کے وسیلہ سے شاعر نے اُردو زبان کی کلاسیکی شاعری اور سوانح نگاری کی اقدار و روایات کی اساس پر ایک بہترین محلِ شاعری تعمیر کیا ہے۔ ”آئینہ در آئینہ “میں شاعر نے تاریخ کا جو عکس پیش کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ کہیں کہیں شاعر نے واقعات کو بیان کرنے کے لیے صیغہ جمع متکلم کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں حمایت علی شاعر اپنے معیار و مرتبے کے کہیں بھی غافل نظر نہیں آتے۔ اس نظم میں واقعات کو جمالیاتی حسن دے کر بیان کیا ہے۔ ”آئینہ در آئینہ“ بحرِ مجتث مثمن مخبون محذوف مسکن ہے۔ مثال کے طور پر اس آپ بیتی کے ایک شعر کی تقطیع ملاحظہ کیجئے:

| یہ شہ رجس | کسبورگ | گباد کہ | تے ہیں |
|---|---|---|---|
| مفاعلن | مفلاتن | مفاعلن | فعلن |
| یہاں پہ صدیوں | سے میر | بزرگ | رہتے ہیں |
| مفاعلن | مفلاتن | مفاعلن | فعلن |

”آئینہ در آئینہ “ایک مسلسل نظم نہیں ہے بلکہ اس میں موقعے کی مناسبت سے واقعات کو شامل کیا گیا ہے۔ شاعر نے اس نظم کو کامیاب بنانے کے لیے عربی، ہندی، فارسی، انگریزی، سنسکرت زبانوں کے الفاظ بھی شامل کیے ہیں۔ یہ ایک طویل نظم اکاون اقساط میں بیان کی گئی ہے اس میں شاعر کی پوری زندگی آیئنے کی طرح قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ "آیئنہ در آیئنہ،، کا آخری واقعہ جنزل ضیا الحق کا حادثہ ہے جس کو بیان کرنے کے بعد حمایت علی شاعر نے "یار زندہ صحبت باقی،، کہ کر اپنی زندگی کی طویل کہانی کا اختتام کیا۔

## حوالہ جات


۱۔ فیروز اللغات، مولوی فیروز الدین، فیروز سنز، لاہور، راولپنڈی، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص، ۱۲۶۵

۲۔ اردو کی شعری اصناف، اکرم خواجہ، ڈاکٹر، سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص، ۹۷

۳۔ فیروز اللغات، مولوی فیروز الدین، فیروز سنز، لاہور، راولپنڈی، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص، ۱۵۲۸

۴۔ اردو کی شعری اصناف، اکرم خواجہ، ڈاکٹر، سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص، ۵۲

۵۔ ایضاً، ص، ۵۳

۶۔ مقدم شعر و شاعری، الطاف حسین حالی، ص، ۲۷۵

۷۔ شعر العجم، جلد، چہارم، ۲۰۰۴، ص، ۳، ۲، ۲۰۰۱ء،

۸۔ آئینہ در آئینہ (منظوم خود نوشت سوانح حیات) حمایت علی شاعر دنیائے ادب، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص، ۱۷

۹۔ ایضاً، ص، ۱۸

۱۰۔ ایضاً، ص، ۲۰

۱۱۔ اردو فتوی شمالی ہند میں، ص، ۸۱، ۸۰

۱۲۔ رسالہ نگار، اصناف سخن، نمبر، ص، ۷۷

۱۳۔ اردو مثنوی کا ارتقا، ص، ۱۲

۱۴۔ مقدم شعر و شاعری، الطاف حسین حالی، ص، ۱۶۶

۱۵۔ "شعر الہند" عبد السلام ندوی، ص، ۳۷۷

۱۶۔ اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ص، ۲۰۳

۱۷۔ شعر العجم، جلد، چہارم، مولانا شبلی نعمانی، ص، ۲۳۰

۱۸۔ سحر البیان، مولوی میر حسن، ص، ۸۵

۱۹۔ گلزار نسیم، دیا شنکر نسیم، ص، ۹۷

۲۰۔ حمایت علی شاعر، دنیائے ادب، کراچی، ۲۰۰۱، ص، ۳۰۷

۲۱۔ ایضاً، ص، ۳۰۵

۲۲۔ اردو کی مشہور مثنویاں، مضمون اصناف سخن نمبر، نگار، جنوری، فروری، ۱۹۵۷، ص، ۶۲

۲۳۔ تہذیب الاخلاق، سر سید احمد خان، مضمون، ص، ۷

۲۴۔ ”آئینہ در آئینہ “(منظوم خود نوشت سوانح حیات)، حمایت علی شاعر، دنیائے ادب، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص،۲۲

۲۵۔ مقدم شعر و شاعری، الطاف حسین حالی، ص،۱۹۷

۲۶۔ شعر العجم، جلد، چہارم، مولانا شبلی نعمانی، ص،۲۱۰

۲۷۔ ایضاً، ص،۱۴، ۲۱۳

۲۸۔ مقدم شعر و شاعری، الطاف حسین حالی، ص،۲۰۰

۲۹۔ ایضاً، ص،۹۵، ۹۴

۳۰۔ فیروز اللغات، مولوی فیروز الدین، فیروز سنز، لاہور، راولپنڈی، کراچی،۲۰۰۵ء، ص،۹۷

۳۱۔ اردو میں اسلوب اور اسلوبیات کی مباحث منتخب تنقیدی مقالات، قاسم یعقوب، سٹی پوائنٹ کراچی،۲۰۰۷ء، ص،۱۸۲

۳۲۔ نثار احمد فاروقی، اسلوب کیا ہے؟ مشمولہ، ”اسالیب نثر پر ایک نقطہ نظر“، ص،۱۱

۳۳۔ ایضاً، ص،۲۸

۳۴۔ "اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر وروایت "(منتخب مقالات) سیدہ محسنہ نقوی، پروفیسر، ڈاکٹر راولپنڈی، ۲۰۰۵ء، ص،۹۹

۳۵۔ ایضاً، ص،۹۹

۳۶۔ جان اسنپسر، تعارف، Linguistics and style مرتبہ نلز ایرک انکوسٹ اور دیگر لندن، آکسفورڈ، یونیورسٹی، پریس، ۱۹۶۴ء، ص،۱۰

۳۷۔ عابد علی عابد، "اسلوب"، علی گڑھ، ایجوکیشن بک ہاؤس،۱۹۷۶ء، ص،۶۲

۳۸۔ جان مڈلٹن "The problem of style" آکسفورڈ، پیپر بکس،۱۹۶۷ء، ص،۴

۳۹۔ روزنامہ، "جنگ" مورخہ ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۱ء،

۴۰۔ ”آئینہ در آئینہ “(منظوم خود نوشت سوانح حیات)، حمایت علی شاعر، دنیائے ادب، کراچی، ۲۰۰۱ء،ء، ص،۱۷

۴۱۔ ایضاً، ص،۲۴

۴۲۔ ایضاً، ص،۲۸

۴۳۔ ایضاً، ص،۳۲

۴۴۔ ایضاً، ص،۳۶

۴۵۔ ایضاً، ص،۴۳

۴۶۔ ایضاً، ص،۹۹

۴۷۔ ایضاً، ص،۵۳

۴۸۔ ایضاً، ص،۵۷

۴۹۔ ایضاً، ص،۶۱

۵۰۔ ایضاً، ص،۶۹

۵۱۔ ایضاً، ص،۷۳

۵۲۔ ایضاً، ص،۷۸

۵۳۔ ایضاً، ص،۸۴

۵۴۔ ایضاً، ص،۹۳

۵۵۔ ایضاً، ص،۹۹

۵۶۔ ایضاً، ص،۱۰۹

۵۷۔ ایضاً، ص،۱۱۳

۵۸۔ ایضاً، ص،۱۱۸

۵۹۔ ایضاً، ص،۱۲۶

۶۰۔ انقلاب اور ادب، اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، ص،۲۵

۶۱۔ روشنائی، سجاد ظہیر، ص،۱۰۲

۶۲۔ "ترقی پسند تحریک اپنے آئینے میں" وحید قریشی، ڈاکٹر، ۱۹۷۰، ص،۳۳

۶۳۔ ایضاً، ص،۱۷۳

۶۴۔ ایضاً، ص،۱۴۷

۶۵۔ ایضاً، ص،۱۵۶

۶۶۔ ایضاً، ص،۱۶۶

۶۷۔ "نسخہ ہائے وفا"، فیض احمد فیض، کارواں پریس لاہور، سن ندارد، ص،۱۹۵

۶۸۔ "آئینہ در آئینہ "(منظوم خود نوشت سوانح حیات) حمایت علی شاعر، کراچی، ۲۰۰۱، ص،۱۴۱

۶۹۔ ایضاً، ص،۱۷۹

۷۰۔ ایضاً، ص،۱۸۵

۷۱۔ ”آئینہ در آئینہ “(منظوم خود نوشت سوانح حیات)، حمایت علی شاعر، دنیائے ادب، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص۱۸۹

۷۲۔ ایضاً، ص،۱۹۵

۷۳۔ ایضاً، ص، ۲۰۲

۷۴۔ ایضاً، ص،۲۰۷

۷۵۔ ایضاً، ص،۲۱۵

۷۶۔ ایضاً، ص، ۲۲۲

۷۷۔ ایضاً، ص، ۲۳۰

۷۸۔ ایضاً، ص،۲۳۷

۷۹۔ ایضاً، ص، ۲۴۴

۸۰۔ ایضاً، ص،۲۵۳

۸۱۔ ایضاً، ص، ۲۶۰

۲۸۔ ایضاً، ص،۲۶۶

۸۳۔ ایضاً، ص، ۲۷۲

۸۴۔ ایضاً، ص، ۲۸۰

۸۵۔ ایضاً، ص،۲۸۷

۸۶۔ ایضاً، ص، ۲۹۴

۸۷۔ ایضاً، ص،۲۹۹

۸۸۔ ایضاً، ص،۳۰۵

۸۹۔ ایضاً، ص، ۳۱۳

۹۰۔ ایضاً، ص، ۳۲۰

۹۱۔ ایضاً، ص، ۳۳۲

## باب چہارم

# "غم زمانہ بھی سہل گزرا" کا ہیئتی و اسلوبی مطالعہ

## الف۔ "غم زمانہ بھی سہل گزرا" کا ہیئتی مطالعہ:

ہئیت، مواد، اسلوب اور معنی کی اصطلاحیں دور قدیم سے موجود ہیں۔ یہ اصطلاحیں زیادہ تر ایک دوسرے کی مخالف سمت میں سفر کرتی ہیں۔ مگر ہئیت اور مواد اسلوب اور معنی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ساری چیزیں مربوط ہوتی ہیں تو کوئی ادبی فن پارہ بنتا ہے۔ ادبی تحریر قاری کے لیے لطف کا سامان مہیا کرتی ہے۔ چاہے وہ نظم کی ہئیت میں ہو یا نثری ہیئت میں۔ ہئیت اور مواد جب ترتیب پاتے ہیں تو شعر و ادب کا کوئی فن پارہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جس کو پڑھ کر ادب کا طالب علم ذہنی سکون پاتا ہے۔ کچھ نقاد ہئیت اور مواد کو الگ الگ زاویے سے دیکھتے ہیں اور نئی راہیں نکالتے ہیں۔ دراصل ہر فن پارے کے اجزاء ترکیبی کا الگ الگ تصور بھی اپنی جگہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ہر فن پارہ مواد کا مرہون منت ہوتا ہے۔ لفظ اور معنی کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے سید عابد علی عابد نے اپنا قیمتی وقت دے کر اردو ادب میں اپنا حصہ ڈالا۔ ہر چیز کی اپنی شکل و صورت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ پہچانی جاتی ہے۔ اس طرح ہر ادبی فن پارہ اپنی مخصوص ہیئت رکھتا ہے۔ مثلاً ہم غزل کو غزل کیوں کہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب بہت آسان ہے کہ ہم مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف اور اشعار کی تعداد سے بڑی آسانی کے ساتھ پتہ لگا سکتے ہیں کہ یہ غزل ہے۔ اسی طرح چاہے نثری ادبی فن پارہ ہو یا منظوم ادبی فن پارہ ہم اس کی ہئیت اس کے بنیادی لوازمات کو دیکھ کر بتا سکتے ہیں۔ کیونکہ ہر ادبی فن پارہ دوسرے ادبی فن پارے سے الگ شناخت رکھتا ہے۔ بالکل ایسے ہی ہماری تحقیق میں شامل ادیب سہیل کی منظوم آپ بیتی بھی اپنی شناخت اپنی ہئیت سے کراتی ہے۔ ادیب سہیل کی منظوم آپ بیتی "غم زمانہ بھی سہل گزرا" آزاد نظم کی ہئیت میں ترتیب دی گئی ہے۔

ہئیت کے لفظی معانی، شکل، صورت، ساخت کے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات کے مطابق ہیئت کے معنی درج ذیل ہیں۔"صورت، شکل، چہرہ، مہرہ، ڈول، ساخت، بناوٹ، دھج، حالت، کیفیت، ڈھنگ، طور، طریق"

ڈاکٹر احسن فاروقی اور پروفیسر نور الحق ہاشمی اپنی ایک مشترکہ کتاب میں فن ہئیت کے حوالے سے اپنا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں۔

"یہ فن زندگی کا نقشہ ایک خاص طریقہ پر اور ایک شکل میں پیش کرتا ہے بغیر کسی مخصوص شکل یا طریقے کے زندگی کا نقشہ کھینچ ہی نہیں سکتا"[1]

انگریزی میں ہیئت کے لیے(Form)کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی میں لفظ (Form) جہاں صنف کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہاں یہ لفظ ہیئت کے لیے بھی مستعمل ہے۔ صنف اور ہیئت کا مسئلہ آج تک حل نہیں ہو سکا ہے۔ صنف اور ہیئت کے خلط ملط سے پیدا شدہ صورتحال کو شمیم احمد یوں بیان کرتے ہیں:

"شعری ہئیتوں کی شناخت کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے اس لیے ان کی شناخت بہت حد تک ظاہری صورت سے متعلق ہوتی ہے۔ لیکن صنف سخن کی شناخت میں تھوڑی پیچیدگی ضرور ہے کیونکہ بعض اصناف کی شناخت ہیتی اصولوں پر منحصر ہے۔ بعض اصناف اپنے موضوع کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں۔ بعض دونوں پر اپنی شناخت کا دار و مدار رکھتی ہیں۔ بعض موضوع و ہیئت دونوں میں سے کسی پر اپنی شناخت کا انحصار نہیں کرتیں۔ بعض ایسی اصناف ہیں جو محض کسی وزن ہی کی وجہ سے اپنی صنفی شناخت قائم رکھتی ہیں"[2]

ہم جب اپنی بات کو یا جذبے کو کسی دوسرے تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کے دو طریقے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک تقریر کا طریقہ ہے جو بول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے جبکہ دوسرا طریقہ تحریر کا ہے۔ تحریر کا طریقہ اپنے اندر ہیئت رکھتا ہے۔ اور ہر ہیئت اپنے اندر ایک صنف رکھتی ہے یہ ساری چیز مل کر کوئی ادبی فن پارہ تخلیق کرتی ہے۔ ہیت قاری اور کتاب کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرتی ہے۔ شمیم احمدFormکے لغوی معنی کو مزید واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"The external appearance of somebody / something. The shape of somebody / something".[3]

اس بحث کو مذید بہتر بنانے کے لیے شمیم احمد (Form) کے معنی کو کچھ اس طرح سے واضح کرتے ہیں۔

"(Form) کسی جسم کی ساخت، مضمون کی حد بندی، نمونہ، لچکدار قسم بنانے کا طریقہ، ترتیب کا طریقہ، باقاعدگی کا نام ہے"[۴]

اردو ادب میں اصناف نظم و نثر کی بے شمار ہیئتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ نثری ہئیتوں کی اگر بات کریں تو یہ ہیتیں اپنی طوالت و اختصار کی بنیادوں پر اپنی ایک مخصوص شناخت رکھتی ہیں۔ جبکہ شعری ہیتیں مخصوص اوزان اور ترتیب کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں۔ سید شاید حسین ہیئت کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

"ایک ایسی اصطلاح جو کسی کام میں عناصر کی تنظیم اور اس کے مکمل اثرات کو ظاہر کرے۔ یہ ایک متعین سوچ ہوتی ہے جس میں ادب تشکیل پاتا ہے۔ شعری شکل سے مراد ایک لائن میں پوانٹس کی ایک خاص ترتیب ہے۔ شکل، ترتیب، بناوٹ یا تنظیم کو بیان کرتی ہے۔ جو مواد کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جب ہم ادبی کام کی شکل کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ہم اس کی شکل اور بناوٹ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ یا جس طریقے سے یہ بنائے جاتے ہیں، کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ ہیئت اور مواد کو الگ نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کا الگ الگ تجزیہ اور مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔"[۵]

ہیت کے حوالے سے ٹی ایس ایلیٹ کا نام بھی اہم ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ کے تین تنقیدی نظریات جدید ہیت کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ شاعری کے غیر شخصی ہونے کے تصور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شاعری کسی شخصیت کی عکاس نہیں ہے بلکہ شاعری شخصیت سے گریز کا نام ہے۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ شاعر کا کلام شاعر کا اصل اثاثہ ہے۔ جو شاعر جس طرح کا کلام لکھے گا وہ اسی طرح پہچانا جائے گا۔ وہ شعری سانچے ہیت کی شکل میں ڈھل کر ہی اپنی حثیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہر شعری اصناف کے کچھ اصول و ضوابط پہلے سے طے شدہ ہیں۔ اس حوالے سے ٹی ایس ایلیٹ کے دو اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔

"The poet has not a personality to express; but a particular medium which is only a medium and not a personality in which impression and experiences combine in peculiar and unexpected ward. IMpression and experiences which are important

for the how many those which become important in poetry in the man may play quite a megligible part in the man, the personality" [۶]

ٹی ایس ایلیٹ کا دوسرا اقتباس نظم کی آزاد زندگی اور اس کے الگ قوانین کے متعلق ہے۔

"We can only  say that a poem in some sense, has its own lines that its part from quality lifterent from a body of beauty Ordered bio raphical data. That the felling or emotions or vision resulting from the poem is some thing different from the felling or  emotions or vision the mind of two poet." [۷]

نظم کی مقررہ ہئیت اور آزاد زندگی کے کچھ ضوابطے ہوتے ہیں جن کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ بھی اس چیز سے اتفاق کرتا ہے کہ شاعر اپنے جذبات کا اظہار چاہتا ہے۔ اور وہ اظہار تحریر کا لباس اوڑھ کر کسی نہ کسی ہئیت کے قالب میں ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ اپنے تیسرے نظریے میں شاعری کی تین آوازوں کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ شاعری کی تین آوازیں ہوتی ہیں۔ ان میں پہلی آواز خود کلامی ہے جس میں شاعر خود سے سوال کر کے ان کے جواب تلاش کرتا ہے۔ دوسری آواز کو مکالمہ کہتے ہیں۔ جس میں شاعر دوسروں سے محو گفتگو نظر آتا ہے۔ تیسری آواز وہ ہے جس میں نہ خود کلامی ہے اور نہ خطابت بلکہ زندگی کے اصل رنگ کو بیان کیا جاتا ہے۔ قانون قدرت ہے کہ ہر شے مقررہ وقت کے بعد تبدیلی چاہتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جب کسی فن پارے کو دیکھیں تو وقت کے ساتھ ساتھ اس فن پارے میں بھی ہیئتی تبدیلی آتی رہتی ہے اور نئے نئے اصول و ضوابط بھی اردو ادب کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔ جب کسی فن پارے میں کوئی نئی بات شامل کریں گے تو وہ نئی چیز اس فن پارے کی پوری ہئیت کو بدل کر رکھ دے گی۔ کیونکہ ہیئت کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ یہ لچکدار ہوتی ہے اور ضرورت پڑنے پر اس میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ جب کوئی چیز نئی متعارف کی جاتی ہے تو وہ معاشرہ اس کو قبول کرنے سے عاری ہوتا ہے۔ اس چیز کی مقبولیت وقت گزرنے کے بعد ہوگی اور پھر لوگ اس کو آہستہ آہستہ قبول کرنا شروع کر دیں گے۔ اظہار کا طریقہ بھی نئی ہئیتوں کا متقاضی ہے۔ کسی خیال کو جب ایک اچھے

پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے تو قاری جب اس کا مطالعہ گہرائی سے کرتا ہے تو اس تحریر میں وہ عصر حاضر کے نقوش تلاش کرنا شروع ہو جاتا ہے تب جا کر وہ اس نئی ہئیت کو قبول کرتا ہے۔ ہئیتوں کی تبدیلی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب کسی غیر زبان میں شعری ہئیتوں میں تبدیلی آنا شروع ہو جاتی ہے تو پھر کسی دوسری زبان والے بھی اثر قبول کرتے ہیں۔ اور اپنی زبان میں لکھے ہوئے شعری فن پاروں کو اس نقطہ نظر سے دیکھنا شروع کرتے اور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہ ن۔ م راشد وہ پہلا شاعر مانا جاتا ہے جس نے پابند نظم کے طلسم کو توڑا تھا اور آزاد نظم کا پہلا تجربہ کر کے نئے لکھنے والوں کو ایک نیا راستہ دکھایا تھا۔ پھر اس کام کو مزید مضبوط کرنے کے لیے میرا جی، تصدق حسین خالد، فیض اور فراز جیسے شاعر بھی میدان میں اترتے ہیں ۔ دراصل ن۔ م۔ راشد نے غیر زبان میں لکھی ہوئی آزاد نظموں کا مطالعہ کیا اور اس ترتیب کو اردو ادب میں بطور تجربہ پیش کیا جو بعد میں زور پکڑ تا گیا۔ آزاد نظم کو لکھنے والوں کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا اور آج آزاد نظم لکھنے والوں کی ایک چین بنی ہوئی ہے جو آئے دن کوئی نیا فن پارہ تخلیق کر کے قاری کے لیے لطف کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ایک ایسا واقع ہے جس نے جہاں بہت کچھ نقصان کیا وہاں اردو ادب کو بہت کچھ تحفے کے طور پر بھی دیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد انگریز پوری طرح سے ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے۔ جب انگریز یہاں آئے تو انھوں نے اپنا انگریزی لٹریچر بھی ساتھ لایا تھا۔ جس کی وجہ سے انگریزی زبان و ادب کے اثرات کو مقامی زبانوں نے بڑی حد تک قبول کر لیا تھا۔ انگریزی ادب کی ہئیتوں کا بھی بڑی حد تک مقامی فن پاروں پر اثر پڑا ہے جس طرح زبان کسی غیر زبان کے اثرات کو قبول کرتی ہے۔ سید احتشام حسین ہئیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ہئیت اپنے وسیع مفہوم میں ایک طرف تو وہ طریقہ اظہار ہے ہے جو فن کار استعمال کرتا ہے اور دوسری طرف جذبات سے بھرا ہوا وہ پر اثر اور کسی حد تک مانوس انداز بیان ہے جو شاعر اور سامع کے درمیان رابطہ اور رشتہ کا کام دیتا ہے۔ اس میں زبان، زبان کی آرائش، اثر اندازی کے تمام طریقے، مواد کے تمام سانچے، فن اور مطابقت پیدا کرنے کے تمام ذریعے اور ان سب سے بڑھ کر مواد کے ساتھ ایک مکمل فنی نمونہ پیش کرنا سبھی کچھ شامل ہے''[۸]

سید احتشام کی اس رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہئیت قاری اور فن پارے کے درمیان مضبوط رشتے کا دوسرا نام ہے۔ جب کوئی قاری کسی فن پارے کو پڑھنا شروع کرتا ہے تو فن پارہ لازماً کسی ہئیت میں ہو گا۔ کسی

ادبی فن پارے کی ہئیت اس ادبی فن پارے کی ادبی پہچان ہوا کرتی ہے۔ جب کوئی فن کار اپنے ذہن میں کسی چیز کا نقشہ بناتا ہے۔ اس نقشے کو کاغذ پر اتار کر اس کی کوئی مخصوص ہیئت ترتیب دیتا ہے۔ مطلب کہ فن کار اپنے ذہن میں بکھرے خیالات کو جمع کرتا ہے اور پھر ان خیالات و جذبات کا تحریری اظہار کرتا ہے تب جا کر کوئی مخصوص ہیئت ہمارے سامنے آتی ہے۔ چاہے اس ہیئت کا تعلق منظوم شکل میں ہو یا نثری شکل میں۔ فن پارے کی ہیت کو ترتیب دینے کے لیے فنکار کا تجربہ کار ہونا ضروری امر ہے۔ فنکار کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے لوکس کہتا ہے:

> "فن کار کی شخصیت اتنی ہی اہم ہے کہ جہاں فنکار جذبے سے بالکل کٹ کر کچھ قانونی قسم کے فیصلے دیتا ہے۔ وہاں بھی اپنے قاری کو جمالیاتی طور پر متاثر کر سکتا ہے۔ شرط یہی ہے کہ فن کار کو یہ بات معلوم ہو کہ اسے جو کچھ کہنا ہے اس انداز میں کہے کہ بات قاری کو سمجھ میں آسکے"[۹]

قاری اور فن کار ایک دوسرے کو اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جب کوئ فن پارہ قاری کی سمجھ میں آسکے گا تو اس فن پارے کی ادبی ہئیت ہو گی تو ضرور مگر وہ ناکام ادبی فن پارہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہئیت صرف نظم کی ظاہری شکل کو ہی نہیں کہا جاتا بلکہ اس ظاہری شکل کے پیچھے شاعر کے بے شمار احساسات اور جذبات پوشیدہ ہوتے ہیں تقریباً ہر دور میں شعرا نے اپنے خیالات کو بیان کرنے کے لیے کسی نہ کسی ہیئت کا سہارا لیا ہے۔ ہر ہئیت کے اندر ہر لکھنے والے کا اپنا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے ہر لکھاری کا انداز بیان دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اردو نظم کے بے شمار تجربات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جب تجربات میں موجود مواد ترتیب چاہتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی ظاہری صورت سامنے آتی ہے۔ وہ ظاہری صورت کی وجہ سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ ہم اس باب میں معروف شاعر ادیب سہیل کی طویل منظوم آپ بیتی "غم زمانہ بھی سہل گزرا" کا ہیئتی مطالعہ پیش کریں گے۔ جس طرح انسان اپنی ایک مخصوص شکل کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ ایسے ہی ہر صنف بھی اپنی مخصوص ہیئت کی وجہ سے دوسری اصناف سے الگ تھلگ نظر آتی ہے۔ جب کوئی ہئیت اپنا وجود قائم کرتی ہے تو اس کے پیچھے اس دور کے سیاسی سماجی اور ارضی محرکات کارفرما ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے دور کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی نظم میں بیان کر دیتا ہے۔ اس بات سے انکار ممکن ہی نہیں ہے کہ ادیب دراصل اپنا عہد لکھ رہا ہوتا ہے۔ یعنی کہ اگر ادیب کا عہد خوشحال ہے تو اس کی شاعری کے اندر میلوں ٹھیلوں، باغوں بہاروں کا تذکرہ ملے گا لیکن اگر کسی ادیب کا عہد انقلابی گزرا ہے تو اس انقلاب کے پیچھے ظلم و ستم، ہجرت، قتل و غارت اور خوان

خرابے کی خوشبو واضح طور پر محسوس کی جاسکے گی۔ کچھ تحریر مخصوص وضع میں ہوتی ہیں۔ جن کو دیکھنے کے بعد فوراً فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اس ہئیت کی صنف کس مصنف کی ہے۔ مثلاً اگر افسانے کی ہیئت کی بات کریں تو اس کے کچھ بنیادی لوازمات ہوتے ہیں کہ افسانہ مختصر کہانی کو کہتے ہیں جس کو ایک یا ڈیڑھ گھنٹے کے دوران میں پڑھا جاسکتا ہے۔ کہانی میں ایک مرکزی کردار ہوتا ہے جس کے گرد کہانی گھومتی ہے۔ کہانی حقیقی زندگی کے بہت قریب ہوتی ہے لیکن کہانی بنائی جاتی ہے اصل یا حقیقی کہانی نہیں ہوتی وغیرہ وغیرہ۔ جب ہم ان ساری چیزوں کو دیکھتے ہیں تو فوراً ہم کہ سکتے ہیں کہ یہ افسانے کی ہئیت ہے۔ اس تحقیقی کام میں شامل طویل منظوم آپ بیتی "غم زمانہ بھی سہل گزرا'' آزاد نظم کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ اس منظوم آپ بیتی سے ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

''بیاہ کا گھر تھا
اور شہنائی
وقفے وقفے سے شادیانے بجا رہی تھے
گلی سے ایسی صدا جھما جھم کی اٹھ رہی تھے
ہوا نے جیسے پاؤں میں پازیب باندھ لی ہو
فضا میں گھنگھروسے بج رہے تھے''[۱۰]

* * *

ادیب سہیل کی منظوم آپ بیتی سے دیے گے دو حوالوں سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ "غم زمانہ بھی سہل گزرا'' ایک طویل آزاد نظم ہے۔ بات مزید آگے بڑھانے کے لیے مناسب ہے کہ آزاد نظم کے بارے میں بات کر لی جائے۔ آزاد نظم ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں ردیف، قافیہ کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ ردیف اور قافیہ اگر کہیں آجاتے ہیں تو اس میں کسی اصول یا ضابطے کے پابند نہیں ہوتے۔ مصرعوں میں بحر کا خیال ضروری ہے مگر تعداد ارکان کی بھی کوئی پابندی لازم نہیں ہے۔ آزاد نظم میں مصرعوں میں ترتیب نہیں ہوتی کسی مصرعے میں الفاظ کثرت سے استعمال کیے جاتے ہیں اور کوئی مصرع صرف ایک لفظ ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ مثلاً

''زمانے کی رفتار پر خندہ زن ہے؟
زمانہ تو بھیر گا ہوا ایک چابک کا
میرے بدن پر
مسلسل

انوکھے سفر کی کہانی سی اک

لکھ رہا ہے

مجھے لوحِ محفوظ گر دانتا ہے

کہ شاید

میں خود ایک لنگڑا اتارستا قلم ہوں"[۱۲]

اس مثال سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ واقعی آزاد نظم میں کبھی کبھی مصرع ایک لفظ کا ہی متقاضی ہو تا ہے۔ اگر اس ٹکڑے پر غور کیا جائے تو اس کے چوتھے مصرعے میں صرف ایک لفظ "مسلسل" استعمال ہوا ہے جو مصرع مکمل کر تا ہے۔

شاعری فکر و خیال کے سانچوں سے نکل کر قاری کے ذہن میں اپنی جگہ بناتی ہے۔ لکھاری کو اس بات سے آشنائی تب ہوتی ہے جب وہ زمانے کی لگائی ہوئی حد بندیوں کو توڑ تا ہے۔ وہ سارے زمانے سے ہٹ کر چلتا ہے۔ شاعر کا ہٹ کر چلنا ہی اس کو مقام رفعت عطا کر تا ہے۔ اگر ماضی کی بات کریں تو ماضی میں صرف پابند نظم لکھنے کا رواج عام تھا۔ اس رواج کو توڑنا ایک مشکل کام تھا۔ مگر جب حالات نے چاہا تو نئے لکھنے والوں نے پابند نظم کے دائرے کو توڑ کر آزاد نظم کی ہیئت کو متعارف کرایا ہے۔ جب آزاد نظم مروج نہیں تھی تو بہت سے لوگوں کے پاس لکھنے کا اور کوئی پیمانہ نہیں تھا۔ کیوں کہ پابند نظم شاعر کے سامنے بہت سے تقاضے رکھتی ہے۔ ان تقاضوں کو پورا کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ آزاد نظم میں پابندیاں زیادہ نہیں ہیں اور شاعر صرف اپنے خیالات کا اظہار چاہتا ہے۔ جب شاعر اپنے خیالات کا اظہار کرے گا تو وہ خیالات ایک مخصوص ہئیت اختیار کر لیں گے۔ اگر آزاد نظم کے آغاز اور ارتقا کی بات کریں تو نثر کے مقابلے میں نظم پہلے وجود میں آئی ہے۔ نثر کے مقابلے میں شاعری زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے۔ ایک بات جس کو ہم نے مضمون میں بیان کیا ہے اس بات کو اگر شعر کے ذریعے بیان کریں تو شعر میں بیان کی جانے والی بات زیادہ اثر رکھتی ہے۔ امداد امام اثر ایک جگہ لکھتے ہیں:

"شاعری رضائے الٰہی کی ایک ایسی نقل ہے جو الفاظ یا معنی کے ذریعے ظہور میں آتی ہے۔ رضائے الٰہی سے مراد فطرت اللہ ہے اور فطرت اللہ سے مراد قوانین فطرت ہے جنھوں نے حسب مرضی الٰہی نفاذ پایا جاتا ہے اور جن کے

مطابق عالم درونی و بیرونی نشو ونما پا گے۔ اس عالم دورونی و بیرونی کی نقل صیح
جو الفاظ یا معنی کے ذریعے سے عمل میں آتی ہے وہ شاعری ہے"[۱۳]

شاعر پر اللہ تعالیٰ کی ذات کا خاص کرم ہوتا ہے۔ شاعر داخلی و خارجی دونوں قسم کے تجربات سے واقف ہوتا ہے۔ اگر شاعر دونوں طرح کے تجربات سے آگاہ نہیں ہو گا تو وہ ایک شاعر ضرور ہے مگر وہ عظیم شاعر نہیں ہو سکتا۔ انگریز نقاد جانسن ایک جگہ لکھتا ہے:

"یہ کہنا آسان ہے کہ شاعری کیا نہیں ہے۔ روشنی سے ہم سب واقف ہیں
لیکن روشنی کیا ہے یہ بتلانا مشکل ہے"[۱۳]

جیسا کہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہر صنف اپنی کچھ خوبیوں کی وجہ سے دوسری تمام اصناف سے الگ تھلگ ہوتی ہے۔ اگر غزل کی بات کریں تو غزل میں مختلف اکائیاں جمع ہوتی ہیں۔ اس کا ہر شعر اپنے اندر ایک مکمل جہاں آباد کیے ہوتا ہے۔ لیکن نظم لکھنے کے لیے تسلسل کا ہونا ضروری امر ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نظم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"نظم بچے کے اس دور کی طرح ہے جب وہ سن بلوغت کو پہنچ کر ایک علیحدہ
کل میں تبدیل ہو جاتا ہے"[۱۴]

شروع شروع میں نظم نے اپنا تعارف کرانے کے لیے مثنوی، رباعی، قطعہ، مسمط، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد وغیرہ کا سہارا لیا جبکہ موضوعی تعارف کرانے کے لیے نظم کو حمد، نعت، قصیدہ، مرثیہ، شہر آشوب، واسوخت، ریختی، پیروڈی، گیت وغیرہ کا روپ اختیار کرنا پڑا۔ نظم کے بالکل ابتدائی دور کی بات کریں تو اردو کے پہلے شاعر قلی قطب شاہ کے دیوان میں بھی نظمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ دکنی دور سے لے کر آج تک ہر دور میں نظمیں لکھیں جاتی رہیں۔ یوں تو نظم پرانے موضوعات لیے بیٹھی تھی۔ مگر نظیر اکبر آبادی نے اس فرسودہ روایت کو بدل کر نظم کے اندر نئے موضوعات کو شامل کیا ہے۔ نظیر کے ساتھ حالی، محمد حسین آزاد اور ان کے رفقا کار نے بھی اس کام کو آگے بڑھانے میں ان کا ساتھ دیا۔ نظم کا صحیح تصور حالی کے ہاں ملتا ہے جس نے غزل سے قطع تعلقی کر کے نظم کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑا ہے۔ حالی اور محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے قیام کے بعد اردو نظم میں نئی روح پھونکی ہے۔ اس بات کی تائید کرتے ہوئے ڈاکٹر ناہید قاسمی رقمطراز ہیں:

"انجمن پنجاب کے قیام سے اردو شاعری میں ایک نیا رنگ و آہنگ شامل ہوا۔ اس انجمن کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعرے اردو شاعری کا سنگ میل ثابت ہوئے"[۱۵]

الطاف حسین حالی کی کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں بھی حالی بحر اور قوافی کی پابندی سے احتیاط برتتے رہے۔ ان کا یہی تجربہ جدید شاعری بلکہ جدید اردو نظم کو فروغ دینے میں کارگر ثابت ہوا۔ حالی کی نظموں میں آسان الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ حالی نے مشکل پسندی سے انحراف کر کے سلیس اردو کو استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا خیال ہے کہ:

"نئے خیالات سے اردو نظم کو جدیدیت کی ڈگر پر ڈال کر اسے نئی شاعری کا امتیازی نشان بھی بنا دیا"[۱۶]

جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو اس وقت پابندیوں کا خاتمہ ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب قید و بند کے خلاف لاوا اپھٹا تھا اور احتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں تھیں۔ اس دور میں آزاد نظم کو ایک نئی روشنی ملی تھی۔ بقول شاید شیدائی:

"اردو میں ترقی پسندی کے ساتھ ہی آزاد نظم نے جنم لیا، مگر نہ تو ترقی پسندوں کے موضوعات اپنے مینی فیسٹو سے الگ ہوئے اور نہ وہ بنی بنائی ترکیب اور آہنگ لہجے سے اپنا دامن چھڑا سکے۔ دوسری طرف حلقہ ارباب ذوق تحریک سے چند ایسے شاعر سامنے آئے جنھوں نے صحیح معنوں میں نظم معّرا اور آزاد نظم کے رموز کو سمجھتے ہوئے اس صنف میں طبع ازمائی بھی کی اور نئی نظم کی تشکیل کی بنیاد رکھتے ہوئے ہئیت کے نت نئے تجربات بھی کیے۔ اس تحریک کے ابتدائی دور میں میراجی، ن۔ م۔ راشد، یوسف ظفر، مختار صدیقی، عزیز حامد مدنی کے علاوہ کئی دیگر شعرا کرام سرگرم عمل رہے۔ تاہم یہ بات عیاں ہے کہ اس دور کے ابتدا ہی سے نظم معرا آہستہ آہستہ غائب ہونا شروع ہوگئی۔ اور اس کی جگہ آزاد نظم اپنے پیر جماتی چلی گئی۔ جسے آج ہم جدید نام سے یاد کرتے ہیں"[۱۷]

آزاد نظم اپنے ہیئتی اعتبار سے مختلف ہے۔ یعنی پابند نظم، نظم معرا اور آزاد نظم کے درمیان فرق صرف اور صرف ہیئتی اعتبار سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ کہیں کہیں نظموں میں بعض قدریں مشترک ہیں۔ آزاد

نظم کی مثال ایک بہاؤ کی طرح ہے کہ ایک بہاؤ آتا ہے اور لکھاری کے جذبات کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ جدید نظم کلاسیکی نظم اور غزل سے اپنے منفرد اسلوب اور ہئیت کی وجہ سے الگ تھلگ ہے۔ ادب کے قاری کے ہاں ہمیشہ یہ سال موجود رہاہے کہ ،، یہ جدید نظم ہے کیا،،؟ اور آزاد نظم کی وہ کونسی خوبیاں ہیں جو اسے دوسرے فن پاروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ کچھ نقادوں نے غزل کے رد عمل کے طور پر آنے والی چیز کو نظم جدید کا نام دیاہے۔ جدید نظم میں داخلیت کا عنصر زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ اس میں شاعر اپنے باطن کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر اپنے ذاتی رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ ابو الاعجاز صدیقی جدید نظم کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ”ترقی کے کسی معین روایتی نظم کے علاوہ مصرعوں کی یکسانیت اور وزن سے بھی نجات حاصل کرنے کی خواہش نظم آزاد کی شکل جس میں ظہور پذیر ہوئی۔ نظم آزاد کی بھی تین اقسام ہیں۔
>
> الف۔ موزوں
>
> ب۔ نیم موزوں
>
> ج۔ غیر موزوں
>
> یہ سوچنا غلط ہو گا کہ معّرا یا آزاد نظم پابندیوں سے بچنے کے لیے سہل انگار شعرا کی سہولت طلبی کے سوا کچھ نہیں کیوں کہ نظم آزاد نظم مصرا لکھنے والے شعرا اگر ایک طرف انھوں نے اس قسم کی نئ شاعری کا وقار بلند کرنے کے لیے شعراء کے بعض پہلوؤں پر زور دیاہے جن کی جانب قدیم اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے والے شاعر کم توجہ دیتے تھے“[۱۸]

ناصر عباس نئیر کے مطابق:

> ”میری نظر میں بیسویں صدی کی وہ اردو نظم جدید قرار دی جاسکتی ہے جو تخلیق کار کی ذات (self) کی خود مختاری کے پختہ تصور کے تحت وجود میں آئی ہو۔ خود مختار ذات ہی روایت سے بغاوت کرتی اور موضوع، اسلوب اور تکنیک کی سطح پر تجربات کرنے کے اہل ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں جدید جمالیات کو وجود میں لانے کی قدرت رکھتی ہے“[۱۹]

جدید نظم سے مراد صرف موضوع اور اسلوب میں جدت نہیں لانا بلکہ جدید نظم وہ ہے جس کے اند ردور حاضر کے مسائل کا حل نظر آتا ہو۔ صرف جدید اصطلاحات کو رائج کرنے کا نام جدید نظم نہیں ہے۔ڈاکٹر ارشد محمود شاد لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک وہ نظم جو خارجی مناظر فطری پیکر وں اور ظاہری موضوعات کے یک رخ، سپاٹ اور بے رس بیانات سے آگے گزر کر اندر کے موسموں سے ہم کلام ہوتی ہو وہ جدید نظم ہے"[۲۰]

اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں جدید نظم کے حوالے سے جو معلومات ملتی ہے وہ یہ ہیں کہ ہر دور میں کہیں نہ کہیں انقلاب آتے رہتے ہیں اور جدید نظم ان انقلابات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ جس کے اندر سماجی، معاشی، معاشرتی مسائل کو زیر بحث کیا گیا ہے۔ کیونکہ جب حالات بدلتے ہیں تو ہر چیز نئے سرے سے ترتیب دی جاتی ہے۔ اور پھر جب کوئی طاقتور ملک کسی کمزور ملک پر اس کی مرضی کے خلاف قبضہ جماتا ہے۔ اس کی ساری معیشت کو کنٹرول کرتا ہے تو اس کو نو آبادیاتی نظام کہتے ہیں۔ اس نظام کے خلاف لکھی جانے والی زیادہ تر شاعری آزاد نظم کی صورت مین موجود ہے۔ڈاکٹر ضیاء الحسن لکھتے ہیں:

"اردو میں وہ نظم جس نے پابندیوں کی قیود سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنے سفر کا آغاز انجمن پنجاب سے کیا، جدید اردو نظم ہے۔ اس حوالے سے کئی تجربات ہوئے جو ردو قبول سے گزرتے ہوئے معرا، آزاد اور نثری نظم کی ہیئتوں میں مستحکم ہوئے"[۲۱]

نو آبادیاتی نظام کی بات کی جائے تو برصغیر پاک و ہند پر جب انگلستان والوں نے اپنا تسلط قائم کیا تھا۔ اس دور میں ہر ظلم ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں پر کیا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعے نے پورے برصغیر کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ جہاں ریاستی سطح پر تبدیلیاں رونما ہوئیں وہاں اس فضا نے ادبی ماحول کو بھی بدلا اور غزل کی جگہ نظم نے لے لی تھی۔ انگریزوں نے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج بنایا اور پھر دہلی کالج کی بنیاد رکھی۔ وہاں پر انگریزی ادب کے تراجم ہوئے اور نئے لکھنے والوں کے لیے راستے آسان ہوتے گئے۔ انگریزی ادب کے تراجم سے نئی نئی ہئیتوں سے اشنائی ہونے لگی۔ آزاد نظم اسی تناظر کی پیداوار ہے۔ نئی نظم کی آبیاری کے لیے بہت سے انگریز شعرا نے بھی اپنا حق ادا کیا۔ اس دور میں سر سید احمد خان وہ واحد ہندوستانی تھے جو انگریزوں سے پوری طرح متاثر تھے۔ انھوں نے نئی نظم کو پسند کرتے ہوئے نئے خیالات کے اظہار کے لیے بغیر پابندی کے

نئ نظمیں تخلیق کرنے پر زور دیا۔ اگر نظم کی نئ ہئیتوں س کی بات کریں تو حالی کی اصلاح غزل کی تحریک سر سید احمد خان کے خیالات کا نتیجہ قرار دی جائے تو بہتر ہے۔ طارق حبیب لکھتے ہیں:

> ''کچھ ادب جدید ہو کر بھی قدیم ہوتا ہے اور کچھ قدیم ہو کر بھی جدید ہوتا ہے۔ چاہے وہ نثری ہیئت میں ہو یا منظوم ہیئت میں المختصر کہ وہ موجودہ عہد کے تمام مسائل اور تقاضوں کو نظم یا ادب کا حصہ بنانا ماضی اور حال کے تاریخی اور تجرباتی شعور کی روشنی میں مستقبل کو بھی نظر رکھنا اور آئندہ کے امکانات کو گرفت میں لینا جدید کی دلیل میں آتا ہے'' [۲۲]

آزاد نظم کا تجربہ ایک ایسا تجربہ ہے جس نے شاعری کو بہت سی پابندیوں سے آزادی دلوائی ہے۔ دراصل آزاد نظم میں تخیل کا بہتر ہونا ضروری امر ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے پورے ادب کے اند رہلچل مچا دی تھی۔ اس واقعے نے نہ صرف فرسودہ قدروں کو ختم کیا بلکہ نئ قدروں کو بھی عروج بخشا ہے۔ ہماری قدیم نظم کے اندر بھی بہت سی خامیوں نے مضبوطی اختیار کی ہوئی تھی۔ جس میں قافیانہ نظام کی پابندی، بیانیہ رنگ، ہیئت کی پابندی، علامتی نظام کی کثرت، پرانے اور بے مقصد موضوعات کی بھرمار، تہذیبی مظاہر غزل کی طرح روایتی تلمیحات کا بے جا استعمال کیا، قدیم نظم میں خارجیت پائی جاتی تھی۔ داخلیت کی کمی تھی اور انفرادی تجربات کی کمی نظر آتی ہے۔ اس کے مقابلے میں جدید نظم نے ان تمام رکاوٹوں کے دریاؤں کو عبور کیا ہے۔ اور آزاد نظم کے کامیاب تجربے کے بعد شعرا کو اپنے جذبے و احساسات کے اظہار کا ایک موقع میسر آیا۔ جدید اردو نظم کی ایک خوبی نئے موضوعات کی تلاش ہے۔ جدید نظم گو شعرا نے ہولی، دیوالی، عید، برسات، میلے ٹھیلے جیسے بے مقصد موضوعات سے جان چھڑا کر نظم کو نئے موضوعات سے آراستہ کیا ہے۔ یہاں ن م راشد اور میرا جی کی چند آزاد نظموں کو بطور مثال پیش کیا جا رہا ہے۔

''جہاں زاد بغداد کی خواب گوں رات
وہ رودِ دجلہ کا ساحل
وہ کشتی وہ ملاح کی بند آنکھیں
کسی خستہ حال رنج پہ کوزہ گر کے لیے
ایک ہی رات وہ کہربا تھی

کہ جس سے ابھی تک ہے پیوست اس کا وجود
اس کی جاں، اس کا پیکر
مگر ایک ہی رات کا ذوق دریا کی وہ لہر نکلا
حسن کوزہ گر جس میں ڈوبا تو ابھرا نہیں ہے"[۲۳]

(حسن کوزہ گر۔ ن۔ م راشد)

***

"اب آنکھوں میں جنبش نہ چہرے پہ کوئی تبسم نہ تیوری
فقط کان سنتے چلے جا رہے ہیں
یہ اک گلستان ہے، ہوا لہلاتی ہے کلیاں چٹکتی ہیں
غنچے مہکتے ہیں اور پھول کھلتے ہیں کھل کھل کے مرجھا کے گرتے ہیں
اک فرش مخمل بناتے ہیں، جس پر
میری آرزؤں کی پریاں عجب آن سے یوں رواں ہیں
کہ جیسے گلستان ہی اک آئینہ ہے
اس آئینے سے ہر اک شکل، نکھری، سنور کر مٹی اور مٹ ہی گی
پھر نہ ابھری"[۲۴] (سمندر کا بلاوا۔ میرا جی)

جدید شاعری کے رجحان سے آزاد نظم کے لکھاریوں کے پاس ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شخصی واردات کو زیادہ اہمیت ملی ہے۔ یہ باتیں پرانی نظموں میں شامل نہیں تھیں۔ جدید نظم گو شعرا کے ہاں خیالات کی حرکت ملتی ہے نہ کہ خیالات جامد ہیں۔ جدید نظم میں کئی تصویریں نظر آتی ہیں۔ جب یہ ساری تصویریں کسی سانچے میں ڈھل کر ترتیب پاتی ہیں تو کوئی اکائی وجود میں آتی ہے۔ جدید نظم کے حوالے سے راحت نسیم ملک لکھتے ہیں:

"کوئی بات بھی جزوی طور پر آگے نہیں بڑھتی بلکہ سب کا بہاؤ اکٹھا ہوتا ہے اور مختلف النوع تاثرات ایک آہنگ کے ساتھ اکٹھے ہو کر ایک نظم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں"[۲۵]

جدید نظم پرانے راستوں کو چھوڑ کر نئے راستوں پر اپنا رخت سفر باندھتی ہے۔ وہ تشبیہ کے پرانے رواج کو ختم کر کے علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے نئے تخلیقی رو کو جنم دیتی ہے۔ جدید نظم نے قافیہ اور ردیف

کے سنگلاخ حصار کو توڑ کر ایک نئے راستے کا تعین کیا ہے۔ اور لکھنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا کی ہیں۔ بہت سے لوگ جو اپنے جذبات کا اظہار چاہتے تھے مگر پابند نظم کے لگے دائرے کو توڑنا ان کے لیے مشکل امر تھا۔ جدید نظم جذبات کے آزادانہ خیالات کا دوسرا نام ہے۔

آزاد نظم لکھنے والے کا خیال ہے کہ ہر فرد کے اندر ایک مکمل نظام ہوتا ہے یعنی کہ ثقافتی نظام اس کے نہاں خانوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اساطیر کا نظام بھی کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔ جبکہ قدیم نظم لکھنے والوں کے ہاں ان چیزوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ قدیم نظم لکھنے والوں نے صرف خارج کو ہی موضوع بنایا ہے جبکہ جدید نظم نے داخل اور خارج دونوں کو موضوع بنایا ہے بلکہ خارج کو داخل کی ہی ایک کڑی کہا ہے۔ اردو نظم کی صحیح معنوں میں پہچان دلوانے والوں میں محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی قابل ذکر ہیں۔ جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ہنگامہ برپا ہوا تو لوگوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ لیکن ان دو لوگوں نے ظلم کی چکی میں پسے ہوئے لوگوں کو سہارا دیا، اس دور کی بات ہے جب لوگوں کی زبانوں پر تالے لگ چکے تھے۔ اور احساس شکست اتنا مضبوط ہو چکا تھا کہ لوگ ہار مان چکے تھے۔ تب محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے مصمم ارادوں سے لوگوں کا ساتھ دیا ان کے ساتھ ایک بڑا نام سر سید احمد خان کا بھی آتا ہے۔ جہنوں نے بر صغیر کے لوگوں کو مغربی تہذیب قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ محمد حسین آزاد وہ شاعر تھے جنھوں نے اپنے نقصان کا نوحہ خوانی کرنے کے بجائے اپنے لوگوں کے جوش کو گرمایا ہے۔ جدید شاعری کے حوالے سے محمد حسین آزاد کا ایک تاریخی لیکچر ملاحظہ کیجیے جو جدید شاعری کے لیے منشور کی حثیت رکھتا ہے۔

> "میرے اہل وطن آؤ آؤ۔ برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اٹھو اٹھو! وطن اور اہل وطن کی قدیم نام وری کو تباہی سے بچاؤ۔ تمھاری شاعری جو چند محدود احاطوں پر پل کر چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کو آزاد کرنے میں کوشش کرو۔ نہیں تو ایک زمانہ تمھاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہو جائے گی اور اس کو فخر آبائی اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا پڑے گا بڑے افسوس کا مقام ہے"[۲۷]

کسی بھی نظم کو جو چیز کامیاب بناتی ہے وہ نظم نگار کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ جذبہ ایک مبہم سا خیال ہوتا ہے۔ جو شاعر کے ذہن میں ایک مصرعے کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ بقیہ نظم اسی ایک مصرعے کی مرہون منت ہوتی ہے۔ پہلا مصرعہ پوری نظم کو تخلیق کرنے کے لیے بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ نظم کو

تخلیق کرنے سے پہلے نظم نگار پہلے نظم کا خاکہ تیار کرے تو لکھتے ہوئے آسانی ہوتی ہے۔ اگر لکھنے سے پہلے نظم کا خاکہ تیار نہ کیا جائے تو شاعر قافیہ اور ردیف کا سہارا لیتے ہوئے نظم کو غزل کے بہت قریب لے جاتا ہے۔
آزادی سے قبل اردو نظم کے موضوعات میں زیادہ تر وطن کے موسم، جنگل، پہاڑ، انقلاب، سماج بہادری اور بزدلی کے جیسے موضوعات تھے۔
حالی، نظیر اکبر آبادی، شبلی اور آزاد جیسے شاعروں کی نظموں میں وطن پرستی کا جذبہ نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ اقبال نے بھی اپنی نظم میں اپنی قوم کو موضوع بنایا ہے۔ جب ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو تب سے حلقہ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے ظلم، جبر، قتل وغارت کی چکی میں پسنے والی عوام کے دکھ کو موضوع بنایا۔ تب کسانوں اور مزدوروں کے حق میں بات کی گئی۔ کسی نے انگریزوں کے ظلم وستم کو اپنی نظم کا موضوع بنایا تو کسی نے ان کی برہنہ تہذیب کا کھل کر مذاق اڑایا۔ اس وقت کے جدید نظم نگاروں نے انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی ہمت کی۔ اس دور میں نظیر اکبر آبادی ایک ایسا شاعر تھا جس نے انگریز تہذیب پر خوب طنز کیا۔ جب بھی جدید نظم کی بات آتی ہے تو دو نام ہمارے سامنے آجاتے ہیں ان میں سے ایک نام ن۔ م راشد کا ہے جبکہ دوسرا نام میرا جی کا ہے۔ ان دونوں شعرا نے اردو جدید نظم کو قصیدہ، مثنوی، غزل مسلسل، قطعہ وغیرہ کے پرانے سانچوں سے نکل کر ایک نئی جہت عطا کی۔ راشد اور میرا جی نے نظم کی نئی ہیت متعارف کرائی ہے۔ آزاد نظم ان دونوں کی تخلیق کردہ ہیت ہے اگر ایسا کہا جائے تو کچھ غلط نہیں ہو گا۔ نئی اور پرانی نظم کے درمیان فرق کو واضح کرنے کے لیے نئی نظم کے ذریعے، خوشبو اور لہجے، علامتوں، الفاظ اور تلازمے نے ایک نیا احساس پیدا کیا۔ پہلے تو نظم اور نثر ایک دوسرے کی ضد میں استعمال ہونے والے دو الفاظ ہیں۔ ابتداء میں غزل مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی قطعہ وغیرہ نظم کے وسیلے سے ہی وجود میں آئے ہیں۔ لیکن جب ہم نظم کے ساتھ جدید کا لفظ لگاتے ہیں تو اس سے مراد ہے ایسی شاعرانہ تخلیق جو مسلسل خیال کو بیان کرے۔ چونکہ باقی اصناف کے مقابلے میں جدید نظم کا ظہور دیر بعد ہوا ہے۔ جدید نظم کے ابتدائی نقوش کی بات کریں تو اس کے ابتدائی نقوش دکن سے ہی ملتے ہیں۔ بہت سے شعرا کرام کی مثنویات کے حصے جڑ کر مسلسل نظم کا روپ اختیار کرتے ہیں۔ ابتداء میں محمد قلی قطب شاہ نے کئی نظمیں لکھی ہیں بعد میں دہلی کے اولین دور میں فائز اور حاتم کی نظمیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ لیکن جدید نظم کا موجد نظیر اکبر آبادی ہی گردانا جاتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے جدید نظم میں ایسے موضوعات کو اپنی نظموں میں سمویا ہے جو حقیقی زندگی کے قریب ترین تھے۔ جب اردو ادب کی پوری تاریخ میں جدت آئی تو وہ جنگ آزادی کا ہنگامہ ہی

ہے۔ جس نے پورے برصغیر کے حالات کو بدل دیا تھا۔ جہاں زندگی کے دیگر میدانوں میں تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں وہاں شاعری اور خاص کر جدید نظم کو بہت فروغ ملا تھا۔ جنگ آزادی کے بعد نظم جدید کے بانیوں میں محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی کا نام ہی سر فہرست آتا ہے۔ ان کے بعد اسماعیل میرٹھی نے بھی اس کام کو تقویت دی اور غیر مقفیٰ لکھنا شروع کیا۔ جب اس طرح کے تجربات ہونا شروع ہوئے تو نظم کے موضوعات کے ساتھ ساتھ نظم کی ہیئت میں بھی تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔ اس دور کے جدید نظم گو شعرا میں شوق قدوائی، نظم طباطبائی، بے نظیر شاہ بیاں، میرٹھی والا، پیر شاد برق، عظمت اللہ شامل ہیں۔ اکبر آلہٰ آبادی بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ انھوں نے بھی انگریز تہذیب کو طنز کا نشانہ نہ بنایا۔ وہ اسلام کے حق میں لکھتے رہے۔ اقبال بھی اسی دور کے شاعر تھا انھوں نے اپنی باریک بینیوں سے اردو نظم میں خوبصورتی پیدا کی۔ انھوں نے لوگوں کو اپنی زندگی گزارنے کا درس اپنی نظموں میں دیا ہے۔ نظم جدید لکھنے والوں کی اگر بات کریں تو ایسے بہت سے شعرا تھے جنھوں نے اس کار خیر میں حصہ ڈلا ہے۔ ہر ایک کو بیان کرنے سے بات طوالت اختیار کر جائے گی۔ لہٰذا جدید نظم کے مقاصد بیان کرنے کے لیے چند شعرا کا ذکر بہت ہے۔ ان تمام لوگوں نے آزاد نظم کی جو تعریف بتائی ہے وہ یہ ہے کہ آزاد نظم ایسی نظم ہے جس کے تمام مصرعوں کا وزن برابر نہ ہو۔ نظم کے مصرعے چھوٹے بڑے ہو سکتے ہیں مصرعوں میں ارکان کے درمیان اتار چڑھاؤ لگا رہتا ہے۔ بعض اوقات طویل نظم کے مختلف حصے مختلف بحروں میں بھی بیان کیے جا سکتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں جب ترقی پسند تحریک کا آغاز کیا گیا تو جہاں افسانہ اور ناول میں موضوعی تبدیلیاں آئیں وہیں آزاد نظم لکھنے والے شعرا نے بھی شہرت پائی ہے۔ جن میں ن۔ م راشد، میرا جی، تصدق حسین خالد، فراق، فیض احمد فیض، مخدوم، اختر الایمان، سردار جعفری، نیاز حیدر، مختار صدیقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں جہاں ہیئتی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں وہاں آزاد نظموں کی کچھ پابندیوں کو بھی ختم کر لیا گیا۔ تب مذہب سے بغاوت اور مذاق کے مضامین قلمبند کیے جاتے تھے۔ جذبات میں عریانی کا عنصر واضح تھا۔ نئے استعارات کا استعمال ہے وغیرہ وغیرہ یہاں ن۔ م راشد کی نظم کا ایک ٹکڑا دیا جا رہا ہے۔

"پھول ہے گھاس ہے اشجار ہیں دیواروں میں
اور کچھ سائے کہ ہیں مختصر تیرہ و تار
تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں؟
دیکھ پتوں میں لرزتی ہوئی کرنوں کا نفوذ

سر سراتی ہوئی بڑھتی ہے رگوں میں جیسے

اولین بارہ کساری میں ہے تازہ و تاب

تجھ کو کیا اس سے غرض کہ خدا ہے کہ نہیں؟"[۲۸]

اردو میں جدید نظم جس کو موضوعاتی نظم بھی کہا جائے تو کچھ غلط نہیں ہو گا۔ جب مغربی اور مشرقی تہذیبوں کا آپس میں واسطہ پڑا تو ایک نئی تہذیب متعارف ہوئی تھی۔ تب ان دونوں تہذیبوں کے ملنے سے نئی نظم نے بھی جنم لیا تھا۔ اس عہد کے نظم گو شعرا میں محمد حسین آزاد اور نظیر اکبر آبادی کے نام ہی سامنے آتے ہیں۔ ان لوگوں کی کوششوں کی وجہ سے موضوعاتی نظم اپنا نام پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اس حوالے سے ایک نقطہ بہت اہمیت کا حامل ہے کہ محمد حسین آزاد نے:

"اردو کی جدید شعری روایت کی تشکیل کے کام کا آغاز کیا اور ان معنوں میں وہ روایت ساز شاعر تھے۔ جدید نظم پر کام کرنے والے نقاد کو لا محالہ انھی سے آغاز کرنا پڑتا ہے"[۲۹]

اس ضمن میں مولانا کی مشہور زمانہ مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی غزل سے دوری اختیار کر کے نظم کو اپنایا گیا ہے۔ نئی نظم لکھنے والوں نے جہاں بہت سے معاشرتی مسائل کو حل کیا ہے وہاں نقادوں نے ان پر خوب تنقید بھی کی ہے اس حوالے سے جیلانی کامران کا خیال ہے:

"جو مسئلہ نئی نظم کے شاعر کو درپیش ہے وہ فلسفیانہ نوعیت کا ہے اور اس سوال سے پیدا ہوتا ہے کہ میں کون ہوں؟ نئی نظم کا شاعر یہ نہیں پوچھتا کہ دنیا کیا ہے؟ معاشرہ ایسا کیوں ہے؟ کائنات کیا ہے؟ وہ صرف اپنی شناخت چاہتا ہے"[۳۰]

اس رائے سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ جدید نظم کا شاعر مذہب، فلسفہ، تصوف کا سہارا لیے بغیر اپنے خیالات کو بکھرنے کے کرب سے دوچار ہے۔ وہ انسان کی ماہیت کو بھول کر انسان کے تشخص کی بات کرتا ہے۔ کیونکہ نئی نظم کے لکھنے والے کسی بھی مذہبی تحریک کا اثر قبول نہیں کرتے تھے۔ ان لوگوں نے انسانی مسائل کو از سر نو بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ ان شعراء کے ہاں ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کی نظریہ سازی کی آمیزش ملتی ہے۔ نئی نظم لکھنے والوں نے علامتی انداز کو اپنایا ہے۔ تا کہ نظم کو نئی جمالیاتی اقدار سے روشناس کرایا جائے۔ مگر جس طرح یہ شاعر نظم کے اظہار کے لیے نئے قرینوں کو جمالیات

سے سجا رہے ہیں۔ وہاں فکری سطح پر بھی انسان کے لیے ایسے معاشرے کی تلاش میں ہیں جو اس زمین پر سے خوف و وحشت کا خاتمہ کر کے امن و محبت کے فروغ کے لیے مدد گار ثابت ہوں۔ اس زمین پر ایسے انسانوں کا جنم ہو جو ان اقدار کی روشنی میں ایک مثالی معاشرہ قائم کر سکیں۔

**ب۔ "غم زمانہ بھی سہل گزرا" کا اسلوبی مطالعہ:**

کسی دانا کا قول ہے کہ کائنات میں انسان تین چیزوں کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ خدا، فطرت اور خود انسان کی اپنی ذات۔ اس قول سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معلومات کے دائرے کو بہت محدود کر دیا گیا ہے۔ لیکن جب غور و فکر کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے نے کتنی گہری بات کہی ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنے نقطہ نگاہ کے مطابق خدا کے تصور سے انکار کیا ہے۔ کانٹ نے انتقاد عمل محض میں یہ دعویٰ کیا کہ عقل محض کا معنی وہ علم نہیں ہے جو اس کے مسخ کرنے کے بعد ہم تک پہنچتا ہے۔ عقل محض کا علم وہ علم ہے جس کے ماٰخذ حواس نہیں ہیں۔ جو سارے تجربات حسی سے بلند و بالا ہیں۔ یہ وہ علم ہے جو داخلی نظریات کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔ کانٹ کے مطابق اسی خدا کا تصور عقل محض کا مرہون منت ہے۔ دراصل اسلوب فکر و معنی اور ہیئت و صورت کے ملنے سے پیدا ہوتا ہے۔ پروفیسر مرے نے اسٹائل کا ترجمہ اسلوب کیا ہے۔ پھر یہ کیا ہے اسلوب کی جو جو تعریف ملتی ہے وہ اگر گمراہ کن نہیں ہے تو ناقص ضرور ہے۔ پروفیسر مرے کی اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلوب کے معنی و مفاہیم سے پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسلوب کی تعریف "اسلوب مصنف کی شخصیت کا دوسرا نام ہے" یہ بہت اچھی تعریف ہے مگر جب اس کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوا جائے تو وہ معنی ہاتھ نہیں لگے جو تعریف بتا رہی ہے۔ **Henri Byle کے مطابق:**

> "اسلوب کے معنی یہ ہیں کہ فنکار کسی سلسلہ فکر کے اظہار کے وقت وہ تمام
> کوائف شامل کرے جو سلسلہ فکر کے کامل ابلاغ کے لیے ضروری ہیں"[۳۱]

ہر ایک ادیب کا اسلوب دوسرے سے مختلف ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لوگوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ مولانا ابو الکلام کی اگر بات کریں تو اردو ادب کے اندر مولانا ابو الکلام نے بہت مشکل تراکیب استعمال کی ہیں۔ بہت مشکل الفاظ کا چناؤ ان کی تحریروں میں سامنے آتا ہے۔ اس کے باوجود جو ایک خوبی ہے کہ ان کے لکھنے کا انداز منفرد ہے۔ جس طرح کچھ محققین کا کہنا ہے کہ انسان کا اسلوب ہی اس کی شخصیت ہے تو واقعی ایسا ہے۔ اصغر گونڈوی، شاد عظیم آبادی، جگر مراد آبادی، یاس یگانہ یہ سارے ایک ہی دور کے شاعر ہیں لیکن ہر

ایک کا انداز بیان دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر ایک کا کلام اس کے منفرد اسلوب کی وجہ سے الگ پہچان رکھتا ہے۔ ان سارے شعراء کا کلام ایک جگہ رکھیں مگر یاس یگانہ چنگیزی کا کلام اپنی خوبی کی وجہ سے پہچانا جائے گا۔

"پہاڑ کاٹنے والے زمین سے ہار گئے

اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

بلند ہوئے تو کھلے راز پستی ہیں

بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا" [۳۲]

اسلوب کے حوالے سے اگر ابو الکلام کی تحریر کو پڑھا جائے تو ان کا انداز واضح بتائے گا کہ یہ تحریر ابو الکلام آزاد کی ہے۔ مثلاً ایک نثر پارہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں یہ نثر پارہ خود اپنے انداز سے ابو الکلام آزاد کے ہونے کا اقرار کرے گا۔

"سبحان اللہ چارہ فرمائے غیبی کی کار سازیاں اور راہ نمائیاں آوار گان غفلت کی دستگیریاں جذبہ توفیق کب سے اپنی طرف کھینچ رہا تھا مگر غفلت کی درماندگی دامن گیر تھی۔ جمال حقیقت کب سے بے نقاب تھا۔ مگر پردہ کج نظری حائل تھا۔ کرشمہ عنائیت کب سے پکار رہا تھا مگر نفس کے ہنگاہوں میں دل غافل تھا۔ ناکامی عشق نے آخری ضرب لگائی تو یکایک آنکھیں کھل گئیں۔ دیکھا تو ایک دوسرے ہی عالم کی ہوس ربائیاں سامنے تھیں۔ جن ہاتھوں کی رہ نمائی نے یہاں تک پہنچایا تھا۔ خود اس کو بھی ڈھونڈا تو پتہ نہ تھا گویا وہ ایک چراغ تھا کہ جب رات کی تاریکی میں چلتے رہنا دلیل راہ رہا۔ جب صبح ہوئی تو ضرورت نہ تھی بجھا دیا گیا۔" [۳۳]

جب نظیر اکبر آبادی کا کلام پڑھا جاتا ہے تو نظیر اپنے کلام میں صرف اور نحو کا خیال بالکل نہیں رکھتا۔ وہ نہ تلفظ کی، نہ املا کی اور نہ معنی کے چنگل میں پھنستا ہے۔ مگر نظیر جب لکھتا ہے تو اس کی انفرادیت اس کے کلام سے پہچانی جاتی ہے۔ ادب سے تعلق رکھنے والا ہر قاری بڑی آسانی کے ساتھ کہہ دیتا ہے کہ یہ مخصوص اسلوب صرف نظیر کے ہاں ہی پایا جاتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی نظمیں آدمی نامہ، دال، روٹیاں وغیرہ ایسی ہیں کہ جن میں انسان کی فطرت کے متضاد پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے خیال میں وہ لوگ سخت غلطی کر رہے ہیں جو تشبیہات، استعارات، تلمیحات کا سہارا لے کر اپنا کلام بیان کرتے ہیں۔ سخت الفاظ استعمال کرنے

سے کلام کامیاب نہیں ہوا کرتا بلکہ اسلوب ایسا ہونا چاہیے جو عام قاری کی سمجھ میں آ سکے۔ نظیر اکبر آبادی کا کلام کم پڑھے لکھے آدمی کے لیے بہترین تصور کیا جاتا ہے۔ ایک کامیاب اسلوب وہ ہوتا ہے جس میں فنکار غم ذات کو غم جہاں بنا کر بیان کرتا ہے اور غم یار، غم روز گار میں بدل جاتا ہے۔ یہ طریقہ کار کسی بھی اسلوب کا نقطہ عروج سمجھا جاتا ہے جو قاری کے دل پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے خیالات کو اپنے طریقے سے بیان کرنے کا فن جانتا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر بہادر شاہ ظفر کی غزل کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں۔

”بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل، کبھی ایسی تو نہ تھی

چشم قاتل میری دشمن تھی ہمیشہ لیکن
جیسی اب ہو گئ ہے قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی

پائے کو باں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں
آتی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفر سے ہر بار
تیری خو خورِ شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی“

اس غزل میں بہادر شاہ ظفر نے انگریز حکومت سے شکایت کی ہے اور علامتی انداز کو اس غزل میں اپنا سہارا بنایا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں کہ جیسے حالات اب انگریز حکومت کے ساتھ ہمارے چل رہے ہیں یہاں ایسے پہلے کبھی نہ تھے۔ جب انگریز بر صغیر میں تجارت کی غرض سے آئے تھے پھر جب انگریزوں نے اقتدار سنبھالا تو مغلیہ خاندان کے چشم و چراغ اور حاکم وقت کو زندان میں ڈال کر قتل کیا گیا تھا۔ اس بات کا رونا ظفر نے اپنے کلام میں کیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا اسلوب ایسا ہے کہ اس کے کلام کو پڑھنے کے بعد قاری فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ کلام بہادر شاہ ظفر کا ہے۔ کیونکہ اس کے کلام میں قتل و غارت بر صغیر کی بدامنی، حکومت کا خاتمہ

یہ ساری چیزیں شامل ہیں۔ برصغیر کی بدلتی ہوئی صورتحال کا اندازہ غالب کو بہت عرصہ پہلے ہو چکا تھا۔ وہ ہندوستان کا مستقبل ایک غزل میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"ظلم کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحرسو خموش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ و کرم وہ فردوس گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھے آ کر تو بزم میں
نہ وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریر خاصہ نوائے سروش ہے"

جب یہ غزل لکھی گئی تب ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ مگر غالب نے خود کہا ہے کہ یوں لگ رہا ہے کہ مستقبل قریب میں ایسے حالات ہوں سو ایسا ہی ہوا جیسا کہ غالب کو گمان تھا۔ ایک دانشور کا خیال ہے کہ اسلوب کے حوالے سے جتنے بھی مباحث ہوئے ہیں وہ خلط ملط ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی کاریگر بغیر دیواریں بنائے پچی کاری کرنے لگے۔ اکثر نقاد بھی اصل بات کو بھول کر نقل کی طرف توجہ دینا شروع کر دیتے ہیں۔ مسٹر سیموئل بٹلر لکھتے ہیں:

"فنکار کو چاہیے کہ اپنی تحریر میں زور اختیار اور حسن تعبیر کی صفات پیدا کرے کہ بری چیز بھی اچھی لگے"[۳۴]

ایک فنکار ایک جملے کو تین چار بار لکھے گا اور پھر اس کے اندر سے بیکار الفاظ کو نکال کر ایک خوبصورت جملہ تیار کرے گا۔ فنکار کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس کی تحریر کیسی ہے بلکہ اس کو اپنی تحریر سے زیادہ قاری کی فکر رہتی ہے۔ نیو مین اور آر۔ ایل سٹیونسن کا خیال ہے:

"پہلے اپنا ایک اسلوب معین کرنا چاہیے اور پھر اپنی تحریر کو اس سے مزین کرنا چاہیے"[۳۵]

فن کار ہر موڑ پر اپنے قاری کے لیے جمالیاتی پہلوؤں کو اجاگر کرتا رہتا ہے۔ فنکار کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کہے وہ قاری کے دل میں اتر جائے۔ اگر اسلوب کی تہ تک جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلوب سے مراد فنکار کا طریقہ اظہار ہے جس کے تحت وہ اپنی بات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ **لوکس کے خیال کے مطابق:**

"اسلوب ایک طریقہ ہے جس کے وسیلے سے انسان ایک دوسرے کے افکار اور جذبات میں شریک ہوتے ہیں"[۳۶]

اسلوب کو کامیاب بنانے کے لیے فن کار کی اپنی شخصیت بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ بات زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ صرف نحو پر مکمل عبور رکھتا ہے کہ نہیں بلکہ آپ کے قاری اگر آپ کو پسند کرتے ہیں تو وہ آپ کی تحریروں کو بھی پسند کریں گے اور اگر آپ کے قاری آپ کو پسند نہیں کرتے تو وہ آپ کی تحریروں کو بھی پسند نہیں کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعرا کا کلام ان کے مرنے کے بعد مقبول ہوتا ہے۔ اس لیے قاری ان کی شخصی خامیوں کو بھول کر صرف اس کے کلام کو تحقیق و تنقید کے ترازو میں تولتے ہیں۔ اس لیے کچھ لوگوں کا کلام ان کے مرنے کے بعد مشہور ہو جاتا ہے۔ **پروفیسر لوکس ایک جگہ رقمطراز ہیں:**

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر قبولیت عامہ کا رتبہ حاصل کرے تو آپ کی شخصیت کی اور آپ کی راست کرداری علی الترتیب اچھی اور مسلم ہونی چاہیے جزواًہی سہی جو لوگ اپنی کتابوں کی اشاعت کرتے ہیں وہ لوگوں کی نظروں میں چڑھ جاتے ہیں۔ مصنف اپنی کتابیں تو بیچتے ہیں لیکن اپنی شخصیت کے اسرار بغیر کسی قیمت کے بے نقاب کر دیتے ہیں"[۳۷]

اسلوب میں سب سے زیادہ اہمیت الفاظ کے انتخاب کو حاصل ہے۔ اگر کوئی لکھاری مشکل پسندی سے کام لے گا تو وہ اتنا کامیاب نہیں ہو گا جتنا کہ سلیس اور سادہ زبان استعمال کرنے والا ہو گا۔ الفاظ انسان کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ لہذا ایسے الفاظ کا استعمال کیا جائے جن سے لکھنے والے کا چہرہ واضح نظر آئے۔ جب بھی کوئی فن کار اپنے خیالات کو دوسروں تک منتقل کرتا ہے تو کہیں وہ علامتی انداز اختیار کرتا ہے۔ کہیں ایجاز واختصار سے کام لیتا ہے تو کہیں تشبیہ واستعارات کا سہارا لیتا ہے۔ **نورالحسن ایک جگہ لکھتے ہیں:**

"پہنچا جس وقت میرا مکتوب
زندگی کا بندھا ہے کچھ اسلوب"[۳۸]

اسلوب کا مطلب ہی طور طریقہ، ڈھنگ، روش وغیرہ کے ہیں۔ اسلوب سے مراد کسی بھی فن کار کا وہ انداز ہے جو اس کی ادبی تحریر کا خاصا ہوتا ہے۔ اسلوب مصنف کی شخصیت اور اس کی ذات کلید سمجھا جاتا ہے۔ اسلوب میں سب سے اہم چیز اس کی انفرادیت ہے۔ شاعری میں شاعر انفرادیت قائم کر لیتا ہے۔ مگر نثر میں انفرادیت قائم کرنا بہت مشکل کام ہے۔ نثر میں زیادہ تر نقالی کا خدشہ رہتا ہے۔ اگر اردو نظم و نثر کے اسالیب کی بات کریں تو نظم میں غالب، میر، مومن، ناصر کاظمی، میر انیس یہ ایسے شاعر ہیں جو اپنے مخصوص انداز بیان کی وجہ سے دوسروں سے مختلف مانے جاتے ہیں۔ جبکہ اگر نثر کی بات کریں تو محمد حسین آزاد اور ابوالکلام ایسے فن کار ہیں جن کی نثری تحریروں کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسلوب کسی بھی فن پارے کی جان ہوتا ہے۔ اسلوب کے بغیر فن پارہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ مثلاً میر کے کلام میں جو درد ہے وہ سودا کے ہاں نہیں ہے۔ خواجہ میر درد کے ہاں جو تصوف ہے وہ غالب کے ہاں بلند تخیل ہے۔ مومن کا اپنا ایک عشقیہ انداز ہے۔ یہ سارے اسلوب ہی تو ہیں۔

اسلوب میں اظہار اور ابلاغ کو فروغ دینے میں مقصدیت کا چرچا عام ہوا۔ پھر مرزا غالب نے اس رواج کو بدل کر سلاست و سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ظرافت اور طنز کو اپنی تحریروں میں شامل کر کے ایک نئے اسلوب کا آغاز کیا۔ اس ساری بحث سے جو چیز ہمارے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلوب داخلی و خارجی عناصر کے ملنے سے وجود میں آتا ہے۔ یہی اسلوب اپنے عہد کی زندہ تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ ادب میں اسلوب سے مراد کسی مصنف کا ایک خاص انداز بیان ہے۔ مگر بات یہاں ختم نہیں ہوتی کیونکہ اس حقیقت کو تمام جاننے والوں نے قبول کیا جو اسلوب کے متعلق جانتے ہیں۔ ہر عہد میں مختلف لکھاریوں نے اسلوب کی تعریف اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ مختلف لغات اور انسائی کلوپیڈیا نے بھی اسلوب کو مختلف طرح سے بیان

کرنے کی سعی کی ہے۔ آکسفرڈ انگریزی لغات میں اسلوب کے بہ حثیت اسم ۲۸ معنی اور بہ حثیت فعل ۶ معنی بتاتے ہیں۔ لیکن اسلوب کو جتنا ہی زیادہ کھول کر بیان کیا گیا ہے یہ مسئلہ اتنا ہی زیادہ گھمبیر ہوتا چلا گیا ہے۔ ایسی صورتحال میں اسلوب کا کوئی حتمی معنی بتانا خاصا مشکل کام ہے۔ اطالوی مدبر اور فلسفی کروچے اسلوب کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"جب اظہار وجدان کی برابری کرے تو اسلوب وجود میں آتا ہے"[۳۹]

**انگریز مصنف کویلر کوپ کے مطابق**

"اسلوب بالکل ویسے ہی ہے جیسا کہ دیگر انسانی تعلقات میں اچھی عادتیں"[۴۰]

**ایک اور انگریز کا نقاد کا خیال ہے کہ**

"اسلوب وہ طریقہ کار ہے جس سے فنکار دوسروں کو متاثر کرتا ہے"[۴۱]

اسلوب ایک طریقہ کار ہے جو اظہار کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایک بات کو ڈھنگ سے ادا کرنے کا طریقہ کار اسلوب کے زمرے میں آتا ہے گراہم ہفت کے مطابق:

"زبان خیال کا لباس ہے، اور اسلوب اس لباس کی مخصوص تراش اور وضع ہے۔"[۴۲]

اسلوب پر کوئی رائے قائم کرنا مشکل ترین کام ہے۔ البتہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ Style خیالات کے اظہار کا ایک ایسا سانچہ ہے جو دل کو اچھا لگے اور منفرد بھی ہو۔ ہر ادبی فن پارہ زبان کے سانچے میں ڈھل کر قاری تک پہنچتا ہے۔ زبان کا سانچہ فن کار خود تیار کرتا ہے۔ سانچہ تیار کرنے کے لیے ادیب کے پاس خیالات کی صورت میں خام مواد پڑا ہوتا ہے۔ ادیب اس خام مواد کو ایک خاص شکل دے کر کوئی چیز تخلیق کرتا ہے۔ اس تخلیق کردہ چیز کی حثیت ایک کوڈ (code) کی ہوتی ہے۔ جو زبان و قواعد کی پابندیوں سے جڑی ہوتی ہے۔ ہر ادیب اپنی تخلیق کے لیے کسی نہ کسی میڈیم کا ستعمال کرتا ہے۔ تب جا کر کوئی چیز اصل حالت میں سامنے آتی ہے۔ **گراہم ہفت کہتا ہے کہ:**

"Language is the dress of thought, and style is the particularcut and fession of the dress"[۴۳]

زبان خیالات کا جامہ ہوتی ہے اور اس جامے کو ایک خاص انداز میں تراشنے کا نام اسلوب ہے۔ اس باب میں اسلوب کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اب ادیب سہیل کی منظوم آپ بیتی "غم زمانہ بھی سہل گزرا" کا اسلوبی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔ "غم زمانہ بھی سہل گزرا" ادیب سہیل کی منظوم آپ بیتی ہے۔

اردو ادب میں بہت کم منظوم صورت میں آپ بیتیاں لکھی گئیں ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ اردو ادب میں منظوم آپ بیتیاں نہ ہونے کے برابر ہیں تو کچھ غلط نہیں ہو گا۔ "غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں ادیب سہیل نے اپنی ابتدائی زندگی سے لے کر جوانی اور پھر جوانی سے لے کر آئندہ زندگی کے زیر و بم کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ منظوم شکل میں پیش کیا ہے۔ اس آپ بیتی کو ادیب سہیل نے زندگی کے ایک ایسے مقام پر پہنچ کر ترتیب دیا جب انسان کی تمام دلچسپیاں ماند پڑ چکی ہوتی ہیں۔ ادیب سہیل نے جس عمر میں آ کر قلم تھاما اس عمر میں یاد ماضی کسی خواب کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ اس عمر میں انسان ماضی کے حوادث کو نظر انداز کر کے زندگی کو ایک نئے انداز میں گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب انسان کے کندھوں پر بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے تب انسان زندگی کے خانگی معاملات میں بری طرح الجھا ہوا ہوتا ہے مگر تب بھی ادیب سہیل نے تمام واقعات کو ترتیب دے کر منظوم آپ بیتی بعنوان "غم زمانہ بھی سہل گزرا" لکھ کر ایک بار پھر سے ماضی کے دریچوں میں جھانکا ہے۔ اس منظوم آپ بیتی کو پڑھ کر قاری کو یوں لگتا ہے جیسے یہ کسی نوجوان کی لکھی ہوئی کہانی ہے۔ وہی امنگ وہی ترنگ، وہی احساسات و جذبات جو کسی جوان کا اثاثہ مانے جاتے ہیں ادیب سہیل کی اس منظوم آپ بیتی کا حصہ ہیں۔

"بیاہ کا گھر تھا
اور شہنائی
وقفے وقفے سے شادیانے بجا رہی تھی
گلی سے ایسی صدا جھما جھم کی اٹھ رہی تھی
ہوا نے پاؤں میں جیسے پازیب باندھی ہو"[۴۴]

***

"اور اس کے بعد آیا بیچ میں ایک لمبا عرصہ
جو چار برسوں پر مشتمل تھا
نظر سے او جھل ہوئے تو بھولی تمام باتیں
یہ عمر بھی تو ہے بھولنے کی"[۴۵]

***

"ابھی ابھی تو قدم نکالے تھے راستے پر

کئی برس بعد ایک شادی میں عارفہ پھر ملی
توماں اس کی مر چکی تھی
میں بھی بے ماں کا ہو چکا تھا"[۴۶]

* * *

"کئی برس اور بھی یوں ہی فاصلوں میں گزرے
پھر ایک دن عارفہ کے گاؤں سے ایک حجام
آیا شادی کا رقعہ لے کر
تھا مدعوں، گھر بھر
تو دل میں کیا کیا نہ خوب صورت خیال گزرے
تمام دن رات خواب ہی دیکھتے گزرے تھے
چاہتا تھا یہ جی کہ جو دن روانگی کا کیا ہے گھر والوں نے، مقرر
وہ ایسے سمٹے کہ آج بن جائے"[۴۷]

* * *

خدا خدا کر کے آیا وہ دن بھی
جب کہ دادی کے ساتھ شادی کے گاؤں پہنچا
نظر بچا کر میں پہلے گھر عارفہ کے بھاگا
پتا چلا، وہ یہاں نہیں ہے
یہ سن کر یک لخت بجھ گیا میں
بڑے جتن سے بنے تھے جتنے بھی ریشمی خواب
اُن کے بخیے ادھڑ گے تھے"[۴۸]

* * *

کئی دن بعد اس بجھے دل میں اک ذرا سی ترنگ آئی
جب ایک لڑکی، بیاہ کے گھر، میں ٹکر گئی مجھ سے بچ کر چلنے میں
اور معمول اس کا پھر یہ ہوا کہ آنگن ہو
سائبان ہو یا راہ داری

جہاں کہیں اس نے مجھ کو دیکھا قریب آئی

وہ چاہتی تھی قریب ہونا

***

"میں اس کی چاہت کی دل دہی کرنا چاہتا تھا

اس عارفہ کا میں کیا کروں جو

نہیں ہے پھر بھی ہے پاس ہر دم"[۹۹]

اس منظوم آپ بیتی کا مرکزی کردار ایک معصوم اور خوبصورت لڑکی عارفہ ہے جو شاعر کے ساتھ ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ شاعر ایک لمحہ عارفہ کی محبت سے خود کو غافل نہیں ہونے دیتا۔ شاید یہ اس لیے ہے کہ عارفہ اور ادیب سہیل کی محبت میں کھوٹ نہیں ہے۔ ان دونوں کی معصوم محبت میں پاکیزگی ہے اور ایک دوسرے کا پاس رکھنا بھی ہے۔ عارفہ ادیب سہیل کے ذہن پر پوری طرح چھائی ہوئی ہے۔ ادیب سہیل ایسی محبت کا پابند ہو چکا ہے جس میں کوئی حیلہ یا بہانہ نہیں ہے۔ اس کو اپنی محبت سچ ثابت کرنے کے لیے کوئی جوئے شیر نکالنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس آپ بیتی کی کہانی سے سب کچھ واضح نظر آتا ہے کہ عارفہ اور ادیب سہیل کی محبت کیسی ہے۔ اس آپ بیتی کا آغاز ایک بیاہ والے گھر سے ہوتا ہے جس میں پورا گاؤں شریک ہوتا ہے اور شادی کا بھرپور انداز سے لطف لیا جاتا ہے۔ گاؤں والے نہ صرف شادی میں شرکت کرتے تھے بلکہ تمام گاؤں والوں کی خوشیاں اور غم سانجھے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہو رہی ہے جب عارفہ کی عمر دو اڑھائی برس تھی جبکہ ادیب سہیل سات سال کی عمر میں پہنچ چکے تھے۔ وہاں بہت سی خالاؤں اور پھپھیوں کی بچیاں تھی مگر ادیب سہیل صرف اور صرف عارفہ کو ہی اپنی کمر پر لادے پورا پورا دن گزار دیتا تھا کیونکہ عارفہ سے اس کو فطری محبت تھی۔ وہاں باجے والوں کی اولادیں بھی تھی جو بہت شور کرتی تھی۔ ادیب سہیل ان کے پاس رک کر بڑی توجہ سے ان کے دن بھر کے کاموں کو دیکھتا رہتا اور عارفہ بھی ادیب سہیل کے پاس بالکل خاموشی سے سب کچھ تکتی رہتی کیا مجال اس کو اپنی ماں کی ذرا بھی پرواہ ہو۔ شاید یہ اس لیے بھی تھا کہ بچے کو جہاں سے زیادہ محبت ملتی ہے وہ وہاں سکون محسوس کرتا ہے۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ ہوا اتنی گرم تھی کہ یوں محسوس ہوتا جیسا کہ جسم گھل کر زمین بوس ہو رہا ہے۔ ایسے موسم میں شام کو مہندی کی رسم ہونا باقی تھی دور و نزدیک کے تمام مہمان آچکے تھے۔ ادھر ادیب سہیل کی ماں ادیب سہیل کو دالان میں سلا کر گئی تھی کہ بچے کو گرمی سے بچایا جائے۔ ادھر سے ادیب سہیل کی چچی جو عارفہ کی والدہ تھی وہ آئی اور عارفہ کو میرے پاس لیٹا

کر چلی گئی اور مجھے ایک پیکٹ چاکلیٹ کا دے کر گئی اور کہا کہ اسے سنبھالو یہ تمہاری دلہن ہے۔ گرمی زوروں پر تھی۔ گرمی کی شدت سے عارفہ بے چین ہو کر جاگ گئی اور عارفہ کو میں اپنی کمر پر لاد کر دوبارہ شادی والے گھر جا پہنچا جہاں سارے شادیانے بجارہے تھے میں بھی شریک ہو گیا۔ اس کے بعد شادی جب ختم ہوئی تو حسب معمول سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیے ہم بھی اپنے گھر آگئے اور پھر چار سال تک کا درمیان میں وقفہ بن گیا۔ ماضی کی تمام یادیں بڑی شدت اختیار کر چکی تھیں لیکن عارفہ سے ملاقات کا کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا خیر وقت کٹتا رہا اور ہم کاٹتے رہے۔ درمیان چار سال بعد ایک اور شادی آگئی اور عارفہ سے ملاقات ہو گئی۔ شاعر کہتا ہے ملاقات کیا تھی اس ملاقات نے مجھے اور بھی زیادہ بے چین کر دیا تھا۔ مجھے اس شادی میں پتہ چلا کہ عارفہ کی والدہ اور میری چچی اس دار فانی کو چھوڑ گئی ہیں۔ میں بھی بغیر ماں کے زندگی گزار رہا تھا مگر مجھے عارفہ کا دکھ زیادہ محسوس ہوا۔ عارفہ کے والد نے جب مجھے دیکھا تو آواز دے کر مجھے اپنے پاس بلایا اور گلے لگا کر ایک بار پھر عارفہ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور عارفہ کا خیال رکھنے کی نصیحت کی۔ میں اور عارفہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے گاؤں کی پگڈنڈیوں پر ہو لیے۔ یہ گاؤں میرے اور عارفہ دونوں کے لیے نیا تھا۔ اس میں کوئی ڈھنگ نہ کوئی دکان تھی اور نہ ہی کھانے پینے کا کوئی اور انتظام۔ میں چاہ رہا تھا کہ عارفہ کی خوب خدمت کی جائے مگر خدمت کے لیے کچھ نہیں تھا۔ خیر ایک گھر کے باہر ایک امرود کا درخت دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ جھٹ سے میں امرود پر چڑھا اور عارفہ کے لیے بہت سے امرود توڑ لایا امرود دے کر ہم دونوں آگے بڑھے اور راستے میں ایک پنساری کی دکان نظر آئی میں نے اس دکان سے چاکلیٹ کا پیکٹ خرید کر عارفہ کو پیش کیا عارفہ بہت خوش ہوئی ہم سارا دن گاؤں کی خاک چھان کر شام کو جب واپس گھر آئے تو بہت تھک چکے تھے۔ ہم نے بھی وہ کھانا کھایا جو باراتیوں کے لیے لگایا گیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد عارفہ بڑے چچا کے پاس سو گئی اور میں بھی وہی سو گیا۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو عارفہ کے پاؤں میری پیٹ پر تھے۔ اتنے میں سننے کو آیا کہ اب دلہن کو رخصت کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ بڑے چچا عارفہ کو اپنے ساتھ لے کر بس میں بیٹھ گئے اور عارفہ ہاتھ ہلاتی ہوئی باراتیوں کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ شاعر لکھتا ہے کہ اس کے بعد مجھ میں اور عارفہ میں پھر سے لمبے عرصے کے لیے جدائی پڑ گئی۔ کافی عرصہ گزرنے کے بعد پھر ایک حجام کسی اور شادی کا رقعہ لے کر آیا جس میں پھر سب گھر والوں کو دعوت تھی۔ یہ شادی بھی عارفہ کے گاؤں میں تھی۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں بہت زیادہ خوش تھا۔ اب میرے دن عارفہ کے گاؤں کے خیالوں میں گزرنے لگے۔ میں چاہتا تھا کہ شادی کا دن آج بن جائے اور میں اڑ کر عارفہ کے گاؤں پہنچ جاؤں۔ میرے خیالوں میں آج کل صرف اور صرف عارفہ کے

خیالوں کا ہی بسیرا ہے اور خیالوں میں بھی عارفہ کے گلی کوچوں میں گزرتے ہوئے لطف آتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ خدا خدا کر کے آخر وہ دن آن پہنچا جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ میں اپنی دادی کے ساتھ عارفہ کے گاؤں شادی پر جا پہنچا اور سیدھا عارفہ کے گھر جا نکلا معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گے تھے۔ بعد میں جب میری عارفہ کے سات ملاقات ہوئی تو سب کچھ بدلا بدلا معلوم ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہی تھی مگر کہ بھی نہیں سکتی تھی شاید اس کو کسی چیز کا ڈر لگ رہا تھا۔ وہ نظروں ہی نظروں میں اپنا حال دل مجھے بتا گئی تھی۔

"قیام جتنے دن رہا عارفہ کے گاؤں میں
اتنے دن اس نفیس لڑکی کا وقت گزرا تھا میری قربت میں
بہت ہی خوش تھی وہ مجھ سے مل کر
قریب رہنے کا کوئی موقع جانے نہ دیتی تھی ہاتھ سے وہ
یہ چاندنی چار دن کے راست میں آئی
آکر بچھڑ گئی تھی
مگر وہی عارفہ تھی آنگن میں چاند بن کر"[۵۰]

٭٭٭

"ہوا یہ پھر شوخ وشنگ لڑکی نے
مجھ کو نامہ لکھا
جدائی کے سارے جذبوں کا اک مرقع
کئی مہینوں کے بعد پھر پتہ لگا
شوخ وشنگ لڑکی
بیاہ کر آگئی ہے میرے ہی رشتے داروں میں
اور خوش ہے"[۵۱]

٭٭٭

"انھی دنوں میں ایک دن میرے ابا دادی سے ملنے آئے
بہانہ ملنے کا تھا
مگر ان کے سر میں لالچ سما گیا تھا

وہ میری دادی سے کہہ رہے تھے
زعیم کی بیٹی صائمہ سے تم اپنے پوتے کا رشتہ کر دو
زعیم کی وہ اکیلی اولاد ہے
بھرے دل میں اس کے ارمان ہے
دے گا داماد کو وہ ہر چیز اس کے مانگے بغیر"[۵۲]

***

اور پھر
انھوں نے مجھ سے کہا وہ سب کچھ
جو پہلے دادی سے کہہ چکے تھے
تو میں خود ان کی بات دہرائی ان کے آگے
تھے جس پہ نازاں
بڑی محبت سے مجھ کو کہتے رہتے تھے اکثر
مجھے نہیں چاہیے جہیز"[۵۳]

***

"میرا بھی احوال کچھ عجب تھا
کہ ایک مدت سے اس کو دیکھا نہیں تھا
کیسی ہے
کس طرح وہ شباب کے مرحلے میں داخل ہوئی ہے
کیوں کر بہار آئی ہے
مگر میں ایمان اس پر لائے ہوئے تھا
یہ بات میری اور عارفہ کی دادی کے درمیان ایک وعدہ بن کر پنپ رہی
تھی"[۵۴]

کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ عارفہ سے محبت صرف ادیب سہیل کو ہی نہیں تھی بلکہ عارفہ بھی ادیب سہیل کی محبت میں گرفتار تھی مگر اپنے بزرگوں کی پگڑیوں کا مان رکھتے ہوئے وہ خاموش تھی۔ ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عارفہ نے بھی مجھے خط لکھ ڈالا اور اس خط میں جدائی کی کرب ناک

کہانی کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا۔ محبت میں دو دلوں کے ملنے اور بچھڑنے کا تذکرہ کیااور کہا کہ ہجر و فراق عشق میں لازم وملزوم ہیں۔ ان کے بغیر عشق کا تصور ممکن ہی نہیں ہے۔ مگر میں کہ ایک طرف عارفہ ہی کو اپنی کل کائنات سمجھے زندگی گزار رہا تھا۔ یہاں ادیب سہیل ہر لحظ عارفہ کی خوشحالی کی دعا کرتا ہے۔ انھی دنوں میں ایک دفعہ میرے والد صاحب کی ملاقات میری دادی جان سے ہوئی۔ دونوں ایک ایسے مسئلے پر محو گفتگو تھی جس کو سن کر مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ دونوں کے دل و دماغ میں لالچ سمایا ہوا تھا۔ وہ زعیم کی بیٹی صائمہ کو میری دلہن بنانا چاہتے تھے۔ چونکہ صائمہ زعیم کی ایک ہی اولاد تھی کہ دونوں کا خیال تھا کہ زعیم جب اپنی بیٹی کی شادی کرے گا تو خوب مال و دولت اور جہیز دے گا۔ میں سب کچھ سن کر بہت مایوس ہوا۔ کیونکہ ایک طرف مال و دولت تھااور دوسری طرف میری محبت عارفہ تھی۔ میں اپنی محبت کو ہر گز نہیں کھونا چاہتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ میں صرف عارفہ کو اپنے محل کی ملکہ بنا کر لاؤں اور دن بھر کام کاج سے فارغ ہو کر جب گھر لوٹوں تو آگے عارفہ کا گلاب جیسا حسین چہرہ میرے سامنے ہو جس کو دیکھ کر میں دن بھر کی تھکن کو بھول جاؤں۔ اس لیے مجھے زعیم کی بیٹی صائمہ سے نہیں بلکہ عارفہ سے شادی کرنی ہے۔ میں اگر مال وزر کے لالچ میں آکر صائمہ سے شادی کرلیتا ہوں تو یہ مال و دولت دھوپ چھاؤں کی مانند ہوتا ہے آج اگر ہے تو کل نہیں۔

"پھر ایک شادی پہ اک برس بعد
جب اچانک ہوئی ملاقات عارفہ سے
تو یہ حال تھا
نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن
کہ دونوں ایک دوسرے کے آگے کھڑے ہوئے تھے
وہ مجھ کو حیرت سے دیکھتی تھی
میں اس کو حیرت سے دیکھتا تھا"[۵۵]

***

"ایک اور شب کسی ضرورت سے گھر میں آیا
تو عارفہ محوخواب اسارے میں تھی پلنگ پر
اور اس کی پائنتی میں اس کی دادی سو رہی تھی

عجب منظر تھا اس کے سونے کا

چاندنی اس کی نصف پیکر پہ پڑ رہی تھی

اور چاند چہرے کا حسن جادو جگا رہا تھا"[۵۶]

* * *

"کئی دنوں بعد۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک دن جب

خلاف معمول جب عارفہ میرے گھر آئی

اور اپنے ابا کا خط دیا

جس میں یہ ہدایت تھی میری خاطر

کہ خط ملتے ہی چل پڑوں میں

کہ مجھ کو کالج میں داخلہ مل گیا ہے بروقت"[۵۷]

* * *

"یہ شہر کلکتہ میرے خوابوں کی سرزمیں تھا

تھا جس گلی میں قیام میرا

نام گم گھر تھا اس گلی کا

سو گم رہی تھی

بہت سے دروازے اور کھڑکیاں اس میں کھل رہی تھی"[۵۸]

* * *

"ہمارے نیچے تھا ایک پروالا

اس کی پہچان تھا یہی عرف

سن رسیدہ تھا

بیڈ منٹن کے کارک دن بھر بناتا رہتا تھا

رات کو ٹھڑا پی کے گاتا تھا ہیر"[۵۹]

میری اور عارفہ کی ملاقات کو ایک سال پھر گزر گیا تھا۔ کسی جگہ ہماری ملاقات پھر اچانک ہونا قرار پائی۔ ہم دونوں نہ زندوں میں تھے اور نہ مرنے والوں میں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے بالکل بے جان پتھر کی طرح کھڑے ہو گئے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو مسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے

مگر نہ وہ کچھ بولنے کی ہمت کر رہی تھی اور نہ ہی میں کچھ کہ پا رہا تھا۔ خاموشی اس قدر تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے حالات کو خوب سمجھ سکتے تھے۔ ہم دونوں سر سے پاؤں تک مکالمہ کر رہے تھے۔ میں اس کے بچپن کا پھر سے متلاشی تھا مگر مجھے اس کا بچپن کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بچپن جس نے میری انگلی پکڑ کر گلی گلی کی خاک چھانی تھی۔ وہ بچپن اب جوانی میں سمٹ گیا تھا۔ ادیب سہیل ایک جگہ عارفہ کے سونے کے منظر کو بڑے احسن طریقے سے بیان کر رہا ہے وہ کہتا ہے کہ میں ایک رات جب کسی ضروری کام سے گھر لوٹا تو میں نے دیکھا کے عارفہ گھر کی دہلیز پر سوئی ہوئی تھی۔ دوسری جانب اس کی دادی بھی بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ اس رات چاند پورے جوبن پر تھا اور چاندی عارفہ کے آدھے جسم پر پڑ رہی تھی۔ جب چاندنی اسکے چہرے پڑی تو معلوم ہوتا گویا چہرہ نہیں بلکہ خود چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ میں نے جب اس منظر کو دیکھا تو غیر ارادی طور پر میرے دل نے چاہا کہ عارفہ کے چہرے کو چوما جائے سو میں نے اس کے حسین چہرے کو بوسہ دے دیا۔ وہ مکمل سوئی ہوئی تھی کہ نہیں اس چیز کا مجھے علم نہیں۔ میں بھی اپنے بستر پر جا پڑا اور عجب سوچوں اور خیالوں میں گر گیا جب صبح میری آنکھ کھولی تو دن آدھا گزر چکا تھا۔ میں اور عارفہ دنوں زندگی گزار رہے تھے کہ ایک دن خلاف معمول عارفہ ہاتھ میں اپنے والد کا رقعہ تھامے آئی اور وہ مجھے دے دیا۔ جس میں لکھا تھا کہ مجھے کالج میں داخلہ مل گیا ہے خط پڑھ کر میں کالج کے لیے ابھی نکل پڑوں۔ جب میں دوسرے دن گھر سے کالج کے لیے نکلا تو عارفہ کافی مضطرب تھی اس نے اپنی نظریں چراتے ہوئے مجھ سے کہا کہ اس دن تم نے مجھے سویا ہوا دیکھ کر میری پیشانی کو چوما تھا تم اس کو بھول نہ جانا۔ ادیب سہیل ایک جگہ کلکتہ شہر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ ایک ایسا شہر ہے جس سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ ہم لوگ جس گلی میں مکین تھے اس گلی کا نام گم گھر تھا۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں شہر کے بہت سے دروازے اور کھڑکیاں اس میں کھلتی تھی۔ ہم جہاں رہ رہے تھے ہمارے نیچے ایک پروالا بھی مشہور تھا۔ وہ دن بھر اپنے کام میں مشغول رہتا تھا وہ دراصل بینڈ مٹن کی جھال بنایا کرتا تھا۔ دن بھر کام سے فراغت پا کر شام کو وہ گھٹیا قسم کی شراب پیتا تھا

***

"وہ ایک کرسچن نژاد لڑکی

اس گلی میں

ذرا پرے میرے گھر سے رہتی تھی

پانچ بہنوں کے ساتھ

چھوٹی تھی سب سے

سب سے الگ تھلگ تھی"[۶۱]

***

"وہ گھر جہاں ہم قیام کرتے

وہ گھر کی دیوار

جس میں باہر سے ایک کھولی سی کھل رہی تھی

اس میں رہتا تھا ایک نیپالی جوڑا

دونوں میں تھی رفاقت بلا کی"[۶۲]

***

"شباب پر عالمی لڑائی تھی

ہر بڑا شہر اس کی زد میں

حریف بمبار اس کے سر پر منڈلا رہے تھے

پروں میں بموں کے باندھے

زمین پر بھوک اور قحط کے

ناچتے تھے عفریب

آگ اور خون کا کھیل جاری

ہمارے کلکتہ شہر کا عجب تھا نقشہ"[۶۳]

پر والی کرسچن لڑکی ہیر کو بہت غور سے سنا کرتی تھی۔ وہ بعض اوقات وہ موج میں آکر گاتے گاتے ردی کی ٹوکری کو کریدنا شروع کر دیتا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی جو طلاق یافتہ تھی۔ وہ اپنے رانجھے کی تلاش میں ہمیشہ گرم سفر رہتی۔ اس کا بدن اس کے سنبھالنے سے باہر ہو چکا تھا۔ وہ ہر کسی سے ہنس ہنس کر ملا کرتی تھی۔ مگر مجھ سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئی تھی۔ وہ ایک عید کے موقع پر مجھ سے گلے ملی تھی۔ اس کا اور میرا یہ ملنے کا عمل جمیلہ پھوپھی نے بھی دیکھ لیا تھا جو بہت شرمندہ ہو گئی تھی۔ میں بھی آج تک اس ملاقات کو نہ بھلا پایا۔

"ہمارے کمرے میں صاف پہروں دیکھائی دیتی تھی

ایک لڑکی

جو صبح سے شام تک
اس رخ پر اپنی آنکھیں لٹکائے
رہلنگ سے گھورتی تھی
نظر بھی لڑتی تھی
دل بھی کھلتا تھا"[۶۰]

***

"مجھے ہے یاد ایسا ایک منظر
زمانہ انیس سو تینتالیس عیسوی کا
اک کئی منزلہ عمارت
بھری کھچا کھچ تھی فرنگی، فوجیوں سے اس دم"[۶۴]

***

"نہ جانے کب یہ محفل رقص و رنگ چلتی
کہ سائرن کی صدا نے اس میں فساد ڈالا
بچاؤ کے واسطے سبھی آئے نچلی منزل کی سیڑھیوں میں
جو خود بھی شیلٹر سے کم نہیں تھیں"[۶۵]

شاعر یہاں "گم گھر" کے ایک گھر کی منظر کشی کرتا ہے جہاں سے سب کچھ صاف دکھائی دیتا تھا۔ ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی ہمارے کمرے سے واضح دکھائی دیتی تھی وہ بڑی بے چینی کے عالم میں صبح سے شام تک ٹکٹکی لگائے ہماری طرف دیکھتی رہتی تھی۔ اس کا خاوند جو بہت عمر رسید تھا یہ لڑکی اس کی چوتھی بیوی تھی۔ بہت عرصے بعد یہ راز کھلا کہ عمر رسیدہ شخص کی یہ چوتھی بیوی ہے۔ اس گلی کی نکڑ پر ایک کرسچن لڑکی کی قیام گاہ بھی تھی۔ اس کے گھر میں اس کی پانچ بہنیں بھی رہتی تھی وہ سب سے چھوٹی تھی۔ وہ ہر روز شام کو بھاگ کر میری پھوپھو کے پاس آجاتی تھی کیونکہ شام کو امریکی فوجی ان کے گھر آیا کرتے تھے اور اس کرسچن لڑکی کو وہ فوجی بالکل بھی پسند نہیں تھے۔ ہمارے گھر میں آتے جاتے اس کی سلام دعا قمر سے بھی ہو گئی تھی۔ قمر میرا لنگوٹیا یار تھا۔ ایک دن اس کرسچن لڑکی نے قمر سے کہا کہ میرے کوٹ کا پچھلا بٹن بند کر دو۔ قمر اس کا بٹن بند کرتے کرتے کافی دیر کر گیا تھا۔ اسی کرسچن لڑکی کے اوپر والے تین کمروں میں چندر قاصائیں رہتی تھیں۔ وہ فوجیوں کے لیے رقص کرتی تھی۔ یہاں الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ یہ لوگ ساری ساری رات جاگتے رہتے تھے اور

پورا پورا دن سوئے رہتے تھے۔ شام کو سارے لوگ چھت پر آجایا کرتے تھے۔ مرد حضرات پتنگیں اڑایا کرتے تھے اور عورتیں مسخرا اڑایا کرتی تھی۔ شام کا یہ وقت لطف لینے کے لیے بہت اہم تھا۔ جب کبھی کوئی دل پھینک نوجوان لڑکا جو مغنی ہوتا تھا آجاتا تو محفل میں ایک دم سے پھر جوش آجایا کرتا تھا۔ ہمارا کمرا ایسی جگہ تھا جہاں سے یہ منظر واضح دیکھائی دیتا تھا۔ جس کمرے میں ہم رہ رہے تھے اس کمرے میں ہم سے پہلے ایک ایسا شخص رہتا تھا جو ان حسین نظاروں کو دیکھتا رہتا تھا اور جب محفل برخاست کی جاتی تو وہ تیز و تند خیالوں میں خود کو ڈال کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا تھا۔ جس گھر میں ہم قیام کر رہے تھے سامنے والے مکان میں ایک نیپالی جوڑا بھی رہتا تھا جو آپس میں بہت انس رکھتے تھے۔ ان دونوں کا ردی کا کام تھا۔ وہ دن بھر ردی اکھٹی کرتے تھے اور اس ردی کو ترتیب میں لگا کر ایک آڑھتی کے ہاتھوں فروخت کر دیتے تھے اور جو کچھ پیسے اکھٹے ہوتے ان سے گزر بسر کرتے تھے۔ ان کی قیام گاہ میں ہر طرف کاغذ ہی کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ یہ کاغذ میری زندگی کے لیے بہت کارگر ثابت ہوئے ہیں۔ میں اکثر ان کے گھر جاتا اور وہاں سے کچھ کتابیں اور جریدے ڈھونڈ کر نکالتا۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرنے سے مجھے پتہ چلا کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ سوال اندر سوال کے اس سلسلے نے مجھے جلا بخشی۔ یہ ردی کے کام کرنے والے جوڑے کی قیام گاہ میری پہلی درس گاہ ہے۔ جس نے مجھے فہم و فراست بخشی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب بھوک اور افلاس نے ہماری زندگیوں کو اجیرن کر دیا تھا۔ قحط نے انسان کی موت کو بہت سستا کر دیا تھا۔ یوں سمجھئے کہ آگ و خون کا کھیل ہو رہا تھا۔ اس وقت کلکتہ شہر کا تاریخی نقشہ مسخ کے رکھ دیا گیا تھا۔

ہر طرف بے بس انسانوں کا ہجوم تھا لوگ سڑکوں کے کناروں بے جان پڑے روٹی کے نوالوں کو ترس رہے تھے مگر اس وقت ہر کسی کو اپنی اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ تب کوئی بھی ایک دوسرے کا پرسان حال نہیں تھا۔ اگر کوئی ہوائی جہاز مدد کے لیے آتا تو آسمان پر سے اپنا بچا ہوا کھانا اہل کلکتہ کے لیے پھینکتا تو بے حسی کا یہ عالم تھا کہ انسان کتوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑنا شروع ہو جاتے تھے۔ یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے جب حملہ آور فوجی ایک بڑی عمارت میں تفریح کے لیے آتے تھے اور مجبور عورتیں سکوں کے عوض رقص سے ان کو لطف دیتی تھی۔ وہ جب جیب سے سکے نکال کر ہوا میں پھینکتے تو وہ عورتیں ان کو زمین پر پڑنے سے پہلے ہی لوٹنا چاہتی تھی مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ایک طرف قحط نے لوگوں کو بے حال کیا ہوا تھا جبکہ دوسری طرف انگریز حکومت اپنا انتقام جاری رکھے ہوئے تھی اور انگریز ہزاروں ٹن غلہ سپرد دریا کر کے خوشیاں منا رہے تھے۔ وہ آزادی پسندوں کے سر کچل دینا چاہتے تھے۔ ایک طرف ننگ دھڑنگ انسان زندگی کی آخری

سانسیں لے رہے تھے جبکہ دوسری طرف بے حس انگریز آئے روز رقص و سرود کی محفلیں جمائے ہوئے تھے۔ ان محفلوں کا حصہ کلکتہ شہر کے بڑے بڑے رئیس بھی جن میں حاجی شفیع اور ملا جان کا شمار ہوتا ہے۔ اس زمانے کی مشہور رقاصاؤں میں القاب اور مہتاب کا شمار ہوتا ہے۔ یہ دونوں محفل میں خوب رنگ بھرتی تھیں۔ کئی من چلے اپنا دل محفل میں پھینک آیا کرتے تھے۔ ہر آدمی کا اپنا ایک خاص انداز داد ہوا کرتا تھا۔ کئی لوگ ہونٹوں میں نوٹ دبا کر بطور داد ان کو دیا کرتے تھے اور کئی سونے کی زنجیریں ان پر وار آیا کرتے تھے۔ محفل پوری طرح آب و تاب سے چل رہی تھی کہ خطرے کی گھنٹی بجی سب لوگ بھاگ کر اپنے اپنے گھروں کو چل نکلے کہ کہیں کوئی دشمن کا جہاز پھر سے حملہ کرنے نہ آگیا ہو۔

"یہ شہر جیسے تھا ایک زنجیر
جس کے پابند لاکھوں انسان
حصولِ روزی کے واسطے
اس کی لاکھوں کڑیوں سے خود کو وابستہ کیے ہوئے تھے"[٦٦]

***

"تھی واقع ہی دلی دور!
یہ شہر
میرے قرب وجوار سے یوں کٹا ہوا تھا
کہ ایک بھی شخص
اپنے رشتے کا
اپنے اطراف کا نہیں تھا
بہت دنوں تک تو حال یہ تھا
سوال یہ تھا
کہ اپنے فرصت کے دنوں کو میں کس طرح گزاروں"[٦٧]

***

"میں جب بھی دلی میں لال قلعے میں گیا
تو دل میں سرور اپنائیت کا اٹھا
لگا کر قلعے کی راہ داری میں

گیتی آرا کے ساتھ شجاع مل جائیں گے
محبت سے یہ کہیں گے کہ
کیسے آنا ہو عزیزم!"[۶۸]

***

"خیال کا کیا
ابھی یہاں ہے، ابھی وہاں ہے
کسی کے بس میں نہیں ہے اس کی اڑان
آزاد اک پرندہ
سہا ہوا جیسے
کہ اس پہ سائے کرے بن جائے وہ تونگر"[۶۹]

ادیب سہیل کلکتہ شہر کا نقشہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ کھینچ رہے ہیں کہ صبح جو ہی ہوتی ہے تمام اہل شہر روزی روٹی کے چکر میں بڑام پر سوار ہو کر شہر کے مختلف حصوں کی طرف نکل پڑتے ہیں۔ یہ زمانہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا جب موت ہر وقت انسانیت کے سروں پر منڈلا رہی تھی نہ جانے کس سے کوئی طیارہ موت کا سامان لیے آجائے گا اور بمباری کر کے کئی لوگوں کو موت کی گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ کلکتہ شہر گنجان آباد شہر تھا مگر حادثات نے اس شہر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ لوگ اپنے دفتر دہلی میں منتقل کر رہے تھے۔ مجھے بھی حالات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کلکتہ کو چھوڑ کا دہلی کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ یہ فیصلہ میرے لیے بہت مشکل فیصلہ تھا مگر حادثات ہجرت کو جنم دیتے ہیں اور ہجرت ضروری امر تصور کی جاتی ہے۔ دہلی اور کلکتہ کا آپس میں فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ میں جب اس شہر میں پہنچا تو میرے آس پاس کوئی بھی رشتہ دار یا جاننے والا نہیں تھا۔ میں اپنا وقت انسانوں کے جنگل میں بڑی مشکل سے گزار رہا تھا۔ میں نے کلکتہ کے برائے نام آدمی کی تلاش شروع کر دی تھی۔ میرے ذہن میں دہلی کے لال قلعے کا ایک نقشہ آرہا تھا۔ جس میں جوارہ کی ایک شاہ زادی کے شوہر قاضی شجاع تھے جو دہلی کے صدر الصدور تھے۔ ان صاحب کا تعلق میرے اباؤ اجداد سے تھا۔ میں جب دہلی قلعے پہنچا تو مجھے اپنائیت کا احساس ہوا کہ جب میری ملاقات بنت رفعت النسانیت بادشاہ شاہ عالم ثانی گیتی آرا سے ہو گی تو صدر الصدر جناب قاضی شجاع مجھے پکاریں گے کہ عزیزم تمھارا آنا کیسے ہوا؟ تو مجھے یہ سب بہت اچھا

لگے گا۔ کلکتہ تاریخی اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا حسن دیکھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ یہی وہ جادو تھا جس نے غالب جیسے عظیم شاعر کو بھی فتح کر لیا تھا۔

کلکتہ ایسی جگہ ہے جہاں میری زندگی کے حسین مہ و سال گزرے تھے۔ اس شہر میں میرے خوابوں کی رانی میری پہلی محبت عارفہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت عارفہ چھ سال کی تھی جبکہ میری عمر گیارہ سال تھی۔ ہم ایک شادی میں ملے تھے اور ملتے ہی ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر ہو گئے تھے۔ ہماری دادیاں ہمیں دعائیں دیا کرتی تھیں کہ اللہ ہمارے بچوں کو سلامت رکھے۔ ایک دن جب میرا گزر صحن سے ہوا عارفہ مست حالت میں خوابیدہ تھی۔ میری نظر جب عارفہ پر پڑی تو مجھے لگا کہ چاند آسمان سے اتر کر زمین پر آگیا۔ میں جب سے کلکتہ چھوڑ کر دہلی آیا میری یادوں میں عارفہ بستی تھی۔ میرے اور عارفہ کے گھر والوں کے درمیان رابطہ رہتا تھا۔ جب کبھی اس کے گاؤں سے کوئی آدمی آتا تو بڑی محبت بھری زبان میں اس کے گاؤں کی داستان سناتا۔ سن کر مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میں اکثر تخلیاتی دنیا میں محو رہتا۔ مگر خیالوں کا کیا وہ تو آزاد پرندوں کی طرح ہوتے ہیں اور آتے جاتے رہتے ہیں۔ خیالات اچانک آکر سوچوں کے وزن میں اضافہ کر دیا کرتے ہیں۔ ایک دن مجھے ایک گھر یاد آنے لگا جس میں فیاض، حسن زہرہ جمال آرا رہتے تھے۔ ان لوگوں سے میری وابستگی بہت زیادہ تھی اس لیے مجھے اپنا گھر بھی کم کم یاد آتا تھا۔ یہ لوگ ایک خوشحال گھرانے کے چشم و چراغ تھے مگر ایک ایک کر کے ان کے سرپرست ان کو چھوڑ کر گزر جا چکے تھے۔ ان لوگوں کی پرورش میں اخلاص، احساس، محبت و احترام بھر دیا گیا تھا۔ حسن زہرہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ جمال آرا بھی حسن وناز کی میں کسی سے کم نہیں تھی۔ میں حسن زہرہ کی شادی میں بھرپور انداز میں شریک ہوا۔ میری زندگی کا یہ پہلا تجربہ تھا جب میں حسن آرا کی شادی میں پہلی بار پنجاب گیا تھا۔ پنجاب کے لوگوں کے حسن، رنگت اور جسامت نے کافی زیادہ متاثر کیا۔ ساحر لدھیانوی کا یہ شعر بہت زیادہ میری توجہ کا مرکز بنا رہا۔ حسن زہرہ کی شادی میں گیا تو گھر کی تیسری منزل پر ایک آرام دہ کمرا ملا جس میں ضرورت کی ساری چیزیں موجود تھیں۔ جمال آرا میری خدمت میں کوئی کسر نہیں رکھتی تھی۔ اس کو معلوم تھا کہ میں کبھی کبھی شعر و شاعری بھی کرتا ہوں۔۔۔۔ سو اس نے میری دلچسپی کے عین مطابق قلم، دوات اور کاغذ قریب رکھے ہوئے تھے۔

”سسر تھا زہرہ کا اپنا ماموں

جو اس علاقے کا ذی جاہ آدمی تھا

بلند تھے حوصلے ریوں کو قدم قدم لٹارہ تھا

بارات کے ساتھ رقص ورامش کا اک حسیں اہتمام بھی تھا"۷۰

* * *

"جب آیا بزم نشاط سے میں نکل کر اپنی قیام گاہ پر

ابھی جو کچھ دیر پیشتر

پھر رہے تھے گلیوں میں بن سنور کر

جہاں تہاں تھے سکوت کی سیج پر

وہ سوئے ہوئے بکھر کر

بغیر پالش بغیر بستر

سنوارنا تو خوب تھا ہی لیکن

بکھرنا بھی دیدنی تھا ان کا"۷۱

* * *

"وہ آٹھ برسوں کی بھولی بھالی حسین لڑکی

جسے میں پریمی پکارتا تھا

وہ میرے کمرے کے روبرو ایک گھر میں رہتی تھی

مجھ سے حد درجہ ہل گئی تھی

پچاس برسوں کے بعد بھی میں

جسے نہ اب تک بھلا سکا"۷۲

* * *

"گیا کبھی لال قلعہ جو تھوڑی دیر کو

بوریت کے لمحے رنگ بھرنے

تو لال قلعہ کے صحن وایواں میں محو گُل گشت

گل رخوں کے ہجوم میں عارفہ کھڑی

شہ نشیں کی تحریر پڑھ رہی تھی"۷۳

حسن زہرہ کی شادی اپنے ماموں کے گھر ہوئی تھی۔ اس کا ماموں بہت دولت مند اور بڑا آدمی تھا۔ شہر کا بچہ بچہ اس کے نام اور کام سے واقف تھا۔ برات کے ساتھ ساتھ محفل موسیقی اور رقص کی محفل کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ محفل ایک دو منزلہ عمارت کے خوبصورت ہال میں منعقد کی گئی تھی۔ اس محفل کو چار چاند

لگانے والیوں میں سریلی آواز والی نغمہ گر شامل تھیں۔ جو بڑی خوبصورتی کے ساتھ خود کو تیار کر کے خود کو رقص کے لیے پیش کرتی تھیں۔ ان رقاصاؤں میں ایک دراز قد لڑکی نائلہ بھی تھی مجھے فیاض نے اشارہ کر کے بتایا کہ یہ نائلہ ہے جو ماموں کی جاننے والی ہے۔ جس کو ماموں نے بغیر نکاح کے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ یہ یہاں کی مشہور گائکہ ہے۔ اس محفل میں جہاں شہر کے بڑے بڑے لوگ شریک تھے وہاں علاقہ عیش فیروز بھی تشریف رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے شاگرد خاص تاجور نجیب آبادی بھی آئے ہوئے تھے۔ نائلہ نے جب غزل سرائی کا آغاز کیا تو آواز بلند ہوئی سب کے دل زوروں سے دھڑکنا شروع ہو گئے تھے۔ کیونکہ نائلہ کی آواز میں معشوقانہ ادا تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے بڑے بڑے شہری نائلہ کی آواز میں گم ہو گئے تھے۔ نائلہ اتنی حسین نہیں تھی وہ سانولی سلونی تھی مگر آواز میں جادو تھا وہ سب کو نائلہ پر فدا ہونے کے لیے امادہ کر دیتا تھا۔ نائلہ نے آواز اٹھائی تو یوں لگا کہ جیسے پیسوں کی بارش ہو رہی ہے۔ ہر ایک شخص بڑھ چڑھ کر پیسوں کی بارش کر رہا تھا ایسے جیسے ثواب کا کام ہے۔ ایک طرف رقص اور پیسوں کی بارش ہو رہی تھی و دوسری طرف اچھی قسم کی شراب تقسیم کی جارہی تھی۔ خدمت گار محفل میں آنے والے ہر مہمان کو مے کا تحفہ پیش کرتے کوئی بھی شخص ایسا نہیں تھا جو شراب کے نشے میں دھت نہ ہو۔ ایسے عالم میں فیاض نے مجھے کہا کہ یہی بہتر ہے کہ ہم محفل کو چھوڑ کے چلے جائیں۔ ہم نظریں چرا کر بچتے بچاتے جوں ہی عقب کے دروازے سے اترنے لگے تو آگے فیاض خان کے ماموں نشے میں سرشار کھڑے تھے اور کہنے لگے کہ ابھی تو محفل میں جوانی کا عالم ہے اور تم محفل برخاست کر چلے ایسے تو نہیں ہو گا۔ یہ کہہ کر تازہ نوٹوں کی گڈی دے دی کہ تم بھی محفل میں رنگ بھرو۔ مجھے وہ ساتھ ساتھ ایک کمرے میں لے گے اور رکنے کا کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مالٹا کی ایک بوتل اور دوسرے ہاتھ میں ایک حسین پری میری خدمت میں پیش کی اور اس پری سے کہنے لگے کے آج کی رات کہ یہ ہمارے سب سے بہترین مہمان ہیں ان کی خدمت میں کوئی کمی باقی نہیں رہنی چاہیے۔ اس لڑکی نے رات بھر محفل میں رنگ بھرا۔ اس نے پہلی دفعہ شراب کا رنگ میرے ہونٹوں تک پہنچایا تھا۔ اس رات مجھے یوں لگ رہا تھا کہ واقعی میں جنت کے کسی کونے میں بیٹھا ہوا ہوں۔ وہ انمول لمحے میں کوشش کے باوجود بھی ان لمحوں کو نوک قلم سے قرطاس کی جبیں پر نہ بکھیر سکا۔ میں ان لمحوں کو صرف محسوس کرتا رہا۔ ان کو لفظوں کا جامہ پہنانے سے قاصر رہا۔ میں جب واپس اپنی قیام گاہ پر لوٹ کر آیا تو میرے خواب آہستہ آہستہ بکھر رہے تھے۔ میرے خیالات میں جمال آرا کا بسیرا ہو گیا تھا۔ وہ ہر لحظ مجھے میرے قریب محسوس ہوتی تھی۔ اس کی وجہ سے مجھے دلی حسین لگی تھی۔ مگر میں کیسے بتا تا جمال آرا کو کہ تجھ سے بھی حسین کلکتے کے حسین عارفہ میر اراہ دیکھتی

ہے۔ میں جب کبھی اپنی بوریت کو ختم کرنے کی غرض سے لال قلعے گیا تو باغ میں سیر کے دوران مجھے کچھ ایسے حسین چہرے دیکھنے کو ملے جو بالکل گلاب جیسے تھے۔ ان حسین چہروں میں مجھے عارفہ کا عکس بھی نظر آرہا تھا جو امیر زادے کی تحریر پڑھ رہی تھی۔ میں جب کبھی کسی دوست کے ساتھ تفریح کے لیے جاتا تو وہاں بھی مجھے عارفہ خیالوں میں مل جاتی اور میری تنہائی دور کر جاتی۔ ایسی صورت حال ہے کہ اگر وہ میرے ساتھ ہوتی تو مجھے دنیا جنت محسوس ہوتی ہے۔ عارفہ جب میرے سامنے آتی ہے تو میری حالت کچھ یوں ہو جاتی ہے۔

"نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن"

کہ مجھ میں نہ جانے کی قوت باقی رہتی ہے اور نہ ہی میں وہاں ٹھہر سکتا ہوں۔ میری سمجھ میں یہ چیز سمجھ نہیں آتی کہ میں اپنا کون سا قدم پہلے اٹھاؤں۔ میں چاہتا کہ آنکھیں بند کروں اور کلکتہ پہنچ جاؤں مگر حالات میرا ساتھ دینے سے قاصر تھے۔ میں مسلسل جنگ بندی کا منتظر ہوں۔ ادھر تم جو میرا یار ہے اس کا ایک نامہ پھر ملتا ہے۔ جس نے مجھے چونکا دیا ہے۔ اس خط میں لکھا تھا کہ تم جتنا جلدی ہو گھر روانہ ہو جاؤ حالات کچھ خراب چل رہے ہیں۔ کچھ لوگ عارفہ کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ اس لیے عارفہ کے والد صاحب سخت الجھن کا شکار ہیں۔ اس حوالے سے تیرے خوابوں کی رانی بھی بہت پریشان ہے۔ کیونکہ جامو پھوا نے مجھے پیغام دیا ہے کہ اگر ادیب سہیل نہ آسکا تھا شاید وہ ساری عمر عارفہ کو نہ پاسکے گا۔ یہ پیغام مجھے ملنا تھا کہ میرے آٹھوں پہر بے چین ہو گے تھے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ جتنا جلدی ہے میں واپس آرہا ہوں تم میرے چاہنے والوں کو امید دلا دو۔ ادھر جنگ انگریز جیت چکے تھے۔ اور وکٹری ڈے جلوس نکالنے کی تیاری میں پوری طرح غرق تھے۔ اس جلوس کی مخالفت کے لیے سبھاش چندر بوش جو آزاد ہند فوج کے سربراہ تھے انھوں نے آگے بڑھ کر اس جلوس کو روکنے کی کوشش کی تو انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان پھر تصادم ہو گیا۔ دہلی ایک بار پھر قتل و غارت کی نظر ہونے لگا۔ دہلی پر کرفیو نے اپنے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ راستے ویران ہو چکے تھے۔ ہر آدمی کو اپنے ہی گھر میں نظر بند کر کے رکھ دیا تھا۔ ہر طرح کی افواہ شہر اور اخبار کی رونق بنی ہوئی تھی۔ میں بے چینی کے عالم میں مبتلا تھا۔ میں چاہتا کہ آنکھیں بند کروں اور میرے ساتھ پر لگیں اور میں اڑ کر کلکتہ پہنچوں۔ کیونکہ شہر کو دوبارہ روٹین پر آتے آتے کئی دن لگ جائیں گے۔

"خدا خدا کر کے غربت الدیار لمحوں سے جان چھوٹی
میں لوٹ کر جارہا تھا کلکتہ
اور اس خبر سے پری حد درجہ دل زدہ تھی
خلاف معمول ٹافیاں لینے کو نہیں آئی

چائے بھی مجھ کو خود بنانی پڑی اس کو پتا تھا
کل جا رہا ہوں دہلی چھوڑ کر "[۴۷]

***

"میں سیدھا کلکتے جا پہنچا تھا
قمر کے ساتھ عارفہ کے ابا بھی
ہوڑا اسٹیشن آ گئے تھے
گلے ملے اور خوشی سے بولے
بہت ہی بروقت آ گئے ہو!"[۴۸]

***

"جمیلہ پھوپھو بھی قریب آئیں
مجھے کہا، میرے ساتھ آ
عارفہ کو اس لمحے دیکھ لے
نیند میں ہے بے سند
نگاہِ بد سے خدا بچائے
جمال سارے جہاں کا سمٹا ہوا ہے اس میں!"[۴۹]

***

"تھا مارچ انیس سو چھیالیس کا مہینا
اب عارفہ اور میں
بہم ہو گے ہمیشہ کے واسطے
اور ہمارے دل کی مراد پوری ہوئی بالا آخر
مگر ہوا یہ
نہ چاہنے پر بھی کلکتہ لوٹ آنا پڑا
کہ فرصت ہی کم ملی تھی "[۵۰]

وہ وقت آن پہنچا تھا جب جنگ بندی کا اعلان ہونا تھا۔ تمام چہروں پر خوشی کی ایک لہر تھی۔ میں بھی بہت زیادہ خوش تھا اور میری جان بھی اس دلی سے چھوٹی تھی۔ کیونکہ میں بہت عرصے سے کلکتہ جانا چاہتا تھا۔ مگر دلی کے ہنگاموں نے میرے چاروں طرف باڑ لگا دی تھی۔ جب پریمی کو میرے جانے کی خبر ملی تو پریمی بہت

زیادہ افسردہ تھی۔ ہر وقت پریمی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ بھی میرے ساتھ کلکتہ کو ہو لیتی مگر وہ بے چاری بے بس تھی۔ پریمی اس درجہ مجھ سے خفا تھی کہ معمول کی ٹافیاں لینے بھی نہیں آئی تھی۔ پریمی جو میری ہر بات پر لبیک کہا کرتی تھی آج مجھے دیکھ کر اسے سخت غصہ آرہا تھا۔ آج چائے بھی مجھے خود بنانی پڑی تھی۔ پریمی جو ناراض تھی۔ میں اگلی صبح جب کلکتہ والی ٹرین پر بیٹھا تو میرے لیے یہ وقت بہت خوشی کا تھا۔ پر میں اداس بھی بہت تھا۔ میری الوداعی نظریں ان لوگوں کی متلاشی تھی جن لوگوں نے میرے دلی کو حسین بنایا تھا۔ اس وقت مجھے الوداع کہنے کو نہ میرا یار ناصر تھا اور نہ ہی فیاض! بس ایک ہی پریمی تھی جو اپنے والد صاحب کے ساتھ مجھے الوداع کہنے سٹیشن تک آئی تھی۔ پریمی کی آنکھیں بھی برسات کا منظر پیش کر رہی تھی۔ پریمی کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میرے بس میں ہوتا تو میں رک جاتا۔ لیکن اس طرف کلکتہ میں عارفہ میرے ہاتھوں سے نکلتی جارہی تھی۔ میرا جانا میری مجبوری ٹھہرا۔ خیر۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین جدائی کا راگ الاپتی ہوئی پٹری کو رگڑنے لگی دہلی وہیں رہ گئی اور ہم کلکتہ چل نکلے۔

میں جب کلکتہ پہنچا تو میرا یار میرے دکھ درد کا ساتھی قمر ہوڑا اسٹیشن پر عارفہ کے والد صاحب کے ساتھ موجود تھا۔ ہم سب خوشی خوشی ایک دسرے سے گلے ملے۔ انھوں نے مجھے کہا کہ میاں ذکی تم صحیح وقت پر آئے۔ اگر کچھ دن اور دیر کرتے تو نتائج مختلف ہوتے۔ عارفہ کے ابا نے قمر سے کہا کہ تم گھر خط لکھ دو کہ ذکی آگیا ہے لہذا اگلے جمعے کو عارفہ کا نکاح ہے۔ ہم نے وہاں سے آگے اکٹھے سفر کیا۔ یعنی میں، قمر اور عارفہ کے ابا جان تھے۔ ریل گاڑی رات بھر چلتی رہی۔ اگلی صبح ہم گاؤں پہنچے تو تھکان سے برا حال تھا۔ میں سب سے مل کر آرام کرنے چلا گیا۔ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گہری نیند سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو گھر میں چھل پہل لگی ہوئی تھی۔ میں بھی بہت خوش تھا اور دل میں گمان کر رہا تھا کہ کاش! جلدی سے رات آجائے اور میرا نکاح ہو جائے۔ خیر وہ وقت بھی آگیا اور میرا نکاح ہونا قرار پایا۔ ہماری دونوں دادیاں بہت خوش تھی۔ خوشی کے مارے دونوں کی آنکھیں چھلک پڑی اور ایک آواز جو میرے کانوں تک پہنچی تھیں وہ یہ تھی:

"اے مالک کل، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے"

کہ ہماری برسوں کی خواہش مکمل ہوئی ہے دونوں بوڑھیاں آپس میں مل جل کر اپنی خوشی کو دوبالا کر رہی تھیں بلکہ خاندان والے سارے ہی بہت خوش تھے اور ادھر عارفہ کی تمام سہیلیاں ڈھولک بجا بجا کر خوشی کے راگ الاپ رہی تھی۔ جمیلہ پھوپھو کی خوشی کی تو کوئی انتہا ہی نہیں تھی وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گھر لے گئی میں تم کو دولہا بنے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔ رات بہت گزر چکی تھی تمام لوگ بہت تھک چکے تھے جہاں جس کو

جگہ ملی وہ وہیں سو گیا تھا۔ میں ہر چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا ہر چیز گھر میں اپنی اپنی جگہ موجود تھی۔ سب سو چکے تھے۔۔۔۔ مگر میں۔۔۔عارفہ کے خیالوں میں پوری طرح غرق تھا کہ وہ کب میرے پاس آئے گی اور میں اس سے کھل کر اپنا حال دل بیان کروں گا۔ میں صحن میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک سے جمیلہ پھوپھو میرے پاس آن پہنچی مجھ سے کہنے لگی کہ آؤ دیکھو عارفہ کو کس طرح نیند میں بے ہوش پڑی ہے مگر ہے بڑی خوبصورت اللہ پاک اس کو غیر کی نظروں سے محفوظ رکھے۔ ایسا لگتا ہے کہ پوری دنیا کی خوبصورتی اس پر آکر ختم ہو گئی ہے۔ میں جب اس کے پاس گیا تو اس کے حسن کو دیکھ کر میں بے اختیار اس کا لمس چاہتا تھا جمیلہ پھوپھو نے میرے پاؤں پر پاؤں مار کر کہا کہ اب ہم کو یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے کہ کوئی ہمیں دیکھ نہ لے۔ اب ہماری مرادیں پوری ہو چکی ہیں۔ پورے صحن میں لوگ سکون کی نیند سو رہے تھے اگر کوئی جاگ رہا تھا تو وہ میں تھا یا ایک نشہ سا تھا جو عارفہ کے پاس رکنے سے ملا تھا۔ یہ نشہ کئی رنگوں میں تھا۔ مجھ پہ سحر سا طاری تھا۔ مجھے کوئی خبر نہیں کہ میں خواب میں تھا کہ جاگ رہا تھا۔مارچ ۱۹۴۶ء کا زمانہ چل رہا تھا جب میں اور عارفہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو گئے تھے۔ میرے دل کی سب سے بڑی خواہش اپنی تکمیل کو جا پہنچی تھی۔ مگر جلد ہی مجھے عارفہ کا گاؤں چھوڑ کر واپس کلکتہ جانا پڑا۔ اس میں میری مرضیٰ شامل نہیں تھی مگر حالات کا تقاضا یہی تھا کہ میں کلکتہ چلا جاؤں۔ مجھے عارفہ سے مل بیٹھنے کا وقت بہت کم ملا تھا۔ مگر جو ملا بہت خوب ملا۔

(پہلا خط)

"سر تاج من سلامت!

میں خیریت سے ہوں

آپ کی خیریت کی خواہاں

لکھا ہے ابا نے،

اگلے ماہ آ رہے ہیں

آپ ان کے ساتھ ہوں گے؟"[۸۲]

(خط کا جواب)

"عزیز جان پیاری عارفہ!

تم میری جانب سے

پیار کے سرخ پھول لے لو

ہمارے دل کی طرف سے تم
جدا ہوئے تم سے دو ہفتے ہو چکے ہیں
تمھارے خط کو ہنوز آنکھیں ترس رہی ہیں
تمھاری وعدہ خلافیوں کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا
تمھاری فرقت کے لمحے ہم پہ تھے یوں ہی بھاری
اور اس پہ چپ کا یہ سلسلہ ہم کو اور بے کل بنا رہا ہے
تمھاری بس اک اسی ادا سے
مصالحت ہم نہ کر سکیں گے"[۷۹]

* * *

حبیب اور دل نواز عارف
دیارِ غربت میں جب ہے خط ہی
ذریعہ ترسیل حالِ دل کا
وصال دل کا
تو پھر یہ تاخیر کی چٹانیں ہوں
کس سے انتظار کے راستے میں حائل؟
بہت ہی اچھا ہوا جو سر تاج من سلامت کا سلسلہ تم نے توڑ ڈالا
وہ تم کہ دریا کے پیاسے کو دے رہی ہوں شبنم
یہ ہم سے جذبات کے سمندر کو
چند صفحوں میں بند کر کے
تمھاری خاطر کو بھیجتے ہیں"[۸۰]

(تیسرا خط)

"جان نثار عارفہ!
سکون دل کے ہزار ساماں
قرار دل کے ہزار پہلو
حسین اور مشک بار پہلو

گہر فشاں، زر نگار پہلو
چلو میں لے کر تمھارا خط اب کیسے وقت سے بیشتر ہی
نظروں کے سامنے جگمگا رہا ہے
خوشی سے دل میرا کھِل رہا ہے
لکھا ہے تم نے
رفیق کے دلہا کل ہی آئے ہیں
یہ کہہ رہے تھے کہ آپ ہوتے تو
ساتھ ہی فرصت مزے سے کٹتی "[۸۱]

میں شادی کے دو ہفتے بعد ہی عارفہ کو چھوڑ کر کلکتہ چلا گیا تھا۔ فراق کا یہ تجربہ میرے لیے بالکل نیا سا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جدائی کی تکلیف کتنی ہوتی ہے۔ میں جسمانی طور پر تو کلکتہ میں تھا مگر روحانی طور پر عارفہ کے ہی آس پاس تھا۔ دن تو کام کاج میں گزر ہی جاتا مگر رات کو وہی عالم ہوتا جو مومن خان مومن نے بیان کیا ہے:

"تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا"

کہ جب میں کام کاج سے فراغت پا کر واپس اپنی آرام گاہ کی طرف پلٹا تو آگے عارفہ کی یادیں در و دیوار سے لگی ہوتی ہیں۔ خیر ایک دن عارفہ کا محبت بھرا خط آیا جس میں اس نے اپنے دل کی حالت زار بیان کی ہوئی تھی۔ کہ جناب من میں بالکل خیر سے ہوں اور آپ کی یاد میں دن رات گزار رہی ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اگلے مہینے میرے والد صاحب گھر تشریف لا رہے ہیں۔ سو آپ بھی ان کے ہمراہ گھر آجائیں تاکہ ہم مل بیٹھ کر دل کی باتیں ایک دوسرے سے بیان کر سکیں میں عارفہ کا خط پڑھ کر بالکل سکون میں ہو گیا تھا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی خط پڑھ کر یوں لگا کہ تھوڑی دیر کے لیے میری پیاس بجھ گئی ہے۔ میں خط کو بار بار پڑھ کر لطف لیتا تھا۔ اور اس وقت میرے جذبات آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب میری ملاقات عارفہ سے ہو گی تو میں اس کو بسیار گو بنا دوں گا۔ ایک ہی رات میں اس اسے تمام باتیں کر لوں گا۔ اس کی محبت میں آکر اس کے گلابی رخسار کو چوموں گا اور اس کے لمس سے زندگی کا سکون حاصل کر لوں گا۔ اس کا خط پڑھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے بھی عزیز جان عارفہ کے خط کے جواب میں خط لکھ ڈالا۔ جس

میں لکھا ہے کہ تم میری طرف سے لال پھول لے کر اپنے پاس رکھ لو۔ میری طرف سے بے پناہ محبت کر لو تم سے بچھڑے ابھی صرف دو ہی ہفتے ہوئے مگر نہ جانے کیوں تمھیں دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں۔ تم سے بہت جلد ملاقات کرنی ہے عزیز من! عارفہ تم مجھے ہفتے میں دو خط لکھ دیا کرو جس سے میں تمھارے حالات سے آگاہ رہا کروں گا۔ میری تنہائیاں ایسے ہی ختم ہوں گی۔ ہماری دوریاں کہیں ہم پر زیادہ بھاری نہ ہو جائیں۔ ادھر مجھ ناچیز کے کمزور جسم پر سردی بھی اپنی پوری گرمی دکھا رہی ہے۔ اتنی سخت سردی میں یہ فراق کی راتیں مجھ پر قیامت توڑتی ہیں۔ نیند روٹھی روٹھی سی لگتی ہے مجھ کو۔ میں تمھارے سارے خط نکال لایا ہوں اور ان کو پڑھ کر مسحور ہو رہا ہوں۔ یاد ماضی عذاب بنی ہوئی ہیں۔ مگر ہر واقع اپنی جگہ پر جوان ہے۔ تمھارے خطوط سے مجھے تمھاری ایک تصویر ملی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ تصویر نہیں ہے بلکہ مجسم صورت میں تم خود میرے پاس بیٹھی باتیں کر رہی ہو۔ تمھاری یادوں سے لڑتے لڑتے رات بہت ہو چکی ہے۔ اب میں تم سے اجازت چاہوں گا

عزیز من!

عارفہ تم میری طرف سے اپنی پیاری سکھی زرینہ کو بھی میرا بہت سارا خلوص عرض کرنا۔ میں اسکے لیے بھی ہمیشہ دعا گو رہتا ہوں کہ مالک کل اس کی تمام خواہشات کو پورا کرے۔ خط و کتابت کا یہ سلسلہ یوں ہی جا ری رہتا ہے۔ ایک دن میں عزیز جان عارفہ کو لکھتا ہوں کہ حبیب اور دل نواز عارف پکارا کرتے تھے کہ پیاری عارفہ میں تجھ سے دور ہوں اور میری یہ دوری صرف اور صرف تمھارے خط ہی ختم کر سکتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے اندرونی حالات سے آگاہی فراہم کرتے ہیں۔ لہذا جان من تم اس معاملے میں تاخیر بالکل بھی نہ کیا کرو۔ ایک میں کہ تمھارے خط کا ہمیشہ منتظر رہتا ہوں۔ مگر دوسری جانب تم کہ کبھی کبھی کوئی خط لکھ کر بھیج دیتی ہو!۔۔۔

عزیز من ایسا مت کرو مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ تم نے جو لکھا کہ ہم تم جو ایک ساتھ ہوتے تو زندگی پھولوں پر گزرتی یہ بجا ہے۔ یقین جانو میری بھی یہی خواہش ہے مگر حالات ہیں کہ ہم سے پکی دشمنی لگائے بیٹھے ہیں۔ جدائی مجھے اندر ہی اندر تباہ کر رہی ہے۔ یہاں کوئی مکان تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مکان داروں کا رویہ ایسا ہے کہ جیسے میں نے ان کا کوئی عزیز قتل کر دیا ہو۔ اسی رویہ کی بھینٹ میرے کئی خواب چڑھے، کتنی ہی خواہشات بے موت مری ہیں۔ تمہارا یہ محبت بھرا خط مجھے بہت حوصلہ دیتا ہے۔ میں اس کو کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ خط پڑھ کر نہ جانے کیوں میری بے قراری میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک اور خط کے جواب میں لکھا جانے والا خط کچھ یوں ہے۔۔۔۔

جاں نثار عارف، عارفہ کو گھر والے محبت سے عارف کہتے تھے۔ اس لیے مجھے بھی اچھا لگتا کہ میں بھی محترمہ کو عارف ہی کہا کروں۔ میرے دل کے ہزار سکون۔ میرے دل کے ہزار قرار تم ہو۔ تم اگر میرے ساتھ ہو تو میرا وہ وقت سب سے قیمتی گزرتا ہے۔ تمھارا خط پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ ہم دونوں کسی ہوا کے سفر پر روانہ ہو چکے ہیں۔ تم نے جو لکھا ہے کہ میری بہن رفیق کے میاں بھی آج کل آئے ہوئے ہیں اور آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں اگر ذکی میاں ہوتا تو ہمارا وقت بہت زیادہ اچھا گزرتا تو جان من یہ پڑھ کر مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ سلیمہ کا میاں جمال بھی آرہا ہے اور ہر سال کی طرح اس سال بھی کہیں تفریح کا پروگرام بنایا جارہا ہے۔ ہمارا پہلا پڑاؤں دہاسن پہاڑی کے اوپر خوبصورت آبشار کے پاس ہو گا۔ جب تم لوگ وہاں پہنچو گے تو جنگل میں منگل کا ساماں ہو گا۔ پورا جنگل قدرتی حسن سے مالا مال ہے۔ درخت اپنی شاخوں کی چھتریاں پھیلائے ہم جیسوں کا ہی انتظار کر ہے ہیں۔ اور جنگل کے درمیان سے دہاسن جوئے شیر کا منظر پیش کر رہی ہے۔ فضا پورے جوبن میں ہے لکھا ہے تم نے۔

پیارے ذکی ہمارے گھر کے پاس جو تم سیمبل کا اداس درخت چھوڑ کر گے اب اس میں بھی بہار کی آمد آمد ہے۔ پھول اس کے حسن میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اس کی شاخیں کسی سجی ہوئی دلہن کی انگلیوں کی طرح ہیں۔ عزیز جان مجھے شدت سے موسموں کے مطالبے کا احساس ہے۔ اگر کہیں مجھے درمیان چھٹی ملتی ہے تو میں کوشش کروں گا کہ میں پہاڑوں سے ملنے چلا آؤں۔ ان تمام مناظر کو میرا اسلام عرض کرنا۔ تمھارے پیار اور احترام کو بھی میری طرف سے عقیدت مندانہ سلام ہے۔ والسلام تم سلامت رہو۔

”پھر آیا وہ دن جس کے شدت سے انتظاری تھے

یعنی

گاؤں میں میری اور عارفہ کی پہلی عید ہو گی

اس خوشی میں کہ

اس کے اشجار، باغ و بن اور کوہ و برزن

نئی شباہت، نئی لطافت سے خیر مقدم کریں گے میرا

وہاں میں اپنے قیام کے ایک ایک لمحے پہ

ثبت چاہت کروں گا

ہونٹوں کا لمس دے کر

سدا یہ آغوش وا رہے گی

کبوتروں کا گداز لے کر "[۸۲]

٭٭٭

"میں عید کا چاند دیکھنے گیا
سرِ شام گھر سے باہر
تو چاند نکلا، کا شور بچوں میں کھلتا تھا
نگاہ سوئے فلک جما کر
دعا کی خاطر اٹھائے جب ہاتھ
تو انگوٹھے میں پاؤں کے سانپ ڈس گیا تھا"[۸۳]

٭٭٭

"سحر ہوئی پر
بڑا اس باقی تھا سانپ کے کاٹنے کا مجھ پر
اور آنکھ میں ریت چبھ رہی تھی
گلے میں کڑواہٹ بھری تھی
مثالِ قوسِ قزح
نہ انگڑائی پاس آئی
کبوتروں کا گداز لے کر
نہ آغوش واہ ہوئی "[۸۴]

٭٭٭

"کئی دنوں بعد جب میں لوٹا ملازمت پر
تو میرے ہمراہ عارفہ بھی اس سفر پر
وہ اس سے پہلے بھی اپنے ابا کے ساتھ کلکتے آچکی تھی "[۸۵]

٭٭٭

"ہر اک دیوار پہ یہ نعرا لکھا ہوا تھا
کہ، چھوڑ دو ہند
اب یہاں سے فرنگیو تم اٹھاؤ ڈیرا
فرنگی جانے کو تو گیا پر

نفاق کے بیج بو گیا دائمی کچھ ایسے
کہ ہزار جانیں تلف ہوئیں"[۸۶]

* * *

"مآل کار آیا لاکھوں لوگوں کی قسمتوں میں
جڑوں سے اپنی اکھڑ کے اک اور ملک جانا
تھے ہم بھی ہجرت زدوں کے اک کارواں میں شامل
نئے وطن کا سرور
ہر دل میں جاگزیں تھا
کس چرسی سے تنگ آ کر
مہاجرت کے پروں میں ہو کر سوار نکلے
تو پھر عروس البلاد، یعنی کراچی پہنچے
یہ سرزمین سب کو راس آئی
مہاجرت کو پناہ دیتی رہی"[۸۷]

* * *

"نیا وطن شرق و غرب میں منقسم تھا
میں شرق میں چھوڑ کر آیا ملازمت کو
شروع میں یہ وطن سب کو راس آیا
عجب بہجت کا دور تھا یہ
مگر قدم ٹھیک سے ہم ابھی جما نہ پائے تھے
اس کو اپنا وطن بناتے ہوئے
ابھی چند سال گزرے تھے
شرق و غرب کا دلوں میں یہ فراق جاگا
کہ دونوں حصوں کے بیچ اک تناؤ ابھرا"[۸۸]

وقت گزرتا رہا اور ہمیں جس دن کا انتظار تھا وہ دن آ گیا۔ وہ خاص دن عید کا دن تھا۔ شادی کے بعد گاؤں میں میری اور عارفہ کی پہلی عید تھی۔ مجھے امید ہے کہ میں جب گاؤں پہنچوں گا تو گاؤں کے برگ و بار

میرا خیر مقدم کریں گے اور عارفہ مجھے اپنے پھول کی پتی جیسے لبوں کا بوسہ دے کر کچھ دیر کے لیے اپنی آغوش میں لے گی۔ تب میری اور عارفہ کی حالت کبوتروں کے گداز جیسی ہو گی۔ میں عید کا چاند دیکھنے کے لیے سر شام جب باہر نکلا تو ہر طرف عید کے چاند کا شور ہی سنائی دے رہا تھا۔ بچے بہت جذباتی انداز میں عید کے چاند کی خبر پورے محلے میں پھیلا رہے تھے۔ میں بھی اپنی بے چین نگاہیں آسمان پر لگائے چاند کو تکنے کی کوشش میں مگن تھا۔ میں نے چاند دیکھ لیا تھا۔ تب میں نے دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ایک زہریلے سانپ نے میرے پاؤں کے انگوٹھے کو بڑی بے دردی سے کاٹ لیا تھا۔ سانپ کا کاٹنا ہی تھا کہ یہ خبر پورے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ماندری آیا جو سانپ کے کاٹنے کے متعلق علم رکھتا تھا۔ اس نے اس جگہ اپنے ہونٹ رکھے جہاں سانپ نے کاٹا ہوا تھا۔ سارا زہر چوس کر باہر نکال دیا۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں ماندری ورد کرتا رہا۔ اس کے ساتھ سارے گھر والے بھی شامل تھے۔ کوئی بھی طریقہ نہ بچا جس سے میری جان کو بچایا جائے۔ مجھے ہر طرح کی کڑوی جڑی بوٹیوں کے رس نکال نکال کر پلاتے رہے تمام رات یہ سلسلہ جاری رہا۔ سارے خاندان والے میرے گرد گھیرا جمائے کھڑے تھے۔ تاکہ میں رات بھر سو نہ سکو کیونکہ میں اگر سو جاتا تو زہر میری رگوں میں تیزی سے پھیل جاتا۔ صبح جب ہوئی تو محسوس ہوا کہ زہر کچھ کچھ باقی ہے۔ میری آنکھوں میں یوں لگا کہ ریت چبھ رہی ہے۔ رات کو جو کڑوا رس پیتا رہا اس کی وجہ سے میرے گلے میں کڑواہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ سانپ کا کاٹنا کیا تھا میرے تمام خواب آدھے ادھورے رہ گئے تھے۔ نہ ہی کسی نے رات بھر اپنے گرم ہونٹوں کا بوسہ دیا تھا اور نہ ہی کسی کی سکون بھری آغوش میسر تھی۔ نیند چاروں پہر میرا انتظار کر رہی تھی۔ ہماری پہلی عید کو بھی کسی کی نظر لگ گئی تھی اور ہماری پہلی عید یوں ہی پریشانیوں میں گزر گئی۔

عید ویسے ہی گزاری ہے گزارہ کر کے

اس کے بعد میں دوبارہ کلکتہ شہر میں نوکری کے لیے روانہ ہوا تو میرے ساتھ عارفہ بھی سفر کا حصہ تھی۔ اس سے پہلے عارفہ ایک بار اپنے والد کے ہمراہ کلکتہ کا سفر کر چکی تھی۔ جب ہم سفر پر روانہ ہوئے تو ہمارے جسم و جان میں مسرت کی لہر دوڑ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم ہوا میں سفر کر رہے ہیں۔ زندگی کے اس سفر کا انداز کچھ زندگی کے باقی سفر سے ہٹ کر تھا۔ وقت گزرتے گزرتے یہاں آ پہنچا تھا کہ ہر طرف خوف ہراس کی لہر پھیلی ہوئی تھی۔ ہر جگہ انقلابی نعرے لکھے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے لوگ باغیانہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ لوگ انگریزوں کے خلاف نعرے بازی کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس صورت حال

کے پیش نظر انگریز ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر ان فرنگیوں نے نفرت کا جو بیج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بویا تھا وہ اب درخت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اس وجہ سے بہت سا جانی نقصان دونوں طرف ہو رہا تھا۔ میری گلی اور محلہ ہندو مسلم میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے تھے۔ ان دنوں مجھے یاد ہے کہ تین بھائی بھول کر کلکتے کے ایک پر رونق محلے چاندنی میں آ گئے تھے۔ چاروں طرف چمکتی چھریوں کے سائے۔ ہر طرف سے مار دو مار دو کی آوازیں آ رہی تھی۔ ان میں سے جو بڑا تھا معصومانہ انداز میں کہا کہ مجھے مار دو مگر میرے بھائیوں کی جان بخش دو۔ ہماری ماں ہمارا راستہ دیکھتی ہو گی۔ اس وقت ایک خدا ترس ہندو باہر نکلا اور تینوں بچوں کو اپنی آغوش میں لے لیا کہ کون ہے جو تمھاری ہنستی ماں کی کھلتی گود کو اجاڑے گا۔ وہ شخص ان بچوں کو ان کے محلے تک چھوڑنے چلا گیا۔ اپنی اس زندگی میں ہجرت کا تجربہ بھی نصیب ہوا۔ ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان جانے کا حکم ملا۔ کیونکہ ہندوستان میں ہندو مسلم ایک دوسرے کی جانیں لے رہے تھے۔ اس خوف سے لوگ ہجرت کر کے پاکستان جا رہے تھے۔ ہم بھی ہجرت کرنے والوں کے قافلے میں شامل ہو گئے تھے۔ ہر کسی کے دل میں نئے وطن کا نیا جذبہ موج زن ہے۔ ہم لوگ غربت کے مارے ہوئے لوگ تھے۔ ظلم و ستم کا کوئی بھی موقع ہندوستان والے ضائع نہیں جانے دیتے تھے۔ ایسی صورت حال میں بچنے کے لیے سوائے پاکستان کے ہمارے پاس چارہ نہیں تھا۔ ہجرت اب ہمارے نصیبوں میں لکھی جا چکی تھی۔ ہم لوگ بھی اس ہجرت کو اپنے مقدر کا لکھا ہوا سمجھ کر پاکستان کے لیے نکل چکے تھے۔ ہجرت کے پروں پر سوار ہو کر ہم جلد پاکستان پہنچنا چاہتے تھے۔ ہم جب پاک سر زمین کی سرحد کو چھو رہے تھے تو ہمارے جذبات کچھ اور طرح کے تھے۔ ہر کسی کی آنکھ میں آنسو تھے۔ زبان پر پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ ایسی صورت حال میں ہم عروس البلاد کراچی پہنچ چکے تھے۔ کراچی ایک ایسا شہر ہے جس نے ہر مہاجر کو بسم اللہ کر کے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ میرا اور عارفہ کا یہ چالیس سال کا سفر اب مکمل ہوا ہے۔ ہم وقت اور حالات سے لڑتے لڑتے یہاں آ پہنچے تھے۔ ہم کو کوئی خبر نہیں کہ جوانی کیسے آئی اور کیسے گزری۔ ہم سوچتے ہیں کہ اس زندگی نے ہمیں ہجرت کے تحفے کے سوا کیا دیا ہے۔ ایک طرف پر خار زندگی گزاری دوسری طرف عارفہ کی محبت نے مجھے کسی بھی طرح تھکنے نہ دیا۔ چوں کہ زندگی امید پر قائم ہے اور ہم ہر گزرے ہوئے کل کو سوچتے تھے۔ اس لیے عارفہ کی محبت اور ساتھ میں میرا "غم زمانہ سہل گزرا" میرے اور عارفہ کے درمیان جو انچاس سال پہلے ایک محبت کا بیج دفن ہوا تھا وہ بیج ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ ہمارے درمیان جس محبت کا آغاز تب ہوا تھا وہ محبت آج بھی زندہ و جاوید ہے۔

اس آپ بیتی کا تفصیل سے مطالعہ کرنے کے بعد جہاں محقق ادیب سہیل کی زندگی کے متعلق بہت کچھ جان لیتا ہے وہاں اس آپ بیتی کی ہیئت اور اسلوب سے بھی بخوبی آگاہ ہو جاتا ہے۔ہیئتی اعتبار سے یہ آپ بیتی آزاد نظم کی صورت میں لکھی گئ ہے۔ آزاد نظم کو اس تحقیقی مقالے میں بڑی تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اسلوب پر بھی خاصی بحث ہو چکی ہے۔"غمِ زمانہ بھی سہل گزرا،، میں شاعر نے اپنی زندگی کے واقعات کو بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے۔ آسان الفاظ کا استعمال کر کے شاعر نے مشکل سے مشکل واقعات کر دل چسپ بنایا ہے۔ اس لیے اس آپ بیتی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی نوجوان کی آپ بیتی ہے۔ جس طرح کسی نوجوان کی تحریر میں جذبات و احساسات اور امنگ و ترنگ کا عالم ہوتا ہے بالکل ایسے ہی "غمِ زمانہ بھی سہل گزرا،، میں ہے۔اس آپ بیتی کا مرکزی کردار عارفہ ہے جس کو شارعر نے تشبیہات و استعارات کے ذریعے بیان کیا ہے۔ادیب سہیل نے عارفہ کر کبھی نرم تتلی تو کبھی شفق کہا ہے کبھی چاند تو کبھی ستارہ کہا ہے۔"غمِ زمانہ بھی سہیل گزرا،، آزاد نظم ہے اس لیے اس نظم میں بحر کی کوئ قید نہیں تھی۔جب کسی نظم میں بحر کی قید نہ ہو تو اس میں واقعات بڑی آسانی کے ساتھ پروئے جاسکتے ہیں۔ اسی لیے اس آپ بیتی میں بھی شاعر نے ہر واقعے کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس آپ بیتی کی تکمیل میں شاعر نے مختلف زبانوں کے الفاظ کو شامل کیا تاکہ اس آپ بیتی کا حسن مزید نکھر جائے۔"غمِ زمانہ بھی سہل گزرا،، میں عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی زبانوں کے الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ اس کے علاوہ فارسی محاورات کا استعمال بھی کیا گیا ہے مثلاً

"نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن،،

جس طرح "آیئنہ در آیئنہ،، میں شاعر نے مختلف شعرا کے کلام سے اپنی بات میں جان ڈالنے کی کوشش کی ہے بالکل ایسے ہی ایک واقعے کو شاعر نے جگر کی غزل کے ایک مصرع سے جان ڈالی ہے۔

"ساقی کی ہر نگاہ میں بل کھاکے پی گے،،

ایک اور واقعے کو کسی دوسرے شاعر کے شعر کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئ۔

"گر فردوس بر روئے زمیں است

ہمیں است و، ہمیں است و، ہمیں است،،

اس آپ بیتی میں شاعر نے محاورات کا استعمال بھی کیا ہے مثلاً

"آنکھ او جھل پہاڑ او جھل،،

اس نظم کی بحر متقارب مثمن مقبوض اثلم ہے۔ اس نظم کا ایک ٹکڑا تقطیع کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| بیاہ کا گھر | | |
| مفعول فعلن | | |
| تھا اور شہنائی | | |
| مفعول فعلن | | |
| و قفے قفے | سے شادیانے | بجا رہی تھی |
| مفعول فعلن | مفعول فعلن | مفعول فعلن |
| گلی سے آرہی | صدا جھما جھم | کی اٹھ رہی تھی |
| مفعول فعلن | مفعول فعلن | مفعول فعلن |
| ہوا نے پاؤں | میں جیسے پازیب | باندھ لی ہو |
| مفعول فعلن | مفعول فعلن | مفعول فعلن |

اس کا وزن مفعول فعلن ہے بعض لوگ مفاعلاتن بھی کہتے ہیں۔ دونوں کا وزن ایک ہی ہے لیکن مفاعلاتن کی بحر کا رکن یا زحاف نہیں ہے۔ اس لیے اس کو مفعول فعلن کہنا چاہیے۔

"غمِ زمانہ بھی سہل گزرا" کے اسلوب کو بہتر بنانے کے لیے شاعر نے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ ہر شاعر یا ادیب کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ میرا کام دوسرے کے کام سے بہتر ہو۔ اسی روش کو اپناتے ہوئے ادیب سہیل نے بھی یہی کوشش کی ہے کہ '' غمِ زمانہ بھی سہل گزرا،، میں ایسی چیزوں کا استعمال کروں جو اس آپ بیتی کو کامیاب بنانے میں کارگر ثابت ہوں۔ '' غمِ زمانہ بھی سہل گزرا میں،، ادیب سہیل نے اپنے بچپن، جوانی اور آخری عمر کے واقعات کو صاف ستھرے الفاظ میں بیان کر کے اپنی زندگی کی بہترین تصویر اپنے قارئین کے سامنے رکھ دی ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ پروفیسر نورالحق ہاشمی، "ناول کیا ہے" درد اکادمی شاہ عالم مارکیٹ، لاہور ۱۹۶۴ء ص، ۶۷

۲۔ سیدہ محسنہ، نقوی، داکٹر، "اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر وروایت"، (منتخب مقالات)، فرحان رضا پرنٹرز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء، ص ۲۱، ۲۲

۳۔ ایضاً، ص، ۲۲

۴۔ ایضاً، ص، ۲۲

۵۔ ایضاً، ص، ۲۴، ۲۵

۶۔ محمد حسن، ڈاکٹر، ہیئتی تنقید، کاروان ادب، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص، ۱۱۰

۷۔ ایضاً، ص، ۱۱۰

۸۔ سیدہ محسنہ، نقوی، داکٹر، "اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر وروایت"، (منتخب مقالات)، فرحان رضا پرنٹرز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء، ص ۲۳

۹۔ ایضاً، ص، ۴۷

۱۰۔ ادیب سہیل، "غم زمانہ بھی سہل گزرا" القادر پریس، کراچی، ۲۰۰۳ء ص، ۵

۱۱۔ ایضاً، ص، ۱۳

۱۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، "آدھی صدی کے بعد" مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص، ۳۱

۱۳۔ کاشف الحقائق، امداد امام اثر، ص، ۴۰

۱۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، "اردو شاعری کا مزاج"، جدید ناشرین، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص، ۲۸۹

۱۵۔ ناہید قاسمی، ڈاکٹر، "جدید شاعری میں فطرت نگاری" انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص، ۳۷۲

۱۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، "اردو ادب کی تحریکیں" انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص، ۳۷۲

۱۷۔ شاید شیدائی "بحوالہ بیاض شب وروز از ارمان نجمی" کاغذی پیرہن، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص، ۱۱

۱۸۔ ابوالاعجاز، حفیظ صدیقی، "کشاف تنقیدی اصطلاحات" مقتدرہ، قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص، ۲۲۰

۱۹۔ ناصر عباس نیئر، ڈاکٹر، "مکتوب بنام راقم" استاد شعبہ اردو جامعہ پنجاب، لاہور، مکتوب محررہ ۱۸۔ ستمبر ۲۰۰۹ء

۲۰۔ ارشد محمود، ناشاد، ڈاکٹر، مکتوب بنام راقم شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، مکتوب محررہ ۲۳۔ اکتوبر، ۲۰۰۹ء

۲۱۔ ضیاالحسن، ڈاکٹر، مکتوب بنام راقم استاد شعبہ اردو جامعہ پنجاب، لاہور، مکتوب محررہ ۲، ستمبر ۲۰۰۹ء
۲۲۔ طارق حبیب، مکتوب بنام راقم، استاد شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، مکتوب محررہ ۱۱۔ نومبر ۲۰۰۹ء
۲۳۔ ن۔م راشد، ''کلیات راشد'' ماورا پبلی کشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص، ۴۴۱
۲۴۔ میراجی۔ ''کلیات میراجی''، مرتبہ جمیل جالبی، ڈاکٹر، اردو مرکز، لندن، ۱۹۸۸ء، ص، ۳۸۷
۲۵۔ راحت نسیم ملک، شعری تجربہ مشمولہ نئی شاعری مرتبہ افتخار جالب، سنگت پبلشرز، لاہور، ص، ۱۴۶
۲۶۔ قریشی علی محمد، نظم، ''حقیقت'' مطبوعہ سہ ماہی نقاط، فیصل آباد، ۲۲۰۷ء، ص، ۱۲۳
۲۷۔ محمد حسین آزاد ''نظم آزاد''، مطبوعہ کریمی پریس، لاہور، ۱۹۲۶، ص، ۲۸
۲۸۔ اصناف ادب کا ارتقاء، صفی مرتضیٰ، سید، نظامی پریس، لکھنو، سن نداد، ص، ۲۹
۲۹۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر، ''جدید اردو نظم کے فروغ میں آزاد کی خدمات''، مشمولہ آزاد صدی مقالات، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۲۰۱۰ء ص، ۱۸۲
۳۰۔ جیلانی کامران، نئی نظم کے تقاضے، لاہور، کتابیات، ۱۹۶۷، ص، ۱۲
۳۱۔ عابد علی عابد، سید، ''اسلوب'' مجلس ترقی ادب، لاہور دسمبر: ۱۹۷۱ء، ص، ۴۰، ۳۹
۳۲۔ ایضاً، ص، ۴۴
۳۳۔ ایضاً، ص، ۴۵
۳۴۔ ایضاً، ص، ۵۸
۳۵۔ ایضاً، ص، ۵۹
۳۶۔ ایضاً، ص، ۶۱
۳۷۔ ایضاً، ص، ۶۱
۳۸۔ سیدہ، محسنہ، نقوی، ڈاکٹر، پروفیسر، ''اسلوب و اسلوبیات کی تعمیر و روایت ''منتخب مقالات، فرحان رضا پرنٹرز، راولپنڈی، جون، ۲۰۰۵ء، ص، ۶
۳۹۔ خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر، ''زبان، اسلوب اور اسلوبیات'' بک ٹاک، ٹیمپل روڈ، لاہور، ۲۰۲۰ء ص، ۱۶۶
۴۰۔ ایضاً، ص، ۱۶۷
۴۱۔ ایضاً، ص، ۱۶۱
۴۲۔ ایضاً، ص، ۱۶۱

۴۳۔ خلیل احمد بیگ، پروفیسر، ''اسلوبیاتی تنقید، نظری بنیادیں اور تجزیے''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص،۱۰۶

۴۴۔ ادیب سہیل، ''غم زمانہ بھی سہل گزرا'' القادر پریس، کراچی، ۲۰۰۳، ص، ۵

۴۵۔ ایضاً، ص،۸

۴۶۔ ایضاً، ص،۱۰

۴۷۔ ایضاً، ص،۱۱

۴۸۔ ایضاً، ص،۱۲

۴۹۔ ایضاً، ص،۱۳

۵۰۔ ایضاً، ص،۱۳

۵۱۔ ایضاً، ص،۱۳

۵۲۔ ایضاً، ص،۱۴

۵۳۔ ایضاً، ص،۱۵

۵۴۔ ایضاً، ص،۱۶

۵۵۔ ایضاً، ص،۱۷،۱۶

۵۶۔ ایضاً، ص،۱۸،۱۷

۵۷۔ ایضاً، ص،۱۸

۵۸۔ ایضاً، ص،۱۹

۵۹۔ ایضاً، ص،۱۹

۶۰۔ ایضاً، ص،۲۱

۶۱۔ ایضاً، ص،۲۲

۶۲۔ ایضاً، ص،۲۵

۶۳۔ ایضاً، ص،۲۷،۲۶

۶۴۔ ایضاً، ص،۲۸

۶۵۔ ایضاً، ص،۳۲،۳۱

۶۶۔ ایضاً، ص،۳۳

۶۷۔ ایضاً، ص، ۳۴

۶۸۔ ایضاً، ص، ۱۳،۳۵

۶۹۔ ایضاً، ص،۳۹

۷۰۔ ایضاً، ص، ۴۳،۴۲

۷۱۔ ایضاً، ص، ۴۷

۷۲۔ ایضاً، ص، ۵۱،۵۰

۷۳۔ ایضاً، ص، ۵۲

۷۴۔ ایضاً، ص، ۵۵

۷۵۔ ایضاً، ص، ۵۶

۷۶۔ ایضاً، ص، ۵۹

۷۷۔ ایضاً، ص، ۶۲،۶۱

۷۸۔ ایضاً، ص، ۶۲

۷۹۔ ایضاً، ص، ۶۴

۸۰۔ ایضاً، ص، ۶۷

۸۱۔ ایضاً، ص، ۶۹

۸۲۔ ایضاً، ص، ۷۱

۸۳۔ ایضاً، ص، ۷۲

۸۴۔ ایضاً، ص، ۷۳

۸۵۔ ایضاً، ص، ۷۴

۸۶۔ ایضاً، ص، ۷۳

۸۵۔ ایضاً، ص، ۷۴

۸۶۔ ایضاً، ص، ۷۵،۷۴

۸۷۔ ایضاً، ص، ۷۹،۷۶

۸۸۔ ایضاً، ص، ۷۷

# باب پنجم

## تینوں منظوم آپ بیتیوں کا ہیئتی و اسلوبی تقابل

تقابلی ادب کی اصلاح کی آوازیں انیسویں صدی کے شروع شروع میں فرانس میں سننے کو ملی تھیں۔ شروع شروع میں تقابلی ادب کے حوالے سے فرانسیسی اور کچھ یورپی زبانوں کے ادب پاروں کے درمیان تقابل کیا جانے لگا۔ ابتدا میں تقابل کی سرحدیں محدود تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تقابلی مطالعے نے پوری دنیا کے ادب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور اب ہر ان دو چیزوں کے درمیان تقابل ممکن ہے جو ایک جیسی ہیئت رکھتی ہوں۔ تقابلی مطالعہ نہ صرف ادبی فن پاروں کے درمیان کیا جاتا ہے بلکہ ہر ان دو چیزوں کے درمیان کیا جا سکتا ہے جو ایک جیسی ہوں۔ برطانیہ کی ایک جامعہ کے استاد پروفیسر سوزن بیسنٹ تقابلی مطالعے کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''تقابلی ادب مختلف ثقافتوں کے متون کا مطالعہ ہے، یہ ایک کثیر العلمی مضمون ہے جس کا تعلق زمان و مکان کے بعد میں پیدا ہونے والے رشتوں کے نقوش سے متعلق ہے۔''[1]

تقابلی ادب مختلف ثقافتوں کے متون کا مطالعہ ہے اس بات سے ہم کسی حد تک اتفاق کر سکتے ہیں کیوں کہ جب ادیب کوئی ادبی فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو وہ ایک خاص ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اور وہ ماحول کسی نہ کسی تہذیب کا اثر قبول کیے ہوئے ہوتا ہے۔ تقابلی مطالعہ کے لیے تراجم سے بھی آگاہی ضروری تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب ہم دو ادبی فن پاروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھی دو فن پاروں کو لیتے ہیں جنھوں نے کسی دوسری زبان میں کسی غیر تہذیب کو اجاگر کیا ہو تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں ادبی فن پاروں نے ہماری قومی ثقافت اور ادب پر کیا اثرات مرتب کیے۔ کسی غیر تہذیب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے ہم اس غیر تہذیب کی زبان کو سمجھ سکیں۔ جب زبان ہماری سمجھ میں نہیں آئے گی تو ترجمہ ایک واحد سہارا ہے جو ہمیں صحیح راستہ بتا سکتا ہے۔ تقابلی ادب کے مطالعے کو سمجھنے کے لیے علمِ ترجمہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا زندہ رہنے کے لیے ہوا۔ چوں کہ ہمارا ادب کوئی اپنی ذاتی تخلیق نہیں ہے بلکہ ہم نے کچھ چیزیں انگریزی کچھ عربی، فارسی، ترکی زبانوں سے بطور ادھار لیں ہیں۔ اردو ادب کے اندر تو ٪۶۰ الفاظ فارسی کے مستعمل ہیں اور اگر ہم فارسی کا اردو

ترجمہ نہیں کریں گے تو بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہی رہے گی۔ بالکل ایسے ہی باقی زبانوں کے الفاظ جو اردو ادب میں مستعمل ہیں کسی نہ کسی حد تک ان کو سمجھنے کے لیے ترجمے کی ضرورت رہتی ہے۔ المختصر کہ تقابلی ادب کو کامیاب بنانے کے لیے ترجمے کا ہونا ضروری ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی میں ترجمہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ آج کے دور میں کوئی بھی زبان ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتی جب تک وہ ترجمہ کا سہارا نہ لے گی۔ ترجمے کے ذریعے سے ہی زبان میں نئے الفاظ، اصطلاحات، محاورات، وغیرہ کو جگہ ملتی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ:

"ترجمہ ایک زبان کو دوسری زبان سے اور ایک زمانے کو دوسرے زمانے سے ملاتا ہے"[۲]

فن ترجمہ کاری، مرتبہ، صفدر رشید، یورپ اکادمی، اسلام آباد، مارچ، ۲۰۰۵، ص ۹۷۔

اس ساری بحث سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تقابل کے لیے ترجمہ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ تب جا کر کسی نقطے تک پہنچ سکتے ہیں۔ تقابلی ادب کا مطالعہ، تنقید، تشریح و تفہیم اور تفاسیر کے میدان میں خاطر خواہ اضافہ ہے۔ تقابلی مطالعہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جو نئی سوچ رکھنے والے لوگوں کو لکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ تقابل کا اصل مقصد ادب کے مجموعی مظہر کا جائزہ لینا، گروہ بندی کرنا ہے۔ تقابلی ادب میں تاریخ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ تقابلی ادب میں تاریخ ایک ہیرو کا کردار ادا کرتی ہے۔ تقابل دنیا کی دو یا دو سے زائد ایک جیسی چیزوں کے درمیان کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ میرے اس تحقیقی مقالے میں تین آپ بیتیوں کا تقابل کیا جارہا ہے تو یہ تینوں آپ بیتیاں ہیئتی اعتبار سے منظوم ہیں۔ اس لیے ان تینوں کے درمیان تقابل کیا جارہا ہے۔ تقابل کرنے کے لیے پہلے کچھ معیاری پیمانے طے کیا جاتے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کونسی چیز اس معیاری پیمانے کے زیادہ قریب ہے۔ جو چیز معیاری پیمانے کے زیادہ قریب ہو گی اس کو بہتر مانا جائے گا۔ ویسے تو تقابل ہر ان دو چیزوں کے درمیان ہو سکتا ہے جو ایک جیسی ہوں۔ ادب میں تقابل سے مراد فن کاروں کے ادبی فن پاروں کے درمیان ایک جیسی چیزوں اور مختلف چیزوں کو چھان کر الگ کرنے کا نام ہے۔ ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ فنی تخلیقات کا باہمی موازنہ ہر دور میں کیا جاتا رہا ہے۔ تقابلی مطالعے کے حوالے سے شاہد احمد کہتے ہیں کہ: تقابلی مطالعہ دو یا دو سے زائد فن کاروں کے فن پاروں کا تجزیاتی مطالعہ ہوتا ہے۔ یہ مطالعہ تعین کی قدر سے گریز کرتے ہوئے خصوصیات اور خامیوں کی نشاندہی کرتا چلا جاتا ہے۔ تقابلی مطالعہ ایک مشکل ترین کام ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی ادبی فن پارے میں جو خوبی آپ کو نظر آرہی ہو وہ کسی دوسرے نقاد کو بھی نظر آئے۔ اگر آپ کا کام کوئی چیلنج کرتا ہے تو آپ

کے پاس اس آدمی کو مطمئن کرنے کے لیے ثبوت ہونا ضروری ہے۔کیوں کہ تقابلی مطالعے کو کچھ لوگ بہتر قرار دیتے ہیں تو کچھ لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔اس حوالے سے احتشام حسین اپنی کتاب" تنقید اور عملی تنقید"میں رقم طراز ہیں:

"تقابلی مطالعے ہمیشہ ناقص ہوتے ہیں لیکن تقابلی مطالعے میں تمام عناصر کو پیش نظر رکھنا تقریباً ناممکن ہے اور اگر ایک یا کئی پہلو نظر انداز ہو جاتے ہیں تو نتائج بالکل غلط ہو سکتے ہیں"[۳۱]

سید احتشام حسین کی اس رائے سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر یہ حقیقت بھی نہیں ہے۔چونکہ تقابلی مطالعہ اور موازنہ بھی تنقید کے زمرے میں آتے ہیں اس لیے تقابلی مطالعے اور موازنے کے لیے وہی اصول وضوابط ہوتے ہیں جو تنقید میں برتے جاتے ہیں۔کہیں کہیں تقابلی ادب کے مطالعے کی ناقص مثالیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ تنقید کے اصولوں سے دوری اختیار کر کے تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔بعض اوقات یہ عنصر بھی دیکھنے کو ملا ہے کہ جب ہم اپنی پسند کے کسی ادیب کو کسی دوسرے پر فوقیت دینے لگتے ہیں تو وہاں ہم مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔اس لیے ہمارا کام غیر معیاری سمجھا جاتا ہے۔اس کی بہترین مثال علامہ شبلی نعمانی کی کتاب موازنہ انیس و دبیر ہمارے سامنے ہے۔جس میں مصنف نے واضح طور پر دبیر پر انیس کو فوقیت دی ہے،اور انیس کا بہتر کلام شامل کر کے اس کے مقابلے میں دبیر کا ناقص اور کمزور کلام شامل کیا ہے۔میرے اس تحقیقی مقالے میں اردو کی تین منظوم آپ بیتیوں کا ہیئتی و اسلوبی تقابل شامل ہے۔پہلے تینوں کی ہیئت کا تقابل پیش کیا جائے گا اور بعد میں اسلوبی۔تقابل کی اقسام کی اگر بات کریں تو تقابل کی دو اقسام ہیں۔

بیانیہ تقابل

اقداری تقابل

بیانیہ تقابل میں ادب کے خارج کا مطالعہ کیا جاتا ہے یعنی کہ کسی بھی چیز کی ظاہری ساخت کیا ہے؟ ابواب کتنے ہیں اور کون کون سے لوازمات شامل ہیں۔

اقداری تقابل میں ایک مرکزی پیمانے کا تعین کیا جاتا ہے اور کچھ قواعد وضوابط طے کیے جاتے ہیں۔اور پھر دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس مرکزی پیمانے پر تقابل کیا جاتا ہے۔اس تحقیقی مقالے کی تکمیل کے لیے اردو کی منظوم آپ بیتیوں کے درمیان تقابل کے لیے اقداری طریقہ تقابل کو اپنایا جائے گا اور اس

کے طے شدہ اصول و ضوابط کے تحت ان تینوں منظوم آپ بیتیوں میں شامل افتراکات اور اشتراکات کو الگ الگ کیا جائے گا۔

(ج) تینوں منظوم آپ بیتیوں میں ہیئتی اشتراکات

(الف) تینوں آپ بیتیاں منظوم ہیں۔

(ب) تینوں آپ بیتیوں میں اسلوبی اشتراکات

۱۔ تینوں آپ بیتیوں میں تشبیہات کا استعمال بڑی عمدگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

''آدھی صدی کے بعد'' میں شاعر تشبیہات کا استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے:

چاند جیسے جسموں کی لہر میں

پھرتا ہو شور

چیخیں

چاند کی لاش

نیزوں کی نوکوں پر

ٹھہری ہوئی

''آئینہ در آئینہ'' میں بھی شاعر نے دشت کنعاں، یوسف کنعاں جیسی تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔

"غم زمانہ بھی سہل گزرا'' میں بھی ادیب سہیل نے تشبیہات کا استعمال کیا ہے تمام دن ایک پیر گھر میں، تو ایک باہر کیے ہوئے تھا۔ تھے باجے والوں کو بچے حلقہ کیے ہوئے تتلیوں کے مانند۔

تینوں شعراء نے اپنی آپ بیتیوں کو دلکش بنانے کے لیے استعارات کا ستعمال بھی کیا ہے۔

۲۔ "آدھی صدی کے بعد'' میں وزیر آغا نے خود کو رستا ہوا قلم کہا ہے جو بطور استعارہ ہے۔

"آئینہ در آئینہ میں ''حمایت علی شاعر نے زمین کے ٹکڑے کو چراغ خانہ کہا ہے۔

''غم زمانہ بھی سہل گزرا'' میں ادیب سہیل نے عارفہ کی یاد کو کڑی دوپہر کہا ہے۔

۳۔ "آدھی صدی کے بعد'' میں شاعر نے اپنے کلام کو بہتر بنانے کے لیے تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ وہ جس کے ساس سسر تھے نہ جیٹھ دیور تھے جو تھے تو دادا کے کچھ یوسفی برادر تھے۔ اس شعر میں یوسفی برادر بطور تلمیح استعمال ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بھی " آئینہ در آئینہ '' میں حمایت علی شاعر نے کچھ دیگر تلمیحات کو شامل کیا ہے۔ جن میں " دشت کنعاں''، "چاہ یوسف'' وغیرہ شامل ہیں۔

"غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں بھی ادیب سہیل نے تلمیحات سے کام لیا ہے۔ ادیب سہیل نے جوئے شیر کو بطور تلمیح استعمال کیا ہے۔

۴۔ "آدھی صدی کے بعد" میں شاعر نے کائنات کی ہر چیز کو دل سے دیکھا ہے۔ اس نظم میں شاعر کا جمالیاتی عنصر عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ اس نظم میں وہ پانی کے ایک دھارے کی خوبصورتی میں بہتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

"آئینہ در آئینہ" میں بھی حمایت علی شاعر نے مناظر فطرت سے دلچسپی کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ اورنگ آباد شہر سے وہ اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس شہر کی نایاب چیزوں مثلاً قلعوں، دریاؤں، ندی نالوں، پہاڑوں، جنگلوں کی اہمیت کو اجاگر کرتے جاتے ہیں۔ یہ سفر جو اورنگ آباد سے شروع ہوا تھا وہ کراچی آ کر اختتام پزیر ہوتا ہے۔

"غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں شاعر حمایت علی شاعر نے مناظر فطرت کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ وہ پہاڑ کے اوپر سے بہنے والی آبشار "دہاسن" کو بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس کا پانی جوئے شیر کے مترادف ہے۔

تینوں منظوم آپ بیتیوں کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ تینوں شعراء نے اپنی منظوم آپ بیتیوں میں جمالیات کو بھی خوب برتا ہے۔

۵۔ تینوں آپ بیتیوں میں روزمرہ اور محاورات کا استعمال برابر کیا گیا ہے۔ "آدھی صدی کے بعد" میں شاعر نے محاورات کا استعمال کیا ہے جب وہ زندگی کے مسائل سے جب وہ تھک گیا تھا تو وہ خود سے آنکھیں چراتا ہو محسوس ہوتا ہے۔

"آئینہ در آئینہ" میں تو محاورات کی بھرمار نظر آتی ہے۔ وہ ہندوستان میں انگریزوں کی زیادتیوں کے بعد کہتے ہیں کہ ایک وقت آیا جب انگریزوں کو منہ کی کھانی پڑیں۔

"غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں شاعر نے جگہ جگہ محاورات کو استعمال کیا ہے۔ وہ عارفہ سے ملاقات کے لمحات کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب عارفہ میرے سامنے آتی ہے تو میری حالت یہ تھی کہ نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن۔ اس کے علاوہ اس نظم میں شاعر ایک جگہ "سونے پہ سہاگہ" "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل،، جیسے محاورات کو بھی استعمال کرتا ہے۔

۶۔ ہندی، فارسی، عربی، انگریزی الفاظ کا استعمال تینوں آپ بیتیوں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

"آدھی صدی کے بعد" میں شاعر نے اس نظم کے صفحہ نمبر بائیس میں لفظ "ضیا" کا استعمال کیا ہے یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے مطلب چغہ (Chuga) ہے۔ جبکہ اسی نظم کے صفحہ نمبر چوبیس میں "نصف شب" "سر کے ژولیدہ" وغیرہ جیسے فارسی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نظم میں سنسکرت، انگریزی اور مقامی زبانوں کے الفاظ کے نقوش ملتے ہیں۔

"آئینہ در آئینہ" میں بھی عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، مقامی زبانوں کے الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کا تڑکا لگایا گیا ہے۔ اس نظم کے ابتدائی حصے میں لفظ "اجنتا" استعمال کیا گیا ہے جو ہندی لفظ ہے جبکہ اس نظم کی قسط نمبر ۱۱ میں ایک لفظ ملتا ہے لوح فردا جو فارسی ہے اور پھر ایک جگہ "دارالسلام" کا لفظ ملتا ہے جو عربی ہے۔ ایک اور جگہ انگریزی لفظ "اسٹاف آرٹسٹ" کا استعمال بھی اس نظم کے اسلوب میں نکھار پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

"غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں بھی شاعر نے انگریزی، ہندی، فارسی زبان کے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ وہ اس نظم میں عارفہ کو چاکلیٹ کا پیکٹ لے کر دیتا ہے۔ "چاکلیٹ کا پیکٹ انگریزی لفظ ہے۔ ایک جگہ شاعر اپنی نظم میں ایک لفظ "خوبیدہ" استعمال کرتا ہے جو فارسی کا ہے۔ اس نظم میں "بیڈ منٹن" انگریزی کا لفظ ملتا ہے۔ "غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں ایک لفظ "گیان" کا حوالہ ملتا ہے جو ایک سنسکرت لفظ ہے۔۔ تینوں منظوم آپ بیتیوں میں شعراء نے بڑی عمدگی کے ساتھ رموزو اوقاف کا ستعمال کیا ہے۔

۷۔ "آدھی صدی کے بعد" میں وزیر آغا نے مناسب جگھوں پر رموزِ اوقاف کا استعمال کیا ہے۔ اس نظم کے ابتدائی حصے میں (۔۔۔) خط کا استعمال کیا ہے۔ اس کے حوالے جگہ جگہ سوالیہ نشان، ختمہ، ندائیہ، فجائیہ، واوین، سکتہ، رابطہ وغیرہ کی علامتوں کا ستعمال بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔

"آئینہ در آئینہ" میں بھی علامتوں کا استعمال بڑے سلیقے کے ساتھ کیا گیا ہے۔

"غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں بھی شاعر نے علامتوں کا استعمال مناسب انداز میں کیا ہے۔

تینوں آپ بیتیوں میں الفاظ کا تکرار ملتا ہے۔

۸۔ " آدھی صدی کے بعد" میں بیل گاڑی کا تکرار زیادہ ملتا ہے اس کے علاوہ شام، شب دن، کسان، استاد، ریل گاڑی، نہر کھیت جیسے الفاظ میں تکرار پایا جاتا ہے۔

"آئینہ در آئینہ" میں اورنگ آباد، مقبرہ، دکن، دہلی، کلکتہ، کراچی، ہجرت جیسے الفاظ میں تکرار پایا جاتا ہے۔

"غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں اس نظم کی ہیروئن عارفہ کا تکرار سب سے زیادہ ملتا ہے۔

۹۔ "آدھی صدی کے بعد" میں وزیر آغا نے مجاز مرسل کا استعمال کیا۔

"آئینہ در آئینہ" میں بھی مجاز مرسل کا استعمال کیا گیا۔

"غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں بھی مجاز مرسل کا استعمال ہوا ہے۔

۱۰۔ " آدھی صدی کے بعد" میں شاعر پاکستان کے ایک شہر سے دوسرے شہر میں ہجرت کرتا ہے مگر اس کی یہ ہجرت عارضی ہوتی ہے۔ وہ پلٹ کر واپس سرگودھا آکر اپنی عمر گزراتے ہیں کبھی کبھار لاہور بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ مگر " آئینہ در آئینہ" اور " غم زمانہ بھی سہل گزرا" کے شاعر اپنے اپنے بیوی بچوں سمیت ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان، کراچی آکر جاتے ہیں۔

## (ج) ہئیتی افتراکات

۱۔ "آدھی صدی کے بعد" ایک آزاد نظم ہے۔

"آئینہ در آئینہ" مثنوی کی ہئیت پہ لکھی گئی ہے۔

"غم زمانہ بھی سہل گزرا" بھی ایک آزاد نظم کی شکل میں ہے۔

۲۔ "آدھی صدی کے بعد" میں وزیر آغا براہ راست مکالمہ کرتا ہے۔ وزیر آغا اس نظم میں کبھی اپنے دوستوں سے مکالمہ کرتا ہے۔ کبھی اساتذہ سے اور کبھی کسانوں کی زندگی بہتر بنانے کے لیے ان سے محو گفتگو ہوتا ہے۔

"آئینہ در آئینہ" میں بھی حمایت علی شاعر مختلف مقامات پر مختلف لوگوں سے مکالماتی انداز میں بات کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔۔ وہ کبھی اپنی ماں جو پٹن کے قاضی اسماعیل الدین کی بیٹی تھی ان سے اپنے خاندان کے حوالے سے پوچھتا ہے تو کبھی گاؤں کے بزرگوں سے قلعہ ارک کے قبرستان کی داستان پوچھتا ہے۔

"غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں ادیب سہیل کا زیادہ تر مکالمہ اپنی محبوبہ عارفہ سے ہوتا ہے۔ مگر قاری جب اس آپ بیتی کے عین درمیان جاتا ہے تو تب اسے فیاض نامی ایک شخص سے تعارف ہوتا ہے۔ جو شاعر کا دوست اور ہم راز ہوتا ہے۔ شاعر اس سے بھی مکالماتی انداز میں گفت وشنید کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

۳۔ 'آدھی صدی کے بعد" شاعر خود کلامی بھی کرتا ہے۔ وہ بعض اوقات زندگی کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے اپنے آپ سے سوال کرتا ہے اور پھر ان کا جواب بھی خود ہی دیتا ہے۔

"اور میں
جیسے خود بھی
حیرت میں ڈوبے زمانے کو
آنکھوں سے بس خود کو ہی دیکھتا تھا

بدن میرا
جادو کی نگری تھا
آئینہ صورت تھا"

"آئینہ در آئینہ" میں بھی خود کلامی کا عنصر واضح نظر آتا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"جہاں کہیں میرے دادا کی قبر ہے اس کو
میں چاہ یوسف کنعاں" کہوں تو بہتر ہے"

" غم زمانہ بھی سیل گزرا" میں بھی خود کلامی کی گئی ہے۔ شاعر جب عارفہ کو گاؤں چھوڑ کر شہر میں نوکری کے لیے گیا تھا۔ نئی نئی شادی کے بعد فراق کا یہ تجربہ اس کو ہلکان کیے جا رہا تھا۔ وہ ایک رات بے قراری کے عالم میں کہتا ہے کہ۔ پیاری عارفہ تم گھر میں لگے آئینے کے سامنے جا کر خود کو دیکھو تو تم کو احساس ہو کہ تم کتنی خوبصورت ہو۔ شاید یہ احساس ہونے کے بعد تم اٹھ کر میرے پاس چلی آؤ۔

تینوں آپ بیتیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ تینوں منظوم آپ بیتیوں میں شعرا خود سے کلام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۴۔ "آدھی صدی کے بعد" میں وزیر آغا جب اپنی اس آپ بیتی کے دوسرے حصے کی تکمیل کر رہا ہوتا ہے تو" آدھی صدی کے بعد" کے دوسرے حصے کی ابتدا میں خود کلامی کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اور میں

جیسے میں خود بھی

حیرت میں ڈوبے زمانے کی

آنکھوں سے بس خود کو ہی

دیکھتا ہوں

بدن میرا

جادو کی نگری ہے

آئینہ صورت ہے

مجھ کو دکھاتا ہے

میرا ہی منظر

کبھی ایسے لگتا

کہ جیسے یہ دھرتی بھی

اک آئینہ ہے کیا"

"آئینہ در آئینہ" میں بھی حمایت علی شاعر زمانے کی الجھنوں سے تھک کر خود سے گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک جگہ اپنی تقدیر سے ناراضی کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں۔

"عجب چیز ہے تقدیر جس کو کہتے ہیں

ازل سے پہلے کی تحریر جس کو کہتے ہیں"

"غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں ادیب سہیل عارفہ سے جدائی کے لمحات کو کچھ یوں بیان کرتا ہے۔ وہ بات یوں کرتا ہے جیسے کہ عارفہ اس کے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔:

"یقین مانو،

جدائی کس کس طرح ستاتی ہے

تم سے کچھ کم، نہیں ہے، یہ شاق میری جان پر!

کسی مکاں کا حصول بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔"

۵۔ ”آدھی صدی کے بعد“ ایک مسلسل طویل نظم ہے جبکہ، ”آئینہ در آئینہ“ اور ”غم زمانہ بھی سہل گزرا“ بھی دونوں طویل نظمیں ہیں۔

**(د) اسلوبی افتراکات**

ا۔ ”آدھی صدی کے بعد“ کہیں کہیں قافیہ پایا جاتا ہے جیسا کہ اس نظم کا ایک ٹکڑا مثال کے طور پر پیش کیا جارہا ہے جس کے دو مصرعوں میں قافیہ موجود ہے۔

”دوپہر تک سکون

دوپہر۔۔دھوپ

اور آسماں

دھوپ کا سائباں“

اس ٹکڑے میں لفظ آسماں اور سائباں قافیہ ہیں۔

”آئینہ در آئینہ“ چوں کہ مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہے اس لیے اس نظم کے ہر شعر میں قافیہ استعمال ہوا ہے۔اس نظم میں حمایت علی شاعر ایک واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”میں اس زمانے میں اخبار چھوڑ بیٹھا تھا

اور اپنا رشتہ کہیں اور جوڑ بیٹھا تھا“

اس شعر کے لوازمات سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں لفظ چھوڑ اور جوڑ بطور قافیہ استعمال ہوئے ہیں۔

”غم زمانہ بھی سہل گزرا“ میں بھی قافیہ استعمال ہوا ہے۔ مگر یہ قافیہ ”آئینہ در آئینہ“ اور ”آدھی صدی کے بعد“ میں استعمال ہونے والے قافیہ سے کم استعمال ہوا ہے۔ اس نظم میں شاعر شادی والے گھر کے منظر کو کچھ یوں بیان کرتا ہے۔ کہ ایک گھر کی خوشی میں سب ہی شریک ہیں

”اور غموں میں بھی اشتراک سب کا

شریک شادی تھے دور و نزدیک کے اعزّا“

”آدھی صدی کے بعد“ میں ردیف کا استعمال نہیں کیا گیا جبکہ ”آئینہ در آئینہ“ میں ردیف کی بھر مار نظر آتی ہے۔ "آئینہ در آئینہ“ کے ہر دوسرے شعر میں ردیف کا استعمال ملتا ہے۔ شاعر اس نظم میں رات کے دکھ کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

”پھر ایک رات بہت ہی طویل رات آئی

کہ جیسے موت کوئی بعد از حیات آئی"

"غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں بھی ردیف کا استعمال نہیں کیا گیا۔

۳۔ "آدھی صدی کے بعد" نظم کے مصرعے خاصے طویل ہیں۔

ع۔ معامیں نے پھول کے گجروں کی درزوں سے دیکھا۔

"آئینہ در آئینہ" کے مصرعے غزل کے مصرعوں کی طرح ایک ہی بحر میں ہیں جبکہ "غم زمانہ بھی سہل گزرا" کے مصرعے ان دونوں نظموں کے مقابلے میں زیادہ مختصر ہیں۔

"ہمارے کمرے سے صاف، پہروں دکھائی دیتی تھی
ایک لڑکی
جو صبح سے شام تک
اسی رخ پر اپنی آنکھیں لٹکائے
ریلنگ سے گھورتی تھی"

۴۔ "آدھی صدی کے بعد" کا سلوب بہت مشکل ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں "آئینہ در آئینہ" کا اسلوب کافی آسان ہے اور اگر بات کریں "غم زمانہ بھی سہل گزرا" کی تو اس کا اسلوب "آدھی صدی کے بعد" کے اسلوب سے تو آسان ہے مگر "آئینہ در آئینہ" کے اسلوب کے مقابلے میں الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

۵۔ "آدھی صدی کے بعد" بر صغیر پاک و ہند کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس نظم میں تاریخ سیدھے سادے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ "آئینہ در آئینہ" میں منظوم انداز میں تاریخ کا حوالہ اس آپ بیتی کے اسلوب میں خوب چار چاند لگاتا ہے۔ "آئینہ در آئینہ" میں شاعر ۱۹۷۱ کی جنگ کے مناظر کچھ یوں بیان کرتا ہے۔

"سپاہی جنگ پر چلے ہیں کتنی آن بان سے
بدن پر وردیاں سجائے، اک عجب شان سے
تڑپ کے دیکھتی ہے صبح، جھک کے آسمان سے
جوان جا رہے ہیں آج، اپنی جان سے"

"غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں بھی تاریخ کی مدھم سی جھلک نظر آتی ہے۔

"آدھی صدی کے بعد" میں چند ایک شعرا و ادبا کا تذکرہ ملتا ہے جن میں سرگودھا کے ہندو استاد بھی شامل ہیں۔ جبکہ "آئینہ در آئینہ" کا مطالعہ کرنے کے بعد یوں لگتا ہے کہ حمایت علی شاعر نے برصغیر پاک و ہند سمیت دنیا ادب کے کسی بھی ادیب کو نہیں چھوڑا جس کا تذکرہ نہ کیا ہو۔ وہ جب ہندوستان میں ہوتے ہیں تو ان کی ملاقات بلند پایہ ادیبوں جن میں ضمیر، قتیل، عالی، معین، اکبر، افتخار، شاہدہ، حمیدہ، بانو وغیرہ شامل ہیں سے رہی مگر جب وہ ولایت میں جاتے ہیں تو اقبال، کارل مارکس، ٹیگور، اینگلز، شیکسپئیر اور ایچ جی ویلز کا ذکر کیے بغیر بھی نہ رہ سکے۔

"غم زمانہ بھی سہل گزرا" میں بھی ادیب سہیل نے ادبا کا تذکرہ کیا ہے مگر ادیب سہیل کی نظم میں یہ لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں جن میں گیتی آرا، پَر والا، القاب و مہتاب، قاضی شجاع وغیرہ شامل ہیں۔

۶۔ "آدھی صدی کے بعد،، میں شاعر نے کسی دوسرے شاعر کے کلام کو شامل نہیں کیا جب کہ "آئینہ در آئینہ ،، میں اقبال، فیض اور چند دیگر شعرا کا کلام بھی شامل ہے۔ "غمِ زمانہ بھی سہل گزا،، میں بھی اقبال کا کلام شامل کیا گیا ہے۔

# حوالہ جات


۱۔ سوزن بیسنٹ: ترجمہ توحیدِ احمد، تقابلی ادب ایک تنقیدی جائزہ، پورپ اکادمی، اسلام آباد ۲۰۱۵ء، ص۵

۲۔ فنِ ترجمہ کاری، مرتبہ، صفدر رشید، پورپ اکادمی، اسلام آباد مارچ، ۲۰۰۵ء، ص۷۹

۳۔ احتشام حسین، سید، تنقید اور عملی تنقید، آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۵۲ء ص ۶۳

# باب ششم

# مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج اور سفارشات

## الف۔ مجموعی جائزہ

آپ بیتی کا تعلق انسان کی پیدائش سے ہے۔ کیوں کہ انسان جب اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو روز اول سے ہی اس کے ساتھ حادثات ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ انسان ان حادثات کو تحریری انداز میں بیان کرتا ہے جس کو آپ بیتی کا نام دیا جاتا ہے۔ ویسے تو دنیا کی ہر زبان میں آپ بیتی لکھی جاتی رہی ہے۔ کیونکہ اس وسیع و عریض آسمان کے نیچے زندگی بہت سے اتار چڑھاؤ کا شکار رہتی ہے۔ زندگی کے ان اتار چڑھاؤ کا نام ہی آپ بیتی ہے۔ انسان ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہا ہے۔ اس لیے میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ اور ان جیسے ملتے جلتے سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی جستجو میں مگن رہا ہے۔ آپ بیتی فن کاروں کا پسندیدہ ترین موضوع رہا ہے۔۔ نثری آپ بیتی کے ابتدائی نقوش تو اردو نثر کے آغاز کے ساتھ ہی ملتے ہیں۔ مگر منظوم آپ بیتی کی تاریخ کچھ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ منظوم آپ بیتی کا آغاز بیسویں صدی کے آخر میں ہوتا ہے۔ جب وزیر آغا نے ۱۹۸۱ءم 6 یں "آدھی صدی کے بعد" لکھی۔ وزیر آغا نے جب قلم اُٹھایا تو حمایت علی شاعر اور ادیب سہیل نے بھی اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے اپنا حصہ ڈالا۔ اور ۲۰۰۱ء میں "آئینہ در آئینہ" کا نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ پھر ۲۰۰۳ء میں "غم زمانہ بھی سہل گزرا" کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ تینوں منظوم آپ بیتیاں اردو ادب کے اندر منظوم آپ بیتی کی صورت میں ایک نیا تجربہ ہیں۔ ان تینوں منظوم آپ بیتیوں میں شعرا نے برصغیر پاک و ہند کی تہذیب و ثقافت سمیت جنگ و جدل کو بڑے خوبصورت انداز میں منظوم صورت میں قلم بند کیا۔ اس لیے ان تینوں منظوم آپ بیتیوں کا مطالعہ کرنے سے قاری برصغیر کی بنتی و بگڑتی صورت حال سے واقف ہو جاتا ہے۔ انسان حیوان ظریف ہے اور وہ اپنے آس پاس کے ماحول کا بغور جائزہ لیتا رہتا ہے۔ انسان کو اپنے آس پاس کے ماحول سے جو کچھ ملتا ہے وہ اس کو اپنی آپ بیتی کا حصہ بنا لیتا ہے۔ کیونکہ ایک انسان ہی ہے جس نے سمندروں کی گہرائیوں کا پتہ لگایا ہے اور بلند ترین آسمان کو چیرا ہے۔ وہ انسان ہی ہے جس نے کچھ کر دکھانے کی جستجو سے چاند پر قدم جمائے ہیں۔ یہ وہی انسان ہے جس نے اپنی ذات کا تعین کرنے کے لیے اپنے ساتھ ہونے والے واقعات کا خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ آپ بیتی کا تعلق انسان کے ظاہر و باطن دونوں سے ہے اس لیے وہ نہ صرف مادی چیزوں کا تذکرہ کرتا ہے بلکہ وہ اپنے قلبی حادثات کا تذکرہ بھی اپنی آپ بیتی میں کرتا ہے۔ مگر قلبی معاملات

کو بیان کرنا ایک مشکل ترین کام ہے۔ آپ بیتی دراصل کسی بھی شخص کا اپنی ذات کو تحریری انداز میں بیان کرنا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی بھی گوشہ باقی نہ رہے۔ یعنی آپ بیتی نگار اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو بتدریج بیان کرتا ہے۔ ایک کامیاب آپ بیتی کی سب سے بڑی خوبصورتی یہی ہے کہ واقعات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوں۔ اگر واقعات کی ترتیب کا خیال نہیں رکھا جائے تو قاری جلد اکتاہٹ کا شکار ہو جائے گا۔ جب کوئی تحریر اکتاہٹ امیز ہو گی تو اس کو پڑھنے والوں کی قلت ہو گی۔ کسی بھی چیز کو پڑھنے والوں کی قلت تحریر کی ناکامی کا سبب بنتی ہے۔ لہذا واقعات کو مناسب وقت پر مناسب جگہ پر رکھنا فن کار کی کامیابی کا باعث بنتا ہے۔ کسی بھی فن کار کی آپ بیتی کو پڑھنے کے بعد قاری اس شخصیت کے ظاہری معاملات سے اگاہی حاصل کرتا ہے بلکہ آپ بیتی نگار کے باطن میں پوشیدہ رازوں سے بھی خوب واقف ہو جاتا ہے۔ انسان نے ہمیشہ سے تحقیقی بنیادوں کو ترجیح دی ہے۔ انسان نے ہمیشہ اپنے ماحول میں موجود چیزوں کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ چیزوں کو تلاش کرنے کی اسی کوشش نے انسان کو اضطراب میں ڈالا۔ جن کی وجہ سے انسان نے قلم اٹھایا اور واقعات کو بیان کرنا شروع کیا جس کو آپ بیتی کا نام دیا گیا۔ شروع شروع میں آپ بیتی ایک غیر معروف صنف ادب مانی جاتی تھی مگر موجودہ دور میں یہ دلچسپ ترین صنفِ ادب مانی جاتی ہے۔ ماضی کے جھرکوں سے دیکھا جائے تو آپ بیتی کے نشانات تذکروں کے آخر پر نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ بیتی علما و صوفیا کرام کے خطابات کو ان کے پیروکار محفوظ کر لیتے تھے۔ تو ان خطابات کے اندر بھی آپ بیتی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے بعد زمانہ قدیم میں خطوط میں بھی آپ بیتی کے نشانات ملتے ہیں۔ مگر ان ساری باتوں پر جو مستند حوالہ ملتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ بیتی کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے آغاز میں ہی ہوا ہے۔ اس کے بعد اس صنف نے اردو ادب میں ایک مقام بنایا ہے۔ آپ بیتی کی روایت پر نظر دوڑانے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بیتی کی صنف کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے۔ یہ صنف شاعری کے بعض نمونوں، تذکروں اور فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی تالیقات کے دیباچوں وغیرہ میں بھی نظر آتی ہے۔ ماضی میں آپ بیتی کی جھلک خطوط، تذکروں، مثنویات، روزنامچوں، انٹرویوز رپورتاژوں وغیرہ میں واضح نظر آتی ہے۔ ان اصناف کو ابتدا میں آپ بیتی کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔ یہ تمام اصناف سخن پہلے بڑی تفصیل سے بیان ہو چکی ہیں۔ میں یہاں صرف شیخ سعدی کا ایک شعر جو انھوں نے سیاح کے حوالے سے قلم بند کیا ہے اس کو لکھ کر بات کو آگے بڑھاؤں گا۔

"غریب آشنا پاس و سیاح دوست
کہ سیاح جلاب نام نکوست"

شیخ سعدی کے اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ”تُو سیاح کا دوست بن جا کیوں کہ وہ ایک نیک آدمی ہے تاکہ وہ یہاں سے تمھاری اچھی یادیں لے کر رخصت ہو اور وہ جہاں جائے تمھارا ذکر اچھے الفاظ میں کرے“۔ اردو میں زیادہ تر نثری سفر نامے ملتے ہیں جن میں سیاح سفر کے دوران ہونے والی واردات کو قلم بند کرتا ہے۔ اردو ادب میں جس طرح منظوم آپ بیتی کی طرف توجہ نہیں تھی بالکل ایسے ہی اردو ادب میں منظوم سفر ناموں پر بھی کوئی خاطر خواہ کام نہیں ملتا۔ مگر چند ایک سفر نامے منظوم صورت میں ملتے ہیں جن میں حزن اختر، منیر شکوہ آبادی کا سفر نامہ، سفر حجاز، گلزار عرب، راہ وفا، دیار نبی ﷺ کاروان حرم وغیرہ۔ جہاں سفر نامہ نگاروں نے منظوم سفر نامے لکھے وہاں منظوم ڈرامے کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ ویسے تو ڈراما یونان والوں کی ایجاد ہے مگر دھیرے دھیرے سفر کرتے کرتے ہمارے اردو ادب میں بھی آ گیا۔ ڈاراما کو فارسی ادب نے بہت دیر بعد قبول کیا اسی وجہ سے ڈراما اردو ادب میں بہت دیر بعد آتا ہے۔ ڈراما کی جامع تعریف اگر کی جائے تو یہی زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے واقعات کو کسی منصوبے کے تحت سٹیج پر چند کرداروں کے ذریعے پیش کرنا ڈراما کہلاتا ہے۔ اردو ادب میں شکنتلا واحد ڈراما ہے جس کو اولیت کی حیثیت حاصل ہے۔ اس ڈرامہ میں مکالمہ نظم کی صورت میں کیا جاتا ہے۔

”بن میں صلہ ہو کر بہت ستائی<br>
شکنتلا تب ٹیر سنائی<br>
کات ادھر مدت نہیں تارے<br>
ہو تو نہیں کچھ ہو تھی چھارے“

شکنتلا کے بعد اندر سبھا میں بھی منظوم مکالمے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ڈرامہ میں ناچ، گانا، ٹھمریاں اور چولیاں وغیرہ کے عناصر خاصے مضبوط نظر آتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے ایک شعر پیش خدمت ہے۔

”غضب کا گانا ہے اور ناچ ہے قیامت کا<br>
بہار محشر کی آمد آمد ہے“

ڈراما ہمیشہ سے ہی شاعری کے ساتھ ساتھ منسلک رہا ہے۔ ارسطو کے خیال میں ڈراما شاعری کی ہی ایک قسم ہے۔ اردو ادب میں اٹھارویں صدی کے آخری عشرے میں منظوم ڈراما لکھنے کا آغاز ہوا۔ ڈرامے کے بعد منظوم داستانوں نے بھی منظوم آپ بیتی کے قریب ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ چوں کہ جب انسان کے ابتدائی دور

کی تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے ابتدائی مشاغل میں داستان سرِ فہرست ہے۔ یہ صنف بے ساختہ خود بہ خود وجود میں آتی ہے اور شاعری کی قدیم منزلوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ اس تحقیقی مقالے کی تکمیل کے لیے داستان کی تاریخ اور خاص کر منظوم داستان کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو ادب میں شعری ہئیتیں بہت ساری ہیں جن میں قصیدہ، مرثیہ، غزل، نظم، مثنوی اور ان سے جڑی بہت ساری اصناف میں آپ بیتی کے حوالے زیادہ مضبوط ہیں۔ اس تحقیقی مقالے کا موضوع ہی منظوم آپ بیتیوں کے ہئیتی و اسلوبی تقابل پر مشتمل ہے۔ اس لیے منظوم آپ بیتی اور مثنوی ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں جس کی وہ سے اس تحقیقی مقالے کی تکمیل کے لیے مثنوی پر بھی مختصر اَبات کی گئی ہے۔ اس تحقیقی مقالے کی تکمیل کے لیے "آدھی صدی کے بعد"، "آئینہ در آئینہ" اور "غم زمانہ بھی سہل گزرا" کا ہیتی و اسلوبی تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ہئیت ایک تنقیدی اصلاح ہے۔ جس کا مطلب کسی بھی چیز کی شکل و صورت ہوتی ہے۔ کوئی بھی چیز اپنی موجودہ صورت کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ اس تنقیدی اصطلاح کو سامنے رکھتے ہوئے پہلے مرحلے میں تینوں آپ بیتیوں کی ہئیت پر بات کی گئی ہے جس سے یہ بات سامنے ائی ہے کہ "آدھی صدی کے بعد" اور "غم زمانہ بھی سہل گزرا" ہیئتی اعتبار سے آزاد نظم کی ہئیت میں لکھی گئی ہیں۔ جبکہ ان کے ساتھ ساتھ تیسری آپ بیتی "آئینہ در آئینہ" مثنوی کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ جس کی ہئیت مثنوی کی صورت میں ہے۔ ہئیت ایک علم کا نام ہے۔ جس میں مختلف چیزوں کی اشکال کے حوالے سے بات کی جاتی ہے۔ جب کسی بھی فن پارے کو دوسرے سے ممتاز کیا جاتا ہے تو وہ اس کی ہئیت ہی ہے جو اس کو دوسری چیزوں سے بلند مقام عطا کرتی ہے۔ حفیظ جالندھری اس خیال کو مزید مضبوط بنانے کے لیے کہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں مثنوی، غزل، قصیدہ، مخمس، مسدس، سانیٹ، نظم و غزل اپنے خارجی پیکر کے ذریعے سے دوسرے سے ممیز ہوتی ہیں۔ کوئی بھی شعری فن پارہ ہو اس کی ایک مخصوص صورت ہوتی ہے۔ جس کو دیکھنے کے بعد ہم فوراََ فیصلہ کر لیں گے کہ یہ کیا ہے۔ انگریزی میں ہئیت کے لیے (Form) کا لفظ مستعمل ہے۔ نئی ہئیت کو متعارف کرانا خاصا کھٹن کام ہے۔ کیوں کہ نئی ہئیت جس ماحول میں سامنے آئے گی اس کے مخالفین زیادہ اور حمایتی کم ہوتے ہیں۔ نئی چیز پر لوگ بغیر تحقیق کے تنقید کرتے ہیں۔ ابتدا میں جو ہیئت منظر عام پر آتی ہے اس کو بہت زیادہ مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ فن پارہ اپنا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ آسکر وائلڈ (Form) کے حوالے سے کہتے ہیں:

Form is a myth, it is a secret of life start with the

worship of art that will not be reaveled to you"

اس تحقیق مقالے کی تکمیل میں ہئیت کے بعد تینوں منظوم آپ بیتیوں کا اسلوبی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں اسلوب کے لیے (Style) کا لفظ مستعمل ہے۔ اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب انداز نگارش ہے۔ نور اللغات کے مطابق اسلوب کے درج ذیل معنی سامنے آتے ہیں۔

۱۔ چال، ڈھب، ڈھنگ

۲۔ طریق، رواج، رسم، رویت

۳۔ ضابطہ، طرز، طریق

۴۔ فقرے کی تشکیل نوح

۵۔ مجسمہ، مٹ، پتھر کی مورتی

اسلوب کسی بھی فن کار کے فن پارے کا مضبوط ترین اصول ہے۔ اسلوب ایک ایسا طریقہ ہے جو اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کو قاری کے ذہن تک منتقل کرتا ہے۔ اسلوب کسی بھی فن پارے کی کامیابی اور ناکامی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر کسی ادیب کا اسلوب روکھا اور پیچیدہ ہے تو اس کی تحریر کو قاری پڑھے بغیر ہی چھوڑ دے گا لیکن اگر کسی ادیب کا اسلوب آسان اور عام فہم ہے تو وہ قاری کو پڑھنے پر مجبور کرے گا۔ جب کسی بھی فن پارے کے پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہو گی تو وہ اس ادبی فن پارے کو کامیاب بنا دیں گے اور جب کسی ادبی فن پارے کو پڑھے والوں کی تعداد قلیل ہو گی تو وہ فن پارہ ناکام ہو جائے گا۔ اسلوب اور فن کار کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسلوب فن کار کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ ایک قاری جب کسی ادیب کے ادبی فن پارے کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اس کی شخصیت ظاہر اور باطن دونوں سے اگاہ ہو جاتا ہے۔

اسلوب کے حوالے سے دو مکتبِ فکر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ افلاطون کا نظریہ اسلوب

۲۔ ارسطو کا نظریہ اسلوب

افلاطون کا نظریے کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ اسلوب جذبے کا نام ہے۔ ارسطو کے نظریہ اسلوب کو ماننے والوں کا خیال ہے کہ اسلوب کسی جذبے کے مورثی اظہار کا نام ہے۔ جب ایک ہی بات کو دو مختلف ادیب بیان

کریں گے تو موضوع ایک ہی ہو گا مگر انداز تحریر میں تضاد ہو گا۔ اس تحقیقی مقالے کا تیسرا بڑا حصہ تقابل پر مشتمل ہے۔ اس تحقیقی مقالے کی تکمیل کے لیے تینوں آپ بیتیوں کا ہئیتی مطالعہ کرنے کے بعد تینوں منظوم آپ بیتیوں کا اسلوبی مطالعہ کیا گیا ان دونوں عناصر کے بعد تینوں منظوم آپ بیتیوں کے درمیان تقابل کیا گیا۔ تقابل میں دو یا دو سے زیادہ ایک جیسی چیزوں کے درمیان ایک جیسی چیزوں اور اختلاف والی چیزوں کو الگ الگ کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کار کو مد نظر رکھتے ہوئی اس مقالے میں شامل منظوم آپ بیتیوں کے درمیان اشتراکات اور افتراقات کو الگ الگ کیا گیا۔ تقابلی ادب کی آوازیں انیسویں صدی کے شروع میں فرانس میں سنائی دی۔ فرانس میں پہلے پہل فرانسیسی زبانوں کے ادبی فن پارے کے درمیان تقابل کیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ تقابل پوری دنیا میں ہونے لگا۔

پروفیسر سوزن بیسنٹ کہتا ہے کہ تقابلی ادب مختلف متون کا مطالعہ ہے۔ یعنی جب ہم کسی ملک کی زبان کو جانیں گے تو اس ملک کی تہذیب و ثقافت کے نشانات بھی اس زبان کے اندر چھلکیں گے۔ تقابلی ادب کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے ترجمے نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ غیر زبانوں کے تراجم کر کے ان کی تخلیقات کا تقابل ہوتا رہا ہے۔ تقابلی ادب ترجمے کی ہی ایک شاخ معلوم ہوتا ہے۔ تقابلی ادب میں پینٹنگ، سنگ تراشی، آرکی ٹیکچر، موسیقی، فلسفہ سیاسیات، سماجیات، سائنس، مذہب وغیرہ بڑے موضوعات ہیں۔

تقابلی ادب کے دو بڑے دبستان ہیں۔ ان دبستانوں میں فرانس کا دبستان اور امریکہ کا دبستان شامل ہیں۔ Henry Remak جس کا تعلق امریکی دبستان سے ہے کے خیال میں تقابلی ادب کسی ایک ملک کی حدود سے نکل کر ادب کا مطالعہ ہے۔ جبکہ دوسری طرف فرانس کے دبستان سے تعلق رکھنے والے سکالر کے نظریے کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تقابلی ادب کی بنیاد کسی ملک کے حدود و قیود ہیں۔ تقابلی ادب میں تاریخ کا کردار ایک پیروکار کا کردار ہوتا ہے۔ لیکن تاریخ صرف و صرف ثقافتی ہونی چاہیے۔ تقابلی کا مطالعہ اور اس کی اہمیت کا اندازہ چند نکات سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ تقابلی مطالعہ چونکہ دو مختلف تہذیبوں اور علاقوں کے تحت لکھے گئے ادب کا مطالعہ ہے اس لیے یہ ایک عالمگیر معاشرے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

۲۔ تقابلی مطالعے کے تحت مصنف اپنی تحریروں کو دیگر ممالک کے ہاں متعارف کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

۳۔ دو تہذیبوں ملکوں، زبان، ادیان وغیرہ کے درمیان بھی تقابل کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ تقابلی ادب سے ایک ایسے ادب کو فروغ ملتا ہے جو حدود و قیود سے آزاد ہوتا ہے۔

۵۔ تقابلی مطالعہ سے مختلف علاقوں کی زبان اور کلچر سے اگاہی ہوتی ہے۔ مغرب میں تقابلی ادب کے دو بڑے دبستان ملتے ہیں۔

1. French School of thought
2. German School of thought
3. Amercan School of thought

French School of thought کی ابتداء۱۹۰۵ء میں فرانس سے ہوئی۔ ابتدا میں اس تحریک کا دائرہ محدود تھا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک اس تحریک نے عروج پکڑا اور اس دبستان کے تحت یورپین ممالک کے ادب کا جائزہ لیا جاتا تھا جس کی بنیاد حب الوطنی تھی۔

German School of thought انسویں صدی کے آخر پر وجود پزیر ہوا۔ اس دبستان کا نقطہ عروج ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۹ء تک ہے۔ اس دبستان کے تحت سماجی پس منظر رکھنے والوں ڈراموں اور Love Songs کا تقابل کیا جاتا تھا۔ اس کی بنیاد ساختیات پر ہے۔ Amercan School of thought فرنچ سکول آف تھاٹ کے رد عمل کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس دبستان میں ادب کو سرحدی بنیادوں سے آزاد کر دیا گیا۔ تقابلی ادب کی دو بڑی اقسام ہیں۔ جن میں بیانیہ تقابل اور اقداری تقابل قابل ذکر ہیں۔ بیانیہ تقابل ادب کے خارج کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جبکہ اقداری تقابل میں کسی چیز کا مرکزی پیمانہ مقرر کیا جاتا ہے اور اس کے اصول مقرر کر کے دو ایک جیسی چیزوں کے درمیان تقابل کیا جاتا ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں تین منظوم آپ بیتیاں شامل ہیں۔ جن میں دو کا تعلق آزاد نظم کی صورت سے ہے جبکہ ایک مثنوی کی ہئیت میں ترتیب دی گئی ہے۔ آزاد نظم کو انگلش میں (Free Verse) کہتے ہیں۔ جو کہ مغرب کی پیداوار ہے۔ آزاد نظم سفر کرتی ہوئی جب برصغیر پہنچی تو وہ اپنے ساتھ بہت سے موضوعات بھی لائی ہے۔ یہ نام سے آزاد ہوتی ہے وگرنہ اس کو بہت سے پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آزاد نظمیں بحر اور وزن کی پابندی کرتی ہیں۔ آزاد نظم کے مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں مگر وزن برقرار رہتا ہے۔

"لو گجر بج گیا

صبح ہونے کو ہے

دن نکلتے ہی اب چلا جاؤں گا

اجنبی شاہراؤں پر پھر

کاسۂ چشم لے کر ایک ایک چہرہ تکوں گا

دفتروں، کارخانوں میں تعلیم گاہوں میں جا کر

اپنی قیمت لگانے کی کوشش کروں گا"

یہ آزاد نظم ایک مثال پیش کی گئی ہے تا کہ بات واضح ہو سکے۔ آزاد نظم کہنا بہت آسان کام نہیں ہے۔ پابند نظم میں شاعر قافیے اور مصرعے کے سہارے سے بات کر لیتا ہے۔ آزاد نظم میں پہلے آہنگ پیدا کر کے اتنی ہی بات کریں جتنی کی ضرورت ہو۔ آزاد نظم میں کسی بحر کا سالم رکن وزن کا نمائندہ ہوتا ہے۔

اس بات کو مزید بہتر کرنے کے لیے تصدق حسین خالد کہتا ہے کہ میں اس بات کی پر زور تردید کرتا ہوں کہ ہم آزاد شعرا اس پہ لکھتے ہیں۔ قوافی و ردیف کی پابندی سے سکون حاصل کر سکیں۔ مگر اس الزام کو لگانے والوں کو یہ علم نہیں ہے آزاد نظم کہنا کتنا مشکل کام ہے۔ وزیر آغا کی نظم " آدھی صدی کے بعد " بھی آزاد نظم کی ہئیت میں لکھی گئی ہے۔ " آدھی صدی کے بعد "کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری اس منظوم آپ بیتی کی ہئیت، اسلوب اور وزیر آغا کی زندگی کے متعلق بہت کچھ جان لیتا ہے۔ " آدھی صدی کے بعد" وزیر آغا کی منظوم آپ بیتی ہے جس کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں جھرنا، ندی، دریا اور سمندر شامل ہیں۔

نظم کے پہلے حصے میں شاعر نے بچے کا اپنی ماں کو تلاش کے منظر کو بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجیے

"بیل گاڑی

میرے گاؤں کی گرم شہ رگ میں

اترے

معاً بیل گاڑی میں سے کود کر

یا بیل گاڑی کھوئے اپنے گھر میں

لپک کر گھسوں

ماں کے سینے سے ٹکراؤں"

ایک بچہ جو اپنی ماں کی تلاش میں ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں کسی بیل گاری سے کود کر اپنی باہنیں کھولے ہوئے بھاگ کر اپنی ماں کے سینے سے لگ جاؤں۔ وہ مجھے اپنے گرم ہونٹوں سے بوسہ دے کر اپنی گود

میں لے لے تا کہ میں زندگی کا سکون لے سکوں۔ نظم کے اس حصے کا مطالعہ قاری کو اپنے ماضی میں لے جاتا ہے۔ قاری وزیر آغا کی آپ بیتی کو اپنی آپ بیتی سمجھنے لگتا ہے۔ یہ آپ بیتی ہے مختلف ادوار پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا پہلا حصہ بچپن پر مشتمل ہے۔ جو بڑی خستہ حالی میں گزارا گیا مگر بچپن ہر انسان کی زندگی کا بادشاہ دور ہوتا ہے اس لیے وزیر آغا نے اپنا بچپن بڑی بے فکری کے ساتھ گاؤں کی شاہراؤں پر اپنے دوستوں کے ساتھ گزارا۔ وزیر آغا کی اس نظم میں پہلے پانچ سال کا کوئی واقعہ درج نہیں ہے۔ وزیر آغا کا کہنا ہے کہ میں نے بچپن کے ابتدائی پانچ سالوں میں بہت باریکی سے جھانکنے کی کوشش کی مگر مجھے صرف اندھیرا ہی نظر آیا اس لیے میں نے اس دور کے حوالے سے کچھ نہیں لکھا۔ وزیر آغا نے "آدھی صدی کے بعد" کے واقعات میں خاص ترتیب کا خیال رکھا۔ اس نظم میں منظر نگاری بھی بے مثال ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں بیل گاڑی اور رتھ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ رتھ آریا اپنے ساتھ لائے تھے جو کسی ماں کے متلاشی تھے۔ "آدھی صدی کے بعد" خالص دیہاتی نظم ہے۔ قاری اس نظم کو پڑھنے کے بعد خود سے دیہات کی خوشبو محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ وزیر آغا کی زندگی کا ایک بڑا حصہ وزیر کوٹ میں گزرا ہے۔ "آدھی صدی کے بعد" اسی دیہاتی ماحول میں پروان چڑھی ہے۔ اس لیے گاؤں وزیر آغا کی ذہنی، روحانی جذباتی اور تخلیقی زندگی کا اہم عنصر ہے۔ اس نظم کا دوسرا حصہ "جھرنا" پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں بھی زندگی کے خاص واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ زندگی کو محو سفر رکھتے ہوئے وہ ایک ایسے دور میں جا پہنچتا ہے جو ہر انسان کی زندگی کا تلخ ترین دور ہوتا ہے۔ یعنی اس دور میں وزیر آغا اپنا بچپن گزار کر جوانی میں قدم رکھتا ہے۔ اس دور کو وزیر آغا نے ندی کے ساتھ تشبیہ دیا ہے۔ ندی چونکہ گہری ہوتی ہے۔ اپنے اندر بہت کچھ سمونے کا ہنر رکھتی ہے۔ اس نظم میں بھی یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جس انسان کی جوانی بہتر گزری گویا اس نے کامیاب زندگی گزار لی ہے۔ جس طرح ندی گہری اور پر شور ہوتی ہے اس میں اضطراب ہوتا ہے بالکل جوانی پر شور اور مضطرب ہوتی ہے۔ اس دور میں انسان خود سے سوال کر کے ان کا جواب چاہتا ہے۔ بالکل ایسے ہی وزیر آغا نے بھی بہت سے سوالات کے جوابات کی طلب کیے ہیں۔

جھرنا اور ندی کے بعد "آدھی صدی کے بعد" کا تیسرا حصہ "دریا" ہے۔ "دریا" پکی عمر کی علامت ہے۔ وہ عمر جس میں فیصلے دل سے نہیں دماغ سے کیے جاتے ہیں۔ یہ وہ عمر ہے جس میں رکھ رکھاؤ کا عنصر واضح ہوتا ہے۔ وزیر آغا کی زندگی کے پہلے دو حصوں کے درمیان یعنی جھرنا اور ندی کے درمیان دریا پل کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ حصہ شاعری زندگی کا پُر سکون حصہ ہے۔ اس حصہ میں شاعر کے جسم اور عمر کے ساتھ ساتھ اس

کے علم میں خاصی پختگی آچکی تھی۔ وہ اس عمر میں ہر کام بڑی دانائی سے کر گزرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ اس نظم کا چوتھا اور آخری حصہ "سمندر" پر مشتمل ہے۔ سمندر گہرا اور وسیع ہوتا ہے۔ اس میں آئے دن طوفان کناروں سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ دریا خود کو سمندر کے حوالے کر کے اپنی ذات کی نفی کرتے ہیں۔ اس منظوم آپ بیتی کی ترتیب ہی کچھ یوں ہے کہ پہلے جھرنا آتا ہے، جھرنا خود کو ندی کے حوالے کرتا ہے، ندی دریا میں مل جاتی ہے اور دریا سمندر میں داخل ہو کر خود کو ختم کر لیتا ہے۔ یہ کہانی کا نقطہ عروج ہے جہاں شاعر اپنی زندگی کے پچاس سال مکمل کر کے اپنی آپ بیتی ختم ہے۔ اس پورے دورانیے کو ناقدین نے پچاس سال کا عرصہ قرار دے کر اس سنہری دور کا اختتام کرتے ہیں۔ مگر تسلسل ابھی تک برقرار ہے۔ اس خیال کو ڈاکٹر وزیر آغا کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

"وہ چھن بھر میں
کتنا بڑا ہو گیا
اچھلتے ہوئے شوخ جھرنے
جوں ندیاں
سست دریا
سبھی دست و بازو تھے اس کے"

اس تحقیقی مقالے میں دوسری آپ بیتی "آئینہ در آئینہ" ہے۔ یہ آپ بیتی حمایت علی شاعر کے قلم سے لکھی گئی ہے۔ آئینہ در آئینہ ایک طویل منظوم آپ بیتی ہے۔ یہ آپ بیتی تاریخی اعتبار سے بہت اہم آپ بیتی ہے۔ یہ اکاون اقساط پر مشتمل آپ بیتی مثنوی کی ہئیت میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی نظم کی ایک ایسی قسم ہوتی ہے۔ جس میں کوئی قصہ مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔ مثنوی کے ہر شعر کا قافیہ دوسرے شعر سے مختلف ہوتا ہے "آئینہ در آئینہ" میں بھی اسی ترتیب کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ آئینہ در آئینہ کا بھی ہر شعر دوسرے اشعار سے مختلف قافیہ رکھتا ہے۔ یہاں اس آپ بیتی کے پہلے حصے سے دو اشعار شامل کر کے بات میں وزن پیدا کیا گیا ہے۔

"میں اپنے شہر سے عنبرؔ چلا گیا ایک رات
مگر ارادے نئے لے گیا تھا اپنے ساتھ
تھا ان دنوں میرے ابا کا مستقر وہ شہر
خیال تھا، میرے حق میں ہے بے ضرر وہ شہر"

اس مثال میں شامل اشعار میں رات ، ساتھ ، مستقر، بے ضرر ایسے الفاظ ہیں جو بطور قافیہ استعمال ہوئے ہیں۔" آئینہ در آئینہ " ایک ایسی منظوم آپ بیتی ہے جس کا نقطہ آغاز ریاست حیدر آباد دکن سے ہے۔ اس ریاست کے ساتھ شاعر کی دلی وابستگی اس کے اباؤ اجداد کا یہاں پر اپنی زندگیاں گزارنا ہے۔ اور پھر اس ریاست میں شاعر خود بھی کئی حوالوں سے جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ویسے تو اس نظم کی ابتداء حیدر آباد کے علاقے اورنگ آباد سے ہوتی ہے مگر دیکھتے ہی دیکھتے اس نظم کا دامن پورے ہندوستان سمیت دنیا بھر کے مختلف ممالک تک پھیل جاتا ہے۔ حمایت علی شاعر نے اپنی اس آپ بیتی میں بڑے بڑے واقعات کو علامتی انداز میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔" آئینہ در آئینہ " میں تشبیہ ، استعارہ، مجاز، مرسل، کنایہ تلمیحات کا استعمال اس نظم کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔اس نظم میں پورے ہندوستان کی تہذیب کو کھول کر بیان کیا گیا ہے، پہاڑوں، دریاؤں، مقبروں، عمارتوں کا ذکر اس آپ بیتی کا خاصا مانا جاتا ہے۔ حمایت علی شاعر کی والدہ کی وفات کے بعد جب اس کا والد دوسری شادی کرتا ہے تو ایک عرصے بعد شاعر کو گھر میں سکون ملتا ہے۔ شاعر نے اپنے والد اور والدہ مرحومہ کے حوالے سے جو کچھ سنا تھا اس نظم میں من و عن درج کر دیا ہے۔ حمایت علی شاعر ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے ان کی زندگی میں بہت سارے لوگوں کا بڑا بلند مقام ہے جن میں شیخ چاند، سکندر علی واجد، عبش فردوسی، آغا صادق وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے شاعر کی زندگی میں بدلاؤ پیدا کیا۔ اس آپ بیتی کے اندر حمایت علی شاعر نے انگریز کی چالاکیوں کو بھی بڑے احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔ ان کے خیال میں برصغیر کی تقسیم میں انگریز نے بڑا کھل کر کردار ادا کیا۔ شاعر مختلف شہروں سے ہجرت کرتے کرتے ایک جگہ جالنہ جا پہنچے۔ جالنہ میں وہ ایک بزرگ عبد الغفور کے ہاں گئے جو بعد میں ان کے سسر ٹھہرے۔ جالنہ میں شاعر کو پہلی ہی نظر میں عبد الغفور کی بیٹی معراج سے عشق ہو گیا تھا۔ شاعر کو روزگار کے لیے وہ جگہ چھوڑنا ضروری تھی۔ لہذا شاعر پھر وہاں سے بھی مہاجر ہو کر دکن جا پہنچا۔ حمایت علی شاعر ہمیشہ اپنے خیالات میں اپنے محبوب کی محفل سجائے ہوئے خود سے ہم کلام رہتا۔ اس کیفیت میں شاعر نے بہت کچھ لکھا جو اس آپ بیتی کی زینت بنا۔

"تیرے چہرے کے یہ سادہ سے اچھوتے نقوش<br>
میرے تخیل کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں<br>
تیری زلفیں، تیری آنکھیں، تیرے عارض، تیرے ہونٹ<br>
کیسی ان جانی سی، معصوم خطا کرتے ہیں۔"

"آئینہ در آئینہ" ویسے تو ایک تاریخی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے، مگر اس آپ بیتی میں عشقیہ عناصر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس آپ بیتی کا مرکزی کردار معراج ہے جس سے حمایت علی شاعر عشق کر بیٹھتا ہے۔ اس آپ بیتی کا بیشتر حصہ معراج کے ارد گرد گھومتا ہے۔ یہ حمایت علی شاعر کی کامیاب محبت تھی۔ بعد میں معراج حمایت علی شاعر کی منکوحہ ہو گئی تھی۔ شاعر کہتا ہے کہ معراج کے ملنے کے بعد مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ میں کسی جنت میں ہوں اور پھول میرے آگے پیچھے رقص کر رہے ہیں۔ وہ اس شادی سے بہت زیادہ خوش اور مطمئن تھے۔

حمایت علی شاعر نے جس زمانے میں دکن ریڈیو کو جوائن کیا تھا اس زمانے میں وراث مرزا اور ماجد صاحب موجود تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ حمایت علی شاعر کی خوب بنی۔ دکن ریڈیو کے دور کو بھی اس آپ بیتی میں خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ حمایت علی شاعر اور معراج دونوں میاں بیوی ذہانت میں کسی سے کم نہیں تھے۔ دونوں بڑی اچھی نوکریاں کر رہے تھے کہ اچانک دونوں سیاست کی نذر ہو گے اور نوکریاں ختم ہو گئیں۔ اس وقت بھی انا اور خودی کا دامن نہ چھوڑا اور اللہ پر بھروسہ کر کے زندگی گزارنے لگے۔ حمایت علی شاعر اپنی خودی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ہم اپنی ذات میں ہیں آپ اک جہاں کی طرح
زمین پر بھی اگر ہیں تو آسماں کی طرح"

ان دنوں حمایت علی شاعر کے ہاں اللہ نے بیٹی جیسا حسین تحفہ عطا کیا تو حمایت علی شاعر نے بیٹی کے نام ایک نظم لکھ ڈالی جو اس آپ بیتی کا حصہ ہے۔ حمایت علی شاعر نے ۱۹۵۱ء کے ہنگامہ خیز دور کی تصویر کشی بھی بڑے سلیقے سے کی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں جب اعلان ہوا کہ پاکستان میں قانون شہریت نافذ ہونے والا ہے لہذا پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہونے والی حرکت و عمل کو ختم کر دیا جائے گا۔ یہ خبر شاعر کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ اس دور میں شاعر کو اپنی بیوی کے ساتھ ہجرت کا ذائقہ چکھنا پڑا۔ ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جانا بے شمار سوالات پیدا کرتا ہے۔ مگر حمایت علی شاعر خود کو حوصلہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"نئی زمین ہے تو کیا، آسمان تو ہو گا وہی
خدا تو ہو گا وہی، مہربان تو ہو گا وہی"

حمایت علی شاعر جب پاکستان کے شہر کراچی پہنچتے ہیں تو کراچی نے ان کو اپنی گود میں ایسے جگہ دی جیسے ماں بچے کو دیتی ہے۔ کراچی کی رنگینیاں دیکھ کر انکو بمبئی یاد آنے لگا کیونکہ بمبئی میں بھی کراچی جیسی

رنگینیاں تھی۔ حمایت علی شاعر نے ہجرت کے تلخ واقعات کو اس منظوم آپ بیتی میں بڑے سلیقے سے درج کیا ہے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد ایک دفعہ حمایت علی شاعر کو آواز آتی ہے وہ رک گئے اور ایک خاتون ان کو ساتھ بٹھا کر اپنے دولت خانے لے گئی۔ کھانا کھانے کے بعد ایک غزل جس کی ردیف "آنکھیں" تھی وہ سنانے کی فرمائش کی۔ حمایت علی شاعر نے اس خاتون کی فرمائش پوری کی اور غزل سنا دی۔ ایک دفعہ کراچی میں طلبہ اور پولیس کے درمیان تصادم ہوا جس کی زد میں بے شمار طالب علم شہید ہو گئے تھے۔ اس صورت حال کو بھی حمایت علی شاعر نے اپنی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ اس تصادم میں ایک بچہ شہید ہو گیا جس کی ماں کی بے قراری کو دیکھ کر حمایت علی شاعر کا قلم بھی جنبش میں آجاتا ہے۔ اور ایک نظم "دیوانی" لکھی۔ حمایت علی شاعر نے اپنی منظوم آپ بیتی میں اس نظم کو بھی شامل کیا۔ جس کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

"خوشیاں مناؤ، رقص کرو، قہقے لگاؤ

لوگوں خموش کیوں ہو، میرے ساتھ تم بھی گاؤ"

حمایت علی شاعر کی آپ بیتی تاریخی اعتبار سے ایک اہم آپ بیتی تسلیم کی جاتی ہے۔ اس آپ بیتی میں شاعر نے دوسری جنگ عظیم کے واقعات کو بھی منظوم انداز میں درج کیا ہے۔ جنھوں نے براہ راست شاعر کی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ آئینہ در آئینہ ایک مسلسل نظم نہیں ہے بلکہ اس نظم کے اندر مختلف واقعات مختلف نظمیں اور غزلیں بھی شامل ہیں۔ ناصر نامی مجاہد نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تھی تو حمایت علی شاعر نے اس پر ایک غزل لکھی تھی جو اس آپ بیتی میں شامل ہے۔ اس غزل کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

"میرے ہم دم میری پلکوں پر لرزتے ہوئے اشک

میرے دامن میں ندامت سے ٹپک جاتے ہیں"

اس غزل کے میں ایک روسی انقلابی خاتون کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ جس کا صرف یہ قصور تھا کہ اس نے "انالحق" کا نعرہ بلند کیا تھا۔ حمایت علی شاعر نے اس آپ بیتی میں امریکہ اور روس کے بنتے اور بگڑتے حالات کو بھی بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ۱۹۶۲ء کا آئین جب ترتیب دیا گیا تو محترمہ فاطمہ جناح وہ پہلی خاتون تھی جس کو مذہبی جماعتوں نے اپنا امیدوار منتخب کیا تھا۔ ملک فوجی اقتدار کے ہاتھوں چل رہا تھا اس لیے اہل وطن بڑی کس مپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ لوگ فوجی حکومت سے ناخوش تھے اس لیے جب اس زمانے کے بڑے ادیب سبط حسن نے اپنی کتاب "ماضی کے مزار" لکھی تو حکومت نے ان کو آدم جی ایوارڈ دینا چاہا مگر

انھوں نے ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی دور میں نصیر الدین جو بلوچی زبان کا نامور شاعر تھا، نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے ایک غزل لکھی جس کا مطلع پیش خدمت ہے۔

"ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ"

اس آپ بیتی میں ہندوستان اور پاکستان کا ایسا کوئی شہر نہیں ہے جس کو شامل نہ کیا گیا ہو۔ اس آپ بیتی کا اسلوبی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس آپ بیتی میں تلمیحات کا استعمال بھی کیا ہے۔

" طلسم شام" کہوں یا فسونِ گو سالہ
سبھی ہوئے "من و سلوٰی" ہیں پھر سے ہم پیالہ"

حمایت علی شاعر کی دکن سے محبت بہت باکمال تھی مگر ہجرت کرنے کے بعد شاعر ۳۵ سال تک وہاں نہ جا سکے۔ جب اردو ٹرسٹ کا پہلا مشاعرہ کرایا گیا جس میں شاعر کو بھی مدعو کیا گیا۔ شاعر جب وہاں پہنچتا ہے تو اس کو ہر چیز نئی نئی معلوم ہوتی تھی مگر اس کے بزرگ نہیں تھے جن کے سائے میں اس نے زندگی گزاری تھی۔ حمایت علی شاعر نے "آئینہ در آئینہ" میں پاکستان میں لگنے والے مارشل لاؤں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا۔ وہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں ہونے والی زیادتیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہی کہ پاکستان میں اس وقت ایک ایسے ناخدا کا راج ہے جس کی کشتی اکثر طوفانوں میں رہتی تھی مگر اس ناخدا کو اس صورت حال سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔

حمایت علی شاعر اپنے محبوب سے ملاقات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ جب میرا سامنا معراج سے ہوا تو مجھے لگا کہ دو چاند آج رات میری دہلیز پر اتر آیا ہے۔ اور خدا نے مجھ پر خصوصی کرم کیا ہے۔ حمایت علی شاعر جب سعودی عرب میں جاتے ہیں تو عرب کے جاہل معاشرے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا کے گھر سے اونچے اونچے ہوٹل اور عمارتیں بنائی گئی ہیں۔ ان عمارتوں اور ہوٹلوں کے اندر ہر طرح کی غلط کاری ہوتی ہے۔ وہ جہاں بھی جاتے حمایت علی شاعر کی نظروں میں پاکستان کا چہرہ رہتا۔ حمایت ہمیشہ قومی یگانگت کے پیروکار تھے۔ مگر ملکی صورت حال شاعر کی سوچ سے بالکل مختلف تھی۔ حمایت علی شاعر نے نوجوانوں سے مخاطب ہو کر ایک نظم لکھی جس کا عنوان ہے۔

ع۔ "وطن کی فکر کر ناداں۔۔۔"

یہ مصرع علامہ اقبال کی نظم کا ہے مگر اس نظم میں حرص و ہوس کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظم لکھتے وقت شاعر کی آنکھیں اشک بار تھیں اور لبوں پر دعا تھی

"میرے وطن، میری ہر اک دعا ہے تیرے لیے
میرے خدا سے میری التجا ہے تیرے لیے"

شاعر نے اپنے خاص لہجے میں "آئینہ در آئینہ" کی آخری قسط کو بھی بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس آخری قسط میں جنرل ضیاء الحق کے حادثے کو بیان کیا گیا جو ۱۹۸۸ء میں ہوا تھا۔ اس حادثے میں ضیاء الحق سمیت عملے کے سارے لوگ لقمہ اجل بنے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں غلام اسحاق نے بے نظیر بھٹو کو ملک کا وزیر اعظم بنایا اور پھر ۱۹۹۰ء میں بے نظیر کو برطرف کر دیا گیا۔ ان کی جگہ غلام مصطفیٰ خان جتوئی ملک کے وزیر اعظم بنے۔ لیکن زیادہ عرصہ یہ بھی نہ چل سکے۔ سکہ پھر سے اچھالا گیا تو فیصلہ نواز شریف کے حق میں آیا۔ ۱۹۹۰ء میں نواز شریف پاکستان کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۰ء تک پاکستان کی سیاسی صورت حال "آئینہ در آئینہ" کا خاص موضوع رہی۔ اس منظوم آپ بیتی کا نقطہ آغاز اورنگ آباد شہر ہے مگر اس آپ بیتی کو مکمل کرنے میں حمایت علی شاعر نے مختلف ممالک کا تذکرہ کیا اور آخر کار حمایت علی شاعر نے

"یار زندہ صحبت باقی
کہہ کر "آئینہ در آئینہ" کی تکمیل کی۔"

اس تحقیقی مقالے میں تیسری منظوم آپ بیتی "غم زمانہ بھی سہل گزرا" شامل ہے۔ "غم زمانہ بھی سہل گزرا" ادیب سہیل کی بہترین آپ بیتی ہے۔ اس آپ بیتی میں شاعر نے اپنی زندگی میں ہونے والے حادثات کو ترتیب وار لکھا ہے۔ یہ آپ بیتی ادیب سہیل نے عمر کے اس حصے میں لکھی جب انسانوں کے اندر سے خواہشات مر چکی ہوتی ہیں۔ مگر اس آپ بیتی کو پڑھنے کے بعد یوں لگتا ہے کہ یہ کسی نوجوان کی لکھی ہوئی تحریر ہے۔ اس آپ بیتی کا مرکزی کردار عارفہ ہے۔ عارفہ ادیب سہیل کی محبوبہ ہوتی ہے۔ تگ و دو کے بعد عارفہ کو ادیب سہیل پوری زندگی کے لیے اپنے ساتھ شامل کر لیتا ہے۔ ادیب سہیل کے اعصاب پر عارفہ پوری طاقت کے ساتھ حاوی نظر آتی ہے۔ اس آپ بیتی کا ایک بڑا حوالہ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کا ہے۔ اس تقسیم کے بعد ہجرت ایک تلخ تجربہ تھی جو لوگوں کو کرنا پڑی۔ جہاں دوسرے لوگ اس تجربے سے دوچار تھے وہاں ادیب سہیل کو بھی اس معطلے سے گزرنا پڑا۔ اس آپ بیتی کا آغاز ایک شادی والے گھر سے ہوتا ہے جب عارفہ کی عمر دو اڑھائی سال تھی جبکہ ادیب سہیل کی عمر آٹھ سال تھی۔ ادیب سہیل اور

عارفہ کی محبت کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ ادیب سہیل اور عارفہ ایک دوسرے سے کبھی کبھار ملتے رہتے تھے۔یوں ہی زندگی کی ٹرین بڑی تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔ہندوستان میں انگریزوں اور ہندوستان والوں کے درمیان پھر سے جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس آپ بیتی میں ہندوستان کی تہذیب میں شامل رقص و سرور کی محفلوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم میں زہرہ کی شادی میں شامل ہونے والی رقاصائیں محفل میں خوب رنگ بھر رہی تھیں۔ اس محفل میں نائلہ سب سے حسین لڑکی تھی جس کی سلام دعا زہرہ کے سسر اور فیاض کے ماموں سے تھی۔ نائلہ نے اپنی طلمسی آواز سے اپنے چاہنے والوں کے دل جیت لیے تھے۔ یہ وہی دور تھا جب انگریزوں کی جنگ ہندوستانیوں سے تھی۔ انگریز جنگ جیت چکے تھے اور وکٹری ڈے منانے کے لیے تیاریاں کر رہے تھے کہ سبھاش چندر بوش کو یہ سب برداشت نہ ہوا۔ سبھاش چندر بوش نے انگریزوں کا راستہ روکا۔ پھر سے لرائی زور پکڑ گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد نگ بندی کا اعلان ہوا اور میں جلدی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ کلکتہ جب میں ہوڑا اسٹیشن پر پہنچا تو عارفہ کے والد کے ساتھ میرے ہر اچھے برے وقت کا ساتھی قمر بھی ان کے ساتھ میرا منتظر تھا۔ عارفہ کے والد نے قمر سے کہا کہ تم گھر خط لکھ دو کہ ذکی آ گیا ہے لہذا ان دونوں کا نکاح اگلے جمعہ کو ہونا قرار پایا ہے۔ وہ وقت میرے لیے سب سے حسین وقت تھا۔ یہ مارچ ۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا جب عارفہ ہمیشہ کے لیے میری ہو گئی تھی۔ میری اور عارفہ کی شادی کو ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ مجھے گاؤں چھوڑ کر واپس کلکتہ جانا پڑا۔ ہجرت کا یہ تجربہ ادیب سہیل کے لیے کافی سخت تھا۔ وہ ایک دوسرے کی جدائی کو بڑی مشکل سے برداشت کر رہے تھے ۔ ہجر میں وصال کے مزے لینے کے لیے انھوں نے خطوط کا سہارا لیا۔ عارفہ اپنے سرتاج کو پہلا خط کچھ اس انداز میں لکھتی ہے۔

خط

"سرتاجِ من سلامت!

میں خیریت سے ہوں

آپ کی خیریت کی خواہاں

لکھا ہے ابا نے،

اگلے ماہ آ رہے ہیں

آپ ان کے ساتھ ہوں گے ؟"

ادیب سہیل خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"عزیز از جان پیاری عارفہ !

تم میری جانب سے

پیار کے سرخ پھول لے لو

ہمارے دل کی طرف سے تم

جدا ہوئے تم سے دو ہفتے ہو چکے ہیں

تمھارے خط کی ہنوز آنکھیں ترس رہی ہیں

تمھاری وعدہ خلافیوں کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا

تمھاری فرصت کے لمحے ہم پر تھے یوں ہی بھاری

اور اس پر چپ کا یہ سلسلہ ہم کو اور بے کل بنا رہا ہے

تمھاری بس اک اسی ادا سے

مصالحت ہم نہ کر سکیں گے"

خطوط کا یہ سلسلہ اس آپ بیتی کے اسلوب میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو خطوط کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ شادی کے بعد گاؤں میں ادیب سہیل اور عارفہ کی پہلی عید تھی گھر والوں سمیت یہ دونوں بھی بہت خوش تھے وہ عید کے چاند کو دیکھنے کا منظر کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

"میں عید کا چاند دیکھنے گیا

سر شام گھر سے باہر

تو چاند نکلا، کا شور بچوں میں کھلتا تھا

نگاہ سوئے فلک جما کر

دعا کی خاطر اٹھائے جب ہاتھ

تو انگوٹھے میں پاؤں کے سانپ ڈس گیا تھا"

عید کا چاند دیکھنے کی حسرت ہر مسلمان کو ہوتی ہے۔ ادیب سہیل بھی عید کا چاند دیکھنے کے لیے گھر سے باہر نکلے۔ ہر طرف بہت شور تھا کہ چاند نظر آ گیا۔ بچے بہت زیادہ خوش تھے۔ جب شاعر نے دعا کے

لیے ہاتھ اُٹھائے تو تب ایک زہریلا سانپ شاعر کے پاؤں کو ڈس گیا تھا۔ پورے محلے میں بے چینی کی کیفیت پھیل گئی تھی۔ ہر کوئی ادیب سہیل کو بچانے کے لیے اپنی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ ایک ماندری جو زہر کے متعلق علم رکھتا تھا اس نے ادیب سہیل کی جان تو بچالی مگر سارے لوگ عید کی خوشیاں منانے سے محروم ہو گئے تھے۔ کچھ وقت گزارنے کے بعد عارفہ اور ادیب سہیل کلکتہ چلے گئے۔ اس وقت ہر طرف خوف اور ہراس کا عالم تھا۔ ہر جگہ انقلابی نعرے لکھے ہوئے تھے۔ انگریزوں کے خلاف ہندوستان والے باغیانہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ انگریز ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر انگریز نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کا بیج بو دیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا شدہ نفرت کو ادیب سہیل نے کچھ یوں بیان کیا ہے کہ ان دنوں تین مسلمان بھائی بھول کر ہندوؤں کے محلے میں جا پہنچے۔ لوگ چھریاں اور چاقو لے کر ان کو قتل کرنے کے لیے تیار تھے کہ ایک خدا ترس ہندو آیا اور ان تینوں بھائیوں کو اپنی ماں کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ ایسی صورت حال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک جگہ رہنا بہت مشکل تھا اس لیے زیادہ تر مسلمان ہجرت کر کے پاکستان منتقل ہو رہے تھے۔ ہم نے بھی ہجرت کو بہتر جانا اور پاکستان کا رُخ کیا۔ میرے قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلنے والی میری عارفہ نے مجھے تھکنے نہیں دیا۔ میرے اور عارفہ کے درمیان محبت کا جو بیج انچاس سال پہلے بویا گیا تھا وہ اب تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ادیب سہیل نے اپنی اس منظوم آپ بیتی میں بتایا ہے کہ میں ایک مطمئن آدمی ہوں۔ میں نے ہمیشہ تھوڑے کو زیادہ جانا ہے۔ مجھے زندگی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میں نے زندگی کے ہر چیلنج کو قبول کیا ہے۔ میں نے زندگی بھرپور انداز میں گزاری ہے اور میں چاہتا ہوں کہ دوسرے بھی زندگی کو خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کریں۔

## ب۔ تحقیقی نتائج

ا۔ منظوم آپ بیتی ۱۹۸۱ء سے پہلے نہیں تھی۔ بعض اصناف میں منظوم آپ بیتی کی جھلک ضرور ملتی ہے جن میں مثنوی اور منظوم سفر نامے سرِ فہرست ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں وزیر آغا نے "آدھی صدی کے بعد" لکھ کر منظوم آپ بیتی کی روایت ڈالی۔

۲۔ تینوں منظوم آپ بیتیوں میں سے دو آزاد نظم کی ہئیت میں لکھی گئی ہیں ان دو میں ''آدھی صدی کے بعد'' اور ''غم زمانہ بھی سہل گزرا'' آزاد نظم کی صورت میں ہیں جبکہ ''آئینہ در آئینہ'' مثنوی کی ہئیت میں لکھی گئی ہے۔

۳۔ تینوں منظوم آپ بیتیوں کا اسلوب بہت اچھا ہے۔ مگر ''غم زمانہ بھی سہل گزرا'' میں شاعر نے بڑے نپے تلے الفاظ استعمال کر کے اپنی کہانی کو منظوم انداز میں بیان کیا ہے۔

۴۔ تینوں آپ بیتیوں میں مشترک قدر یہ ہے کہ تینوں منظوم ہیں۔

۵۔ تینوں آپ بیتیوں میں جو بڑا اختلاف پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دو آپ بیتیاں آزاد نظم کی ہئیت میں لکھی گئی ہیں جبکہ ایک مثنوی کی ہئیت میں لکھی گئی ہے۔

۶۔ تینوں آپ بیتیوں میں جنگ و جدل، خستہ حالی، محبت، نفرت، ہجرت، بے روزگاری، قتل و غارت، انگریزوں کی ناانصافیوں جیسے عناصر بڑے واضح ملتے ہیں۔

۷۔ تینوں آپ بیتیوں میں عربی، ہندی، انگریزی، فارسی زبان کے الفاظ کی آمیزش پائی جاتی ہے۔

۸۔ تینوں منظوم آپ بیتیوں کو وہ شہرت نہیں ملی جو ملنی چاہیے تھی۔

**ج۔ سفارشات**

1۔ یہ صنف اتنی مقبول نہیں ہے جتنی ہونی چاہیے۔ حالانکہ نثری آپ بیتی کے مقابلے میں منظوم آپ بیتی میں قاری کے لیے زیادہ سہولت ہوتی ہے کہ وہ ایک تیر سے دو شکار کرے یعنی آپ بیتی بھی پڑھے اور شاعری بھی۔ لہٰذا میں منظوم آپ بیتی کے فروغ کے لیے کام کرنے کی سفارش پیش کرتا ہوں۔

2۔ تینوں منظوم آپ بیتیاں تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ ان تینوں منظوم آپ بیتیوں میں تاریخی تقابل کی گنجائش بنتی ہے۔ اگر کوئی مستقبل میں کام کرنا چاہے تو تاریخی تقابل ایک اچھا موضوع بن سکتا ہے۔

3۔ اردو ادب میں ابھی تک منظوم سفر ناموں پر کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ منظوم سفر ناموں پر تحقیقی کام کی گنجائش باقی ہے۔

4۔ اردو کی چند طویل نظموں کی اگر بات کریں تو ان میں ان تینوں کا شمار بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا طویل نظموں پر فنی و فکری اعتبار سے کام کیا جا سکتا ہے۔

5۔ آزاد نظم پر اگر از سرِ نو کام کی گنجائش نکلتی ہے تو "آدھی صدی کے بعد" اور "غم زمانہ بھی سہل گزرا" کو اس تحقیقی کام میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

6۔ ان تینوں منظوم آپ بیتیوں میں ہجرت ایک بڑا حوالہ ہے۔ اگر کوئی نظموں میں ہجرت کے عناصر پر کام کرنا چاہے تو یہ تینوں منظوم آپ بیتیاں بھی اس حوالے سے اہم ہیں۔

7۔ اردو کی منظوم آپ بیتیوں کا دنیا کی دیگر منظوم آپ بیتیوں کے ساتھ تقابل کیا جا سکتا ہے۔

# کتابیات

## بنیادی مآخذ(Working Bibliography)

وزیر آغا"آدھی صدی کے بعد"مکتبہ اردو زبان، ریلوے روڈ، سر گودھا،۱۹۸۱۔

حمایت علی شاعر "آئینہ در آئینہ" دنیائے ادب ۶۲۴، ریگل ٹریڈ اسکوائر ریگل چوک صدر کراچی، پاکستان، ۲۰۰۱۔

ادیب سہیل "غم زمانہ بھی سہل گزرا"، فکشن ہاؤس،۱۸، مزنگ روڈ، لاہور، ۲۰۰۳،

## ثانوی مآخذ((Secodary Sources

عابد علی عابد، "اسلوب"، مجلس ترقی ادب، لاہور، دسمبر ۱۹۷۱ء۔

قاسم یعقوب، "اردو میں اسلوب اور اسلوبیات کے مباحث"(منتخب تنقیدی مقالات) سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۷ء۔

محسنہ، نقوی، سیدہ، پروفیسر، ڈاکٹر "اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر و رویت"(منتخب مقالات)، فرحان رضا پرنٹرز، راولپنڈی ۲۰۱۵ء۔

سوزن بیسنٹ، "تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ"، یورپ اکادمی، اسلام آباد ۲۰۱۵ء۔

حسن نظامی، خواجہ، "آپ بیتی"، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی ۱۹۱۹ء۔

سلیم اختر، ڈاکٹر، "نشانِ جگر سوختہ"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء۔

جوش ملیح آبادی، "یادوں کی برات"، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء۔

وزیر آغا، "شام کی منڈیر سے"، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۸۶ء۔

انور سدید، ڈاکٹر، "اردو ادب کی تاریخ" عزیز بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۶

حفیظ صدیقی، ابو الاعجاز، "کشاف تنقیدی اصطلاحات"، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۱۸ء۔

اشرف کمال، ڈاکٹر، "تاریخ اصنافِ نظم و نثر"، سٹی بک ڈپو، ۲۰۱۷ء۔

ثاقب رزمی، "ترقی پسند نظریہ ادب کی تشکیل جدید، "آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

قمر رئیس، "ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر"، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

رفیع الدین ہاشمی، جامعات میں اردو تحقیق، ایچ ای سی، اسلام آباد۔

سلیم اختر محمد، فہرستِ مقالہ جات، اردو ادب بلحاظ الف بائی ترتیب اگست ۲۰۲۰ء۔

"ناول کیا ہے" پروفیسر نور الحق ہاشمی، درد اکادمی، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور، ۱۹۶۴ء

سیدہ محسنہ ، نقوی، داکٹر، پروفیسر، اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر و رویت ، (منتخب مقالات) ، فرحان رضا پرنٹرز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء
محمد حسن، ڈاکٹر، ہیئتی تنقید، کاروان ادب، لاہور، ۱۹۹۸ء
ادیب سہیل، "غم زمانہ بھی سہل گزرا" القادر پریس، کراچی، ۲۰۰۳ء
وزیر آغا، ڈاکٹر، "آدھی صدی کے بعد" مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۸۱ء
وزیر آغا، ڈاکٹر، "اردو شاعری کا مزاج"، جدید ناشرین، لاہور، ۱۹۶۵ء
ناہید قاسمی، ڈاکٹر، "جدید شاعری میں فطرت نگاری" انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۵ء
انور سدید، ڈاکٹر، "اردو ادب کی تحریکیں" انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۵ء
شاید شیدائی "بحوالہ بیاض شب و روز از ارمان نجمی" کاغذی پیرہن، لاہور، ۲۰۰۱ء
ابوالاعجاز، حفیظ صدیقی، "کشاف تنقیدی اصطلاحات" مقتدرہ، قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء
ناصر عباس نئیر، ڈاکٹر، "مکتوب بنام راقم" استاد شعبہ اردو جامعہ پنجاب، لاہور، مکتوب محررہ ۱۸۔ ستمبر ۲۰۰۹ء
ارشد محمود ، ناشاد ، ڈاکٹر، مکتوب بنام راقم شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ، مکتوب محررہ ۲۳۔ اکتوبر، ۲۰۰۹ء
ضیاالحسن، ڈاکٹر، مکتوب بنام راقم استاد شعبہ اردو جامعہ پنجاب، لاہور، مکتوب محررہ ۲، ستمبر ۲۰۰۹ء
طارق حبیب، مکتوب بنام راقم، استاد شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا، مکتوب محررہ ۱۱۔ نومبر ۲۰۰۹ء
ن۔م راشد، "کلیات راشد" ماورا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء
میراجی۔ "کلیات میراجی"، مرتبہ جمیل جالبی، ڈاکٹر، اردو مرکز، لندن، ۱۹۸۸ء
راحت نسیم ملک، شعری تجربہ مشمولہ نئی شاعری مرتبہ افتخار جالب، سنگت پبلشرز، لاہور
قرشی علی محمد، نظم، "حقیقت" مطبوعہ سہ ماہی نقاط، فیصل آباد، ۲۲۰۷ء
محمد حسین آزاد "نظم آزاد"، مطبوعہ کریمی پریس، لاہور، ۱۹۲۶
اصناف ادب کا ارتقاء، مرتضیٰ، سید، نظامی پریس، لکھنو، سن نداد
ضیاء الحسن، ڈاکٹر، "جدید اردو نظم کے فروغ میں آزاد کی خدمات"، مشمولہ آزاد صدی مقالات، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۲۰۱۰ء
جیلانی کامران، نئی نظم کے تقاضے، لاہور، کتابیات، ۱۹۶۷ء
عابد علی عابد، سید، "اسلوب" مجلس ترقی ادب، لاہور دسمبر: ۱۹۷۱ء

سیدہ، محسنہ ، نقوی ، ڈاکٹر، پروفیسر، ''اسلوب و اسلوبیات کی تعبیر و روایت ''منتخب مقالات ، فرحان رضا پرنٹرز، راولپنڈی، جون، ۲۰۰۵ء
خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر، ''زبان، اسلوب اور اسلوبیات'' بک ٹاک، ٹیمپل روڈ، لاہور، ۲۰۲۰ء
ادیب سہیل، ''غم زمانہ بھی سہل گزرا'' القادر پریس، کراچی، ۲۰۰۳ء
فیروز اللغات، مولوی فیروز الدین، فیروز سنز، لاہور، راولپنڈی، کراچی، ۲۰۰۵ء
اردو کی شعری اصناف، اکرم خواجہ، ڈاکٹر، سیو نتھو سکائی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴
مقدم شعر و شاعری، الطاف حسین حالی
آئینہ در آئینہ (منظوم خود نوشت سوانح حیات) حمایت علی شاعر دنیائے ادب، کراچی، ۲۰۰۱
حمایت علی شاعر، دنیائے ادب، کراچی، ۲۰۰۱ء
اردو کی مشہور مثنویاں، مضمون اصناف سخن نمبر، نگار، جنوری، فروری، ۱۹۵۷ء
''آئینہ در آئینہ ''(منظوم خود نوشت سوانح حیات)، حمایت علی شاعر، دنیائے ادب، کراچی، ۲۰۰۱ء
اردو میں اسلوب اور اسلوبیات کی مباحث منتخب تنقیدی مقالات، قاسم یعقوب، سٹی پوائنٹ کراچی، ۲۰۰۷ء
''اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر و روایت ''(منتخب مقالات) سیدہ محسنہ نقوی، پروفیسر، ڈاکٹر راولپنڈی، ۲۰۰۵ء
جان اسنپسر، تعارف، Linguistics and style مرتبہ نلز ایرک انکوسٹ اور دیگر لندن، آکسفورڈ، یونیورسٹی، پریس، ۱۹۶۴ء
عابد علی عابد، ''اسلوب''، علی گڑھ، ایجوکیشن بک ہاؤس، ۱۹۷۶ء
جان مڈلٹن "The problem of style" آکسفورڈ، پیپر بکس، ۱۹۶۷ء
''ترقی پسند تحریک اپنے آئینے میں'' وحید قریشی، ڈاکٹر، ۱۹۷۰ء
''نسخہ ہائے وفا، فیض احمد فیض، کارواں پریس لاہور، سن ندارد
محمد طفیل، ''تصریحات''، نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء
مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغِ اردو، لاہور ۱۹۶۴ء
ریحانہ خانم، ''آپ بیتی کیا ہے''، مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور ۱۹۶۴ء

انصاری، یوسف جمال، ”آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں“مشمولہ نقوش آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو لاہور ۱۹۶۴ء

عبداللہ، سید، ڈاکٹر ”وجہی سے عبدالحق تک“، مکتبہ خیابان ادب، لاہور ۱۹۷۷ء

ندیم احمد، ڈاکٹر، ”بیسویں صدی میں خود نوشت سوانح عمری“، مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء

ریحانہ خانم، ”آپ بیتی کیا ہے؟“، مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۴ء

انور سدید، ڈاکٹ ''اردو ادب میں سفر نامہ“مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات (ترمیم و اضافہ جات کے ساتھ) نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۱۶ء

عارف نقوی، منظوم ڈرامے کی روایت، پبلی کیشن ڈویژن، سافت وئیر ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ، ۲۰۰۱ء

ابوالاعجاز صدیقی، اصنافِ ادب، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۲ء

امیر خسرو، کلیات ہندی امیر خسرو، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، ۲۰۱۷ء

مومن خان مومن، کلیاتِ مومن، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء

فرمان فتح پوری ڈاکٹر، اردو کی منظوم داستانیں، انجمن ترقی اردو پاکستان ۲۰۰۲ء

عارف نقوی، منظوم ڈرامے کی روایت، پبلی کیشن ڈویژن سافٹ وئیر ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۰۱ء

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیلاب پرنٹرز گوالمنڈی، راولپنڈی، ۲۰۱۶ء

ادارہ مترجمین، المنجد، (عربی۔ اردو) کراچی، دار الاشاعت، ۱۹۷۴ء

سید احمد دہلوی جلد سوم و چہارم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور (۱۹۸۶'۱۹۸۵)ء

عنوان چشتی'ڈاکٹر، اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے، انجمن ترقی اردو، دلی، ۱۹۷۵ء

شمیم احمد، اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۳ء

جابر علی سید، تنقید و تحقیق، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۸۷ء

حسن محمد، ڈاکٹر، ہیئتی تنقید، کاروانِ ادب، لاہور، ۱۹۸۹ء

ارشد محمود، ناشاد، ڈاکٹر، اردو غزل کا تکنیکی ، ہیئتی اور عروضی سفر، مجلس ترقی ادب، لاہور، اگست، ۲۰۰۸ء

سیدہ، محسنہ، نقوی، پروفیسر، ڈاکٹر، اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر و روایت (منتخب مقالات) رضا پرنٹرز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء

خلیل احمد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، زبان، اسلوب اور اسلوبیات، بھٹو پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۲۰ء

سیدہ، محسنہ، نقوی، پروفیسر، ڈاکٹر، اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر و روایت (منتخب مقالات) رضا پرنٹرز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء

قاسم یعقوب، اردو میں اسلوب اور اسلوبیات کے بنیادی مباحث (منتخب مقالات) ، سٹی بک پوائنٹ ، کراچی، ۲۰۱۷

سوزن بیسنٹ، ترجمہ، توحید احمد، تقابلی ادب ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

ابو الاعجاز، صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، سن ندارد

## رسائل وجرائد:

فنون، لاہور، شمارہ نمبر، ۲، جلد: ۲۱، اگست ۱۹۷۷ء۔

سہ ماہی ادبیات، جلد ۲، اسلام آباد، جولائی تا ستمبر ۱۹۸۸ء سمارہ: ۶۔۵۔

یوسف خشک، ڈاکٹر، ادبیات، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، پاکستان، ۲۰۱۹ء۔

ڈاکٹر وزیر آغا اور میر اعہد، رشید نثار، فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، ۱۹۹۸ء۔

بازیافت۔ ۳۰ (جنوری تا جون ۲۰۱۷ء) شعبہ اردو اور نٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

"چار سو"، تہامہ، راولپنڈی، جلد دوم، شمارہ: ۱۸ جنوری، ۱۹۹۴ء۔

سید ضمیر جعفری، فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی۔

"نقوش آپ بیتی نمبر"، محمد طفیل: ادارہ فروغ اردو لاہور جون، ۱۹۶۴ء۔

روزنامہ، "جنگ" مورخہ ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۱،

"ماہ نور" اشاعت خاص اکتوبر ۱۹۶۴ء

## غیر مطبوعہ کتب:

پاکستانی سیاسی آپ بیتیوں میں سیاسی، سماجی شعور کا تقابل "فرزندِ پاکستان" اور ہم بھی وہاں موجود تھے" کے حوالے سے

ملتان کے تین سیاستدانوں کی خود نوشتوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (یوسف رضا گیلانی، جاوید ہاشمی، صاحبزادہ فاروق علی)

اردو ادب کی آپ بیتیاں تحقیقی و تنقیدی جائزہ (اطہر قسیم، ۲۰۰۸ء، نمل: اسلام آباد)

کشمیر میں آپ بیتی کی روایت، فیاض نقی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

اردو آپ بیتی کی تاریخ، ڈاکٹر طاہر تونسوی

آپ بیتی کا فن اور جہانِ دانش، ملیحہ وزیر حسین